رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۶۹۱

Regd. L. 1691

اللہ اکبر

عالمگیر لاہور

سالانہ نمبر

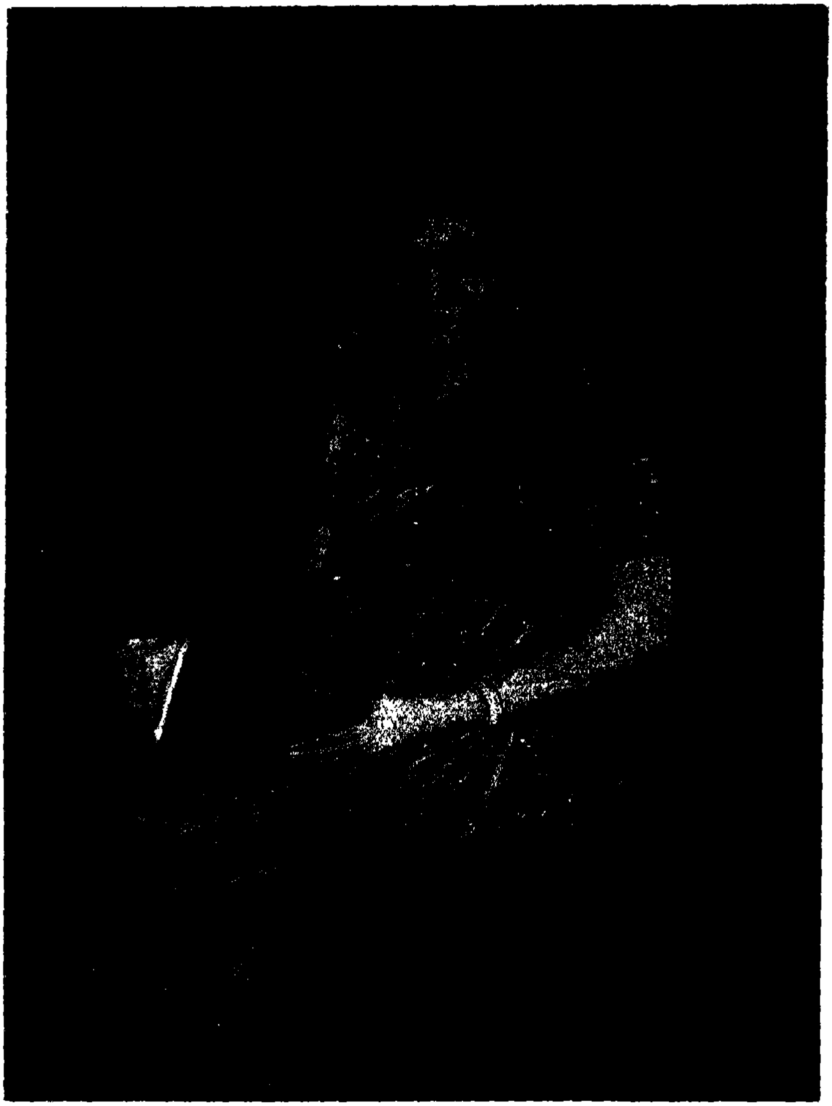


رئیس التحریر
حافظ محمد عالم

قیمت فی پرچہ 1-4-0
قیمت سالانہ چار روپے



مفارقت یعنی سوہنی مہینوال کی آخری ملاقات



فردوسِ شباب

ا، ورنمبس پریس انارکلی لاہور بلاک میکرز و پرنٹرز
سے بلاک بنوا کر چھپوایا

ایڈیٹر
محمد عالم
حافظ

عالمگیر
ماہوار
سالانہ نمبر

عالمگیر اپنے سالانہ
خریداروں کی خدمت میں علاوہ
ماہوار رسالوں کے ہر سال
سال میں دو پرچے
خاص نمبر مفت پیش

جلد ۱۵ — فہرست مضامین سالانہ نمبر بابت جون ۱۹۳۱ء — نمبر ۱

حافظ محمد عالم پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر بازار حسب میٹھا لاہور سے شائع کیا

کاتب رسالہ ہذا جمیل احمد خوشنویس لکھنوی

ملاحظات

لیجیے جناب! آپ کے عالمگیر کا سالانہ نمبر حاضر ہے، میں مطمئن ہوں کہ میں نے اپنی بے مائگی اور تہید امنی کے باوجود اس کو کامیاب بنانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی اور اگر آپ اس کو پسند فرمالیں تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت اکارت نہیں گئی، اور مجھے اس کی تیاری کے دوران میں جن ناقابل بیان اور ناگفتہ بہ پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا، اُن کا فی الواقعہ معاوضہ وصول ہوگیا، میرا اپنا یہ خیال ہے، کہ یہ سالانہ نمبر کیا بلحاظ مضامین اور کیا باعتبار تصاویر اپنے تمام گذشتہ سالانہ نمبروں سے بڑھا ہوا ہے، اور خاص نمبروں سے بھی شاید یہ کسی طرح کم نہیں، اور اگر کم ہو بھی تو کچھ بہت زیادہ فرق نہیں:

عالمگیر کے ناظرین کرام کو معلوم ہے کہ میں نے عالمگیر کے سالانہ اور خاص نمبروں کو تابحد امکان کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، کسی خاص نمبر کی تیاری کے وقت بہت زیادہ محنت کرتا ہوں، بہت زیادہ پریشان ہوتا ہوں۔ اور اپنی استطاعت سے زیادہ بہت زیادہ روپیہ خرچ کرتا ہوں، اور اسی سبب سے اپنے احباب میں بہت زیادہ "عاقبت نا اندیش" مشہور ہوں، لیکن احباب کے اور میرے نظریئے میں زمین و آسمان کا فرق ہے، جو بات اُنکے نزدیک صریحاً عاقبت اندیشی ہے وہ میرے لئے عین عاقبت اندیشی، خاص اور سالانہ نمبر کی تیاریوں کے وقت اپنا تو خیال یہ ہوتا ہے

دل کی خوشی کی خاطر چلئے ڈال مال و دھن کو * گر مر رہو تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

اب آپ خود خیال فرمائیے کہ میں نے اپنے سالانہ اور خاص نمبروں میں ہمیشہ اس بات کا ثبوت دیا ہے یا نہیں، اور اس کے ساتھ ہی ذرا اس پر بھی غور فرمائیے، کہ ہر سال اتنے اعلیٰ پیمانہ پر "خاص نمبر" شائع کر کے "برگ سبز است تحفۂ درویش" کہہ کر ناظرین کرام کی خدمت میں مفت پیش کرنا یقیناً عالمگیر ہی کا کام ہے یا کسی اور رسالے کا بھی

اس سالانہ نمبر کی تیاری کے سلسلہ میں جن حضرات نے میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار فرمایا، اُن میں عالی جناب حضرت حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی مدظلہ العالی کا اسم گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہے اور یہ واقعہ ہے، کہ حضرت ممدوح کی پیہم نوازشات اور ہمدردیوں نے میرے دل کی گہرائیوں میں ایسے جذبات پیدا کر دیئے ہیں جن کے اظہار کے لئے مجھے الفاظ نہیں ملتے، میں اسے عالمگیر کی بہت بڑی خوش قسمتی سمجھتا ہوں، کہ اس کو حضرت حکیم صاحب قبلہ ایسی بلند مرتبہ، قابل ترین، اور مستغنی عن التعریف بزرگ ہستی کی مربیانہ سرپرستی کا فخر حاصل ہے اس سالانہ نمبر میں ممدوح کی ایک بہترین تصویر بھی فردوس شباب کے نام سے شریک ہے، جو آپنے اپنی جید عدیم الفرصتی کے باوجود خاص طور پر سالانہ نمبر کے لئے مکمل کر کے مرحمت فرمائی ہے

اس اشاعت میں ہندوستان کے نامور اور باکمال مصور پروفیسر

اگر آپ

عالمگیر کا یہ قابل قدر سالانہ نمبر اور عنقریب شائع ہونیوالا ہنگامہ خیز خاص نمبر **مفت حاصل کرنا** چاہتے ہیں، تو اسی سالانہ نمبر سے ایک سال کیلئے عالمگیر کی خریداری قبول فرمالیجیے!

اللہ بخش صاحب آرٹسٹ کی دو ہنگامہ خیز تصویریں بھی "سوہنی اور مہینوال" اور "سوہنی" کے نام سے شامل ہیں یہ تصویریں اپنے اندر جس قدر جاذبیت رکھتی ہیں، وہ محتاج تعریف نہیں، پروفیسر صاحب کی بلند پایہ تصویریں ہندوستان بھر کی نمائشوں میں ہمیشہ گرانقدر انعامات حاصل کرتی ہیں، آپ خود ملاحظہ فرمایئے کہ جو دو تصویریں عالمگیر کے زیر نظر سالانہ نمبر میں شائع ہو رہی ہیں، وہ کمال فن کا کتنا اچھا، ورلا جواب نمونہ ہیں،

بہار کے دو نامور اور مشہور مصور، مسٹر ہادی اور مسٹر مہدی کی تصویریں سالانہ نمبر کے لئے اس وقت موصول ہوئیں جبکہ عالمگیر کے سالانہ نمبر کا کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا، اور تصاویر تو قطعی چھپ چھپا کر تیار رکھیں، بلاک میکر کمپنی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا، کہ وہ ہفتہ عشرہ سے پیشتر بلاک مکمل کر کے نہیں دے سکتی اور پھر اسیقدر عرصہ ان تصویروں کی چھپائی کے لئے بھی درکار تھا، اس لئے مجبوراً ان قابل دید تصاویر کی اشاعت آئندہ کسی وقت پر ملتوی کرنی پڑی۔ اگر صرف ایک ہفتہ پیشتر بھی یہ تصویریں پہنچ جاتیں تو ان کا شریک اشاعت ہونا یقینی تھا۔

عالمگیر کے اس سالانہ نمبر میں جن حضرات کے مضامین شائع ہو رہے ہیں، میں ان سب کی خدمت میں بصمیم قلب ہدیہ تشکر پیش کرتا ہوا متوقع ہوں، کہ وہ عالمگیر نوازی کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رکھیں گے،

چچا چھکن نے جھگڑا چکایا حسب وعدہ سالانہ نمبر میں شائع ہو رہا ہے، میں جناب سید امتیاز علی صاحب تاج کا بدل ممنون ہوں، کہ آپ نے عدیم الفرصتی اور علالت کے باوجود یہ مضمون سالانہ نمبر کے لئے مرحمت فرمایا،

پروفیسر اکبر حیدری دنیائے شاعری میں بہت بلند مرتبہ کے مالک ہیں، آپ کا انداز بیان بحید دلچسپ اور موثر ہے ملک کے مشہور رسائل واخبارات میں آپ کا کلام اکثر شائع ہوتا رہتا ہے، حال ہی میں آپ کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کا ایک مجموعہ "روح جذبات" کے نام سے خاص اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں پروفیسر صاحب کی جتنی نظمیں بھی طبع ہوئی ہیں، وہ اسقدر مؤثر اور ہنگامہ خیز ہیں کہ ان کے مطالعہ سے دل میں سرور کیفیت کا ایک دریا لہریں لینے لگتا ہے، مجموعہ کی لکھائی چھپائی بھی نہایت عمدہ ہے، اور قیمت صرف ایک روپیہ دفتر رسالہ نیرنگ دہلی سے طلب فرمایئے،

ملک معراج الدین ڈورا۔ اشاعت ہذا میں ملک صاحب کی تصویر شائع ہو رہی ہے۔ آپ عالمگیر کے بہت ہمدرد ہیں چنانچہ اس سالانہ نمبر سے آپنے اپنے وسیع حلقۂ اثر سے **پچاس** نئے خریدار بہم پہنچانے کا وعدہ فرمایا ہے، ملک صاحب ایک قومی خادم بھی ہیں اور آپ کی اصلاحی تحریریں ملک کے روزانہ اخبارات میں اکثر چھپتی رہتی ہیں، حال ہی میں شیخ غلام علی صاحب کے اہتمام سے ایک کتاب شاید چالیس ہزار شائع ہوئی ہے جس میں ملک صاحب کا ذکر بدیں الفاظ موجود ہے "ملک معراج دین ڈورا لاہور کے رہنے والے ہیں بوٹ فروشی کا کاروبار کرتے ہیں کانوں سے بہرے ہیں مگر خدا نے اُن کو اتنی سمجھ بخشی ہے کہ کہنے والے کے لبوں کے ہلنے ہی سے معلوم کر لیتے ہیں کہ وہ کیا کہتا ہے" تصویر میں ملک صاحب کے ساتھ ان کے دونو صاحبزادے ملک عبدالحمید اور ملک صلاح الدین سعید اور ان کی صاحبزادی بھی موجود ہیں۔

حافظ محمد عالم عفی عنہ

عالمگیر الیکٹرک پریس کا ہو رہیں بجلی وغیرہ کا سب کام ہرکشن لال صاحب شرما پروپرائٹر انڈیکا رالیکٹرک کمپنی ہی بالعموم سرانجام دیتے ہیں، مجھے بڑی خوشی کے ساتھ اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آپ حددرجہ خوش خلق ہونے کے علاوہ اپنے کام میں مہارت تامہ رکھتے ہیں، میں چونکہ ان کے کام سے بہت خوش ہوں، اس لئے از خود بطور اعتراف یہ چند سطور لکھنے پر مجبور ہوں، مقامی اور غیر مقامی حضرات بجلی کے متعلق ان کی خدمات سے ضرور فائدہ اٹھائیں

ارشاداتِ عالیہ

از استاذ السلطان عالیجناب نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل مدظلہ جانشین امیر مینائی

کھینچئے تیغ اگر آپ ہیں ہمت والے قتل کو جشن سمجھتے ہیں محبت والے

رحم آتا نہیں بلبل کی فغاں پر گل کو دل کہاں رکھتے ہیں سب ناز و نزاکت والے

غیر کے ساتھ انھیں دیکھ کے جی جاتا ہے داغ دیتے ہیں مجھے چاند سی صورت والے

طلبِ یار میں کرتے ہیں سفر ہستی سے کون کہتا ہے کہ مرتے ہیں محبت والے

دیکھنا یار بھی محشر میں اگر آ نکلا بھول جائینگے قیامت کو قیامت والے

کچھ شرارت نہیں موقوف تری شوخی پر سب ہیں پرکالۂ آتش تری صحبت والے

تم ہو بیدرد تمھیں درد ہمارا کیا ہو قدر کرتے ہیں محبت کی محبت والے

کاش اتنا تو اثر ہو مری بیتابی میں وہ پکاریں مجھے او درد محبت والے

وہ مجھے اور بھی تڑپا گئے یہ کہہ کے جلیل!
صبر کر او مرے بیچین طبیعت والے

نظم معلقہ تصاویر

سوہنی مہینوال!

سرزمین پنجاب کا ایک دلگداز قصہ

از جناب مولنا خدا بخش صاحب اظہر امرتسری

شعاعِ عشق جب اُٹھی تجلی گاہ فطرت سے
تو یہ دنیا چمک اٹھی شرارِ سوزِ اُلفت سے

ہوا اس کا گذر پنجاب کی رنگیں فضاؤں سے
تو گونج اٹھا زمانہ ہیر و رانجھا کی نواؤں سے

اٹھی موجِ چناب؎ اک نغمۂ کیف آفریں ہو کر
وہ نغمہ چھا گیا دنیا پہ جو سحرِ حسیں ہو کر

سکوں پایا جنونِ عشق نے حُسنِ خود آرا سے
ہوئی رنگیں سحر گجرات کی شامِ بخارا سے

وہ عزت بیگ بلخی بادۂ الفت کا مستانہ
وہ مستانہ کہ تھا جو شمعِ نظارہ کا پروانہ

بھرا تھا اسقدر وہ نور افشاں جلوہ گاہوں میں
کہ بنکر کیف تھے جلوے نہاں اسکی نگاہوں میں

بظاہر اسکو تھی فرصت نہ اشغالِ تجارت سے
حقیقت میں مگر تھا مضطرب سوزِ محبت سے

زمینِ بلخ نورِ حُسن کی رفعت پسندی سے
بزعمِ خود تھی ہم آغوش تاروں کی بلندی سے

بخارا شاہدانِ مہر طلعت کا وہ مسکن تھا
دماغِ عاشقی جس کی ضیا ریزی سے روشن تھا

مگر وہ مہ جبینانِ وطن کی خوش ادائی سے
نہ گھائل ہو سکا شمشیرِ شوقِ آشنائی سے

تلاشِ حُسنِ دلکش کے لئے اس نے وطن چھوڑا
تجارت کے بہانے بلخ سے پنجاب میں آیا

دکھایا عشق نے جب ساحلِ رودِ چناب اسکو
نظر آئے زمیں پر مُسکراتے آفتاب اسکو

زمیں گجرات کی یعنی جمالستانِ محبوبی
ہر اک ذرّہ تھا اسکا مظہرِ عرفانِ محبوبی

اگر گیسو بدوش اسکا کوئی مستِ شباب آئے
تو عاشق کو نظر اُٹھتی ہوئی موجِ شراب آئے

؎ چناب ایک دریا کا نام ہے جو وسطِ پنجاب سے گذرتا ہے۔

نظارے کر رہا تھا وہ جمالِ آرا حسینوں کے
نظر میں تولتا پھرتا تھا جلوے مہ جبینوں کے

پڑی اسکی نظر ناگاہ اک "گل گو" کی دختر پر
کہ پروانہ اچانک جا گرا اشمعِ منور پر

وہ لڑکی ایک آئینہ تھی شانِ دلربائی کا
نظر آتا تھا جسمیں رخ کمالِ کبریائی کا

وہ لڑکی سوہنی کہتے تھے جس کو سب محبت سے
ریاضِ دہر میں آئی تھی گویا حورِ جنت سے

ادائیں اسکی جب ہوتی تھیں مصروفِ بلاخیزی
قدم لیتا تھا آکے فتنۂ آشوبِ چنگیزی

ابھی اُٹھا نہیں تھا پردۂ دوشیزگی اس کا
شرابِ شرم میں پنہاں تھا کیفِ دلکشی اس کا

فدا اس پر نہ ہوں کیوں کر بہاریں زندگانی کی
کہ تھی اک صورتِ مرئی وہ احساسِ جوانی کی

ابھی اُٹھنے نہ پائی تھی نگاہِ شوق عزت کی
کہ دل میں دوڑ اُٹھیں بیتابیاں جذبِ محبت کی

نگاہِ عجز سے کہنے لگا اے مدعائے دل!
ترے جلوے سے روشن ہوگئی ظلمت سرائے دل

اگر تجھکو مری مجبوریوں پر رحم آجائے
مرے اُجڑے ہوئے گلشن پہ پھر رنگِ بہار آئے

اگرچہ سوہنی بھی مضطرب تھی دردِ الفت سے
مگر مجبور تھی ماں باپ کے احکام و عزت سے

اندھیرا یاس و حرماں کا جب اس نے ہر طرف دیکھا
حصولِ مدعا کے واسطے تلا[1] کے پاس آیا

لگا کہنے خدارا میری حالت پر کرم کیجے
غریبِ شہر و مفلس ہوں ملازم مجھکو رکھ لیجے

دیا تلے نے اسکو کام جب بھینسیں چرانے کا
تو روشن ہوگیا اک اک ورق اس کے فسانے کا

غلامی کے عوض دیدی خوشی سے خواجگی اس نے
اُچھالا اس طرح دنیا میں نامِ عاشقی اس نے

"مہینوال"[2] اسکو کہہ کر جس گھڑی تلا بلاتا تھا
تو دل ہی دل میں اپنے بخت پر وہ مسکراتا تھا

چراگاہوں میں چھا جاتی تھی جب سنسان خاموشی
مسلط دہر پر ہوتی تھی بن کے نیند بیہوشی

چھپالیتی تھی ظلمت دہر کو جب اپنے دامن میں
چمکتی تھی ضیائے حسن چرواہے کے مسکن میں

وہ دونوں جذبۂ الفت سے ہم آغوش ہوتے تھے
کہ جنسِ ما و تو دریائے وحدت میں ڈبوتے تھے

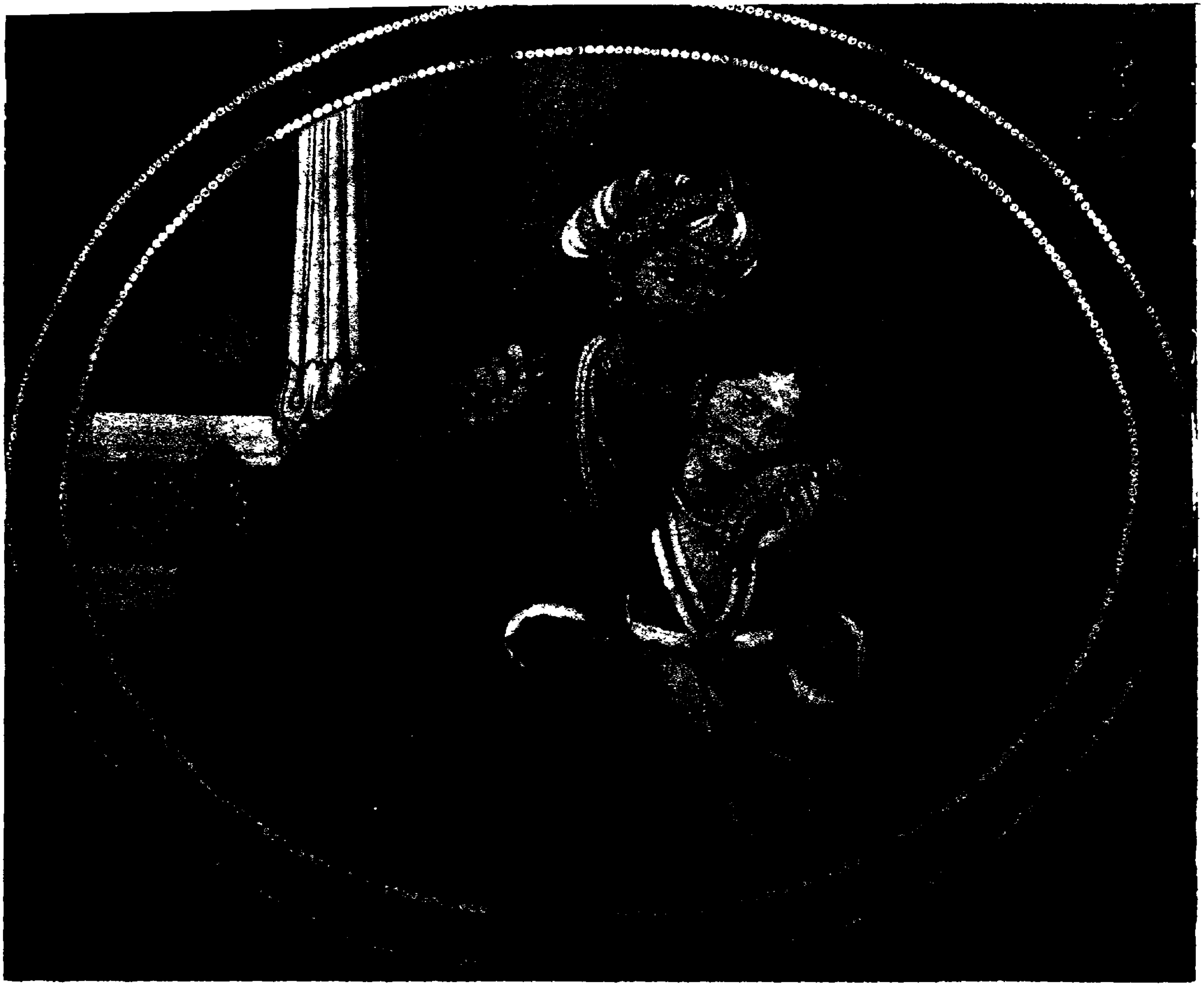
رہا یہ سلسلہ کچھ عرصہ لیکن وائے بدبختی
کسی نے ان ملاقاتوں کی تلے کو خبر کردی

[1] سوہنی کے باپ کا نام [2] مہینوال پنجاب میں بھینسیں چرانے والے کو کہتے ہیں اور عزت بیگ کا لقب بھی ہے۔

بلا کر رات عزت بیگ کو کہنے لگا تلا۔ تری گستاخیوں سے ہو گیا میں شہر میں رسوا
وہ خوں ہونا تمناؤں کا آغازِ محبت میں
وہ گل ہونا چراغِ آرزو کا شامِ غربت میں

جب آدھی رات کو دنیا ہوئی روپوش ظلمت میں تو آئی دل گرفتہ سوہنی عزت کی خلوت میں
کہا عزت نے اے سرمایۂ عیش و نشاطِ دل ترے جلوے سے ہے روشن چراغِ انبساطِ دل
مجھے تو سونپ کر اب دوزخِ بیدادِ فرقت کو نہ جانے کل بہشت آرا کرے گی کس کی خلوت کو
ہجومِ رنج و غم میں وہ وداع اس سے ہوا آخر لگایا ڈیرا دریا کے سکوت افزا کنارے پر
مگر محوِ عمل ہیں جذبۂ اُلفت کی تاثیریں وہ تاثیریں کہ جن میں وصل کی پنہاں تھیں تنویریں

تجلی چھپ گئی سورج کی جب دامانِ مغرب نے اُٹھا طوفانِ تاریکی عالم سینہ سب سے
فسونِ خامشی سے ہو گئے خاموش ہنگامے کہ صہبائے سکوں نے کر دیئے بیہوش ہنگامے
وہ شورش خیز موجیں سو گئیں تھک کر کنارے پر جو دن کو رقص کرتی تھیں ہواؤں کے اشارے پر
ہوا کی سرسراہٹ گویا شورِ ہیبت افزا ہے کہ جوشِ قہر میں دیو سیہ کچھ گنگناتا ہے
وہ ملاحوں کے نغمے گونجتے تھے جو فضاؤں میں تڑپتی ہے اب انکی روح طوفانی ہواؤں میں
وہ آئی سوہنی، نظارۂ اُلفت کی دیوانی وہ آیا اس کی جانب عشق کا جوشِ ستمرانی
سبوئے پختہ کے دھوکے میں لائی ہے گھڑا کچا مگر ارمانِ دید اس کو نہیں کچھ دیکھنے دیتا
وہ موجیں تلملائیں سوہنی کو گود میں لے کر وہ دریا کے کنارے پر اُٹھا ہنگامۂ محشر
وہ عزت بیگ بھی پانی میں یہ کہتا ہوا کودا تجھے جانے نہ دوں گا میں بہشتِ عشق میں تنہا
گلے مل کر تلاطم کی فضا میں کھو گئے دونوں
کہ وصلِ جاوداں کا جام پی کر سو گئے دونوں



اکبر اور اسکی عیسائی ملکہ مریم زمانی۔

انتخاب یادگار

یعنی

تذکرۃ الشعرا مرتبہ حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ

از جناب مولوی حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج

انیسویں صدی نے ہندوستان کے اندر بعض ایسی باکمال ہستیاں پیدا کیں اور بیسویں صدی نے ان کو ہم سے ایسا جدا کیا کہ انیسویں صدی پر جس قدر فخر و ناز کیا جائے کم ہے اور بیسویں صدی پر جس درجہ ماتم و الم ہو تھوڑا ہے۔ انہی سرمایۂ امتیاز و مایۂ ناز ہستیوں میں منشی و مفتی امیر احمد صاحب مینائی رحمۃ اللہ علیہ کی برگزیدہ ذات تھی۔ ہندوستان میں عالم و فاضل۔ قاضی و مفتی۔ ادیب۔ شاعر۔ اہل حال و صاحب قال اتنے ہوئے اور ایسے کہ تاریخ عالم ان کی نظیر تلاش کرنے کے لئے چراغ بکف و مشعل بدست ہے۔ لیکن کم ہوئے اور بہت کم ایسے کہ دل و دماغ کی صفات حسنہ کے جامع ہوں اور دین و دنیا کی سعادت و برکت سے بہرہ اندوز۔ اور جتنے ایسے خوش نصیب ہوئے ان میں ہم بغیر خوف تردید حضرت امیر مینائی کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔

منشی صاحب مغفور کی جو حیثیت سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ان کی شاعری ہے اور اس میں شک بھی نہیں کہ انہوں نے اپنے جوہر شعری کے ذریعہ سے ملک و زبان پر سب سے زیادہ احسان کیا ہے لیکن اس ایک شاعری میں ان کا علم و فضل بھی جلوہ گر ہے۔ ان کا تفقہ و تشرع بھی۔ ان کا ادب و شعر بھی۔ ان کی صفائے باطن و جلائے روح بھی۔ منشی صاحب نے غزلیات و قصائد و مثنوی و مسدس۔ و اسوخت و رباعیات کا ایسا ذخیرہ چھوڑا ہے جو خود غیر فانی ہے اور ادبیات اردو کو غیر فانی بنائے ہوئے ہے۔ نثر کی تصانیف کم ہیں۔ لیکن جو کچھ ہیں وہ اپنے رنگ میں بے نظیر اور یادگار ہیں۔ میرا مقصد اس وقت نثر ہی کی ایک تصنیف پر نظر ڈالنا ہے۔

منشی صاحب نے اپنے ولی نعمت جناب خلد آشیاں نواب کلب علیخاں صاحب بہادر انار اللہ برہانہٗ کی فرمائش سے شعرائے ریاست رامپور کا تذکرہ "انتخاب یادگار" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ جو غالباً ایک ہی مرتبہ ۱۲۹۰ھ میں شائع ہوا۔ تقریباً چھ سو صفحے کی ضخامت ہے۔ پہلے ۱۲۸ صفحوں میں فرمانروایان رامپور کا ذکر اور ان میں سے شعرا کا انتخاب کلام درج ہے۔ اسکے بعد چارسو سے زیادہ صفحات پر ان شعرا کا حال و کلام درج ہے جو ریاست رامپور کے متوطن یا متوسل تھے۔ ان شعرا کی تعداد چارسو دس ہے۔ جن میں

(۱) وہ شاعر بھی ہیں جن کا وطن اصلی ریاست رامپور ہے۔

(۲) وہ بھی جو ہندوستان کے مختلف مقامات سے آکر ریاست کے متوسل ہوئے۔

(۳) وہ بھی جو بیرون ہند مثلاً ایران و افغانستان سے آئے اور ریاست میں توطن یا توسل اختیار کیا۔

(۴) بعض انگریز شاعر بھی ہیں جن کا ریاست سے تعلق رہا ہے اور وہ فارسی یا اردو میں شعر کہتے ہیں۔

(۵) بہت سے ہندو شاعر ہیں جن کا فارسی یا اردو کلام موجود ہے۔

(۶) بعض ہندو شاعر ہیں جو بھاکا میں کبت کہتے ہیں اور ان کے کبت اردو رسم خط میں مع شرح درج ہیں۔

(۷) بعض اہل عرب و اہل ہند کے عربی کلام کے نمونے شامل تذکرہ ہیں۔

یہ سب کے سب کسی نہ کسی اعتبار سے ریاست رامپور سے

تعلق رکھتے ہیں۔

اس لحاظ سے یہ تذکرہ انتخاب یادگار ہے بلاشبہ ایک یادگار انتخاب ہے۔ اور بلا شبہ اس قابل ہے کہ دوبارہ شائع کیا جائے۔ منشی صاحب نے تذکرہ کی زبان میں مختلف مقامات پر مختلف رنگ اختیار کئے ہیں۔ حمد و نعت میں موضوع کے تقدس کے لحاظ سے اور اپنے جوش طبیعت اور خلوص عقیدت کے تقاضے سے قدیم رنگ کی مقفیٰ عبارت لکھی ہے۔ مثلاً یوں ابتدا کرتے ہیں۔

"سمند قلم پر شہسوار سخن کی تاکید ہے کہ میدان حمد الٰہی میں قلم اٹھا۔ اور تیغ زبان پر قوت ناطقہ کی تہدید ہے کہ اس معرکے میں جوہر دکھا۔ مگر یہ منزل ایسی کڑی ہے کہ دونوں کو مشکل پڑی ہے۔ نہ اس کا پاؤں نہ اس کا ہاتھ اٹھ سکتا ہے۔ اس عجز کو دیکھ کر عقل حیران ہے اور دل کوستا ہے کہ تحریر و تقریر کا تو یہ حال کہ نہ قلم کو لکھنے کی تاب نہ زبان کو گویائی کی مجال۔ پھر کیونکر وادی ناپیداکنار حمد تمام ہو جس کی بدایت صفات کو نہایت نہ ہو کس طرح اس کی ستائش کا سر انجام ہو۔"

لیکن نفس تذکرہ کی زبان نہایت سادہ سلیس اور صاف و رواں ہے۔ والیان ریاست کے تاریخی حالات ضروری تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں اور قدیم و جدید اسالیب بیان کی آمیزش سے زبان اسقدر دلچسپ اور شیریں بن گئی ہے کہ پڑھنے میں لطف آتا ہے اور سنانے کو جی چاہتا ہے۔ نواب محمد فیض اللہ خاں بہادر کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

"جب وہ وقت آیا کہ کٹھیر میں جناب نواب محمد سعد اللہ خاں صاحب بہادر کا واقعہ ارتحال ہوا اور بخشی سردار خاں اور دوندی خاں اور فتح خاں خانساماں وغیرہ بڑے بڑے سرداروں کا بھی انتقال ہوا اور حافظ رحمت خاں نے پیشگاہ سلطانی سے حافظ الملک خطاب پایا۔ اور میدان خالی پاکر اقتدار کثیر بہم پہنچایا اور والاجناب عالی شان نواب علیین آشیانی (یعنی نواب فیض اللہ خاں بہادر) دخل و تصرف سے بالکل کنارہ گزیں ہوئے اور نواب شجاع الدولہ بہادر نے بکسر کی لڑائی میں انگریزوں سے شکست کھائی سیدھے کٹھیر آئے اور حافظ رحمت خاں کے مہمان ہوئے۔ اس خیال سے کہ میں ان پر چالیس لاکھ روپیہ کا احسان کر چکا ہوں یہ ضرور اس احسان کا خیال کریں گے اور میرا ساتھ دیں گے۔ حافظ رحمت خاں نے اس احسان کا پاس در کنار مہمان ہونے کا بھی لحاظ نہ کیا بلکہ قابو پاکر چاہا کہ اس سے بہتر وقت نہ ملے گا۔ سرکاٹ کر صاحبان انگریز کو نذر کیجئے کہ ادھر وہ مسرور ہوں اور ادھر اس چالیس لاکھ روپیہ کے مطالبے سے جو نواب شجاع الدولہ بہادر نے دکنیوں کو دیا ہے اور ایک نہ ایک دن طلب کریں گے اطمینان ہو جائے جب نواب علیین آشیان سے تخلیہ کرکے اس مقدمے میں صلاح کی تو آپ نے منع کیا کہ یہ تمہارے مہمان ہیں۔ مہمان کے ساتھ کج ادائی اور بیوفائی نہ چاہئے۔ حافظ الملک نے نہ مانا۔ یہاں تک نوبت آئی کہ نواب علیین آشیاں رنجیدہ ہوکر شاہ آباد چلے آئے۔ وہاں حافظ الملک نے نواب شجاع الدولہ بہادر کو نظربند کرلیا اور یہ ظاہر کیا کہ آپ کے اعدا بہت ہیں مبادا کوئی ایذا رسانی کرے لہٰذا میں اپنی کچھ سپاہ آپکی حفظ کے واسطے متعین کرتا ہوں۔ اور جواہر جو نواب کے پاس تھا مناسب بحیلہ ہائے مختلف لے لیا۔ جب کچھ نہ رہا چاہا کہ قتل کریں۔ نواب شجاع الدولہ حمام اکثر جایا کرتے تھے۔ حافظ الملک نے ارادہ کیا کہ حمام میں گلا گھونٹ کر مار ڈالئے نواب علیین آشیانی کو جو اس ارادۂ فاسد کی خبر پہونچی عاقبت اندیشی سے سوچے کہ اگر یہ امر وقوع میں آیا تخلئے کی گفتگو اور میری ممانعت سے تو کوئی آگاہ نہ ہوگا بدنامی تمام قوم کی ہو جائے گی۔ فی الفور سوار ہوئے اور اس وقت پہنچے کہ نواب شجاع الدولہ بہادر حمام جایا چاہتے تھے۔ نواب علیین آشیانی پہلے ہی سے حمام چلے گئے۔ جب نواب شجاع الدولہ بہادر وہاں پہونچے تو

نواب علیین آشیان نے کہا کہ حضرت آپ کس خیال میں ہیں یہاں بازار محبت کا سرد اور ارادۂ میزبان فاسد ہے۔ نواب شجاع الدولہ بہادر گھبرائے اور کہا کہ پھر میں کیا کروں اور یہاں سے کیونکر نکلوں۔ نواب علیین آشیاں نے کہا کہ اگرچہ حافظ الملک قطعاً میرے دشمن ہو جائیں گے مگر آپ کی حفظ جان کے واسطے مجھے کچھ پروا نہیں۔ نکال لے چلنا میرا ذمہ ہے۔ نواب شجاع الدولہ بہادر نے کہا کہ میری بے سروسامانی کا تو یہ حال ہے کہ زاد راہ تک نہیں رہا۔ نواب علیین آشیان نے لاکھ روپیہ کی اشرفیاں سامنے رکھدیں۔ نواب شجاع الدولہ بہادر نے محجوب ہو کر کہا کہ اتنی اشرفیاں میں ہرگز نہ لوں گا میرا جواہر اگر بجھ مل سکے تو منگوا دیا جائے۔ نواب علیین آشیان نے کہا کہ وہ میرے اختیار سے باہر ہے مگر اسے آپ کو قبول کرنا ہوگا کہ آپ کی دعوت ہم سب پر واجب ہے۔ نواب شجاع الدولہ بہادر نے کہا کہ اسے کون لیجائے۔ نواب علیین آشیان نے فرمایا کہ ایک شخص کو میں ساتھ لایا ہوں وہ بطور محافظت آپ کے ہمرکاب جائیگا اور اسے پہونچاویگا۔ نواب شجاع الدولہ بہادر نے کہا کہ میں جاؤں کہاں۔ نواب علیین آشیان نے فرمایا کہ بخط راست فرخ آباد احمد خاں بنگش کے پاس جانا چاہئے۔ وہاں سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ پھر تلوار کے قبضے اور بندوق کے کندے سے روشندان کے شیشے توڑ کر نواب شجاع الدولہ بہادر کو بھی نکالا اور آپ بھی اسی راہ سے نکلے اور زیر دیوار حمام ایک شخص معتمد اور گھوڑے خاصے کے نہایت سبک رفتار لگا رکھے تھے۔ اشرفیوں کو کچھ گھوڑے کی خرجیں میں اور کچھ اس شخص کی کمر میں رکھوایا اور نواب شجاع الدولہ بہادر سے کہا کہ آپ بخط مستقیم فرخ آباد جائیں اور کسی راہ میں تامل نہ فرمائیں۔ گھوڑا اگر آپ کی سواری کا مر جائے تو دوسرا گھوڑا جس پر یہ شخص اشرفیاں لئے ہوئے سوار ہے لے لیجئے گا اور اسے پیدل چھوڑ دیجئے گا۔ یہ پیادہ بھی آ رہے گا یہ کہہ کے دونوں رخصت ہوئے۔

ایک جگہ نواب غلام محمد خاں بہادر کے حالات میں ایک نہایت دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ ان عبارات کے انتخاب سے نہ صرف حضرت امیر مینائیؒ کا اسلوب تحریر دکھانا مقصود ہے بلکہ خود کتاب کی دلچسپی و افادہ کا اظہار بھی مدنظر ہے۔ لکھتے ہیں:-

"مخفی نہ رہے کہ نواب عالیجناب (یعنی نواب غلام محمد خاں بہادر) علاوہ ان معرکہ آرائیوں اور اولوالعزمیوں کے اور بہت ایسے خصائص رکھتے تھے کہ ان کو سنکر آدمی کے ہوش اُڑتے ہیں شجاعت آپ کی ذات عالی پر ختم تھی۔ ایک حکایت بطور مثال جو انتہائے جرأت پر دال ہے یہاں لکھی جاتی ہے کہ ایک بار کوہستان میں ایک قلعہ لڑ رہا تھا۔ اور آپ اسی قلعہ کے قریب پہاڑ پر ظہر کی نماز پڑھتے تھے سنن اُولیٰ پڑھنے میں دو تین گولے سجدے کے مقام سے ہاتھ دو ہاتھ کے فاصلے پر گرے مگر آپ بے اندیشہ اسی طرح نماز پڑھا کئے۔ جب چاروں رکعتیں سنتوں کی پڑھ کر سلام پھیرا فراشی سے فرمایا مصلیٰ اس جگہ بچھا دے جس جگہ گولہ ٹپا کھاتا ہے۔ جب اس نے بچھا دیا فرائض ظہر اسی مقام پر ادا کئے۔ تین چار گولے حالت ادائے فرض میں سجدہ گاہ سے اسی فاصلے پر ہٹ کر اُترے۔ جب آپ فرض پڑھ چکے مصلیٰ اس جگہ بچھوایا جہاں آپ گولا پڑتا تھا۔ اور سنن اخیرۂ ظہر وہاں پڑھے۔ ادھر آپنے تکبیر تحریمہ کہی اُدھر گولا محل سجدہ سے اور ہاتھ بھر فاصلے پر گرنے لگا۔ جب آپ سلام پھیر چکے لوگوں سے کہا کہ جب تک آدمی کی موت نہیں ہوتی ہزار طرح جا ہے اویاں میلا نہیں ہوتا۔ دیکھو میں نے ہرچند چاہا کہ نماز میں رتبۂ شہادت پاؤں مگر کچھ نہ ہوا۔

تاجداران رامپور میں چار رئیس شاعر ہوئے ہیں (۱) نواب محمد عبداللہ خاں بہادر عاصی تخلص فارسی کہتے تھے (۲) نواب احمد علی خاں بہادر

رند تخلص اردو کہتے تھے۔ (۳) نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم بھی اُردو میں دادِ سخنوری دیتے تھے (۴) نواب کلب علی خاں بہادر نواب تخلص نے فارسی اردو بھا کا تینوں زبانوں میں جودت طبع دکھائی ہے۔ ناظم و نواب کے دیوان مطبوع و مشہور ہیں منشی امیر احمد صاحب نے بھی ان کے کلام کے نہایت طویل انتخابات درج کئے ہیں لیکن یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ نواب عاصی کے دو شعر درج کرتا ہوں :-

درخیالِ نگاہ مست کسے	مے تابے چشیدہ ام کہ مپرس

تغافل ہائے پنہاں لیکہ داری	نگہ از خویش ہم دزدیدہ باشی

نواب رند کے کلام اردو کا نمونہ یہ قطعہ ہے :-

حشر کو جب حساب مانگیں گے	الاماں شیخ و شاب مانگیں گے
اپنے ساقی لاابالی سے	رندواں بھی شراب مانگیں گے

صاحبزادگان ریاست میں نواب علی محمد خاں بہادر کے خلف چہارم صاحبزادہ محمد یار خاں امیر تخلص کے یہ دو شعر قابل ذکر ہیں :-

ساقی گزک کی کچھ نہیں حاجت شراب دے
ہم دل جلوں میں آپ مزا ہے کباب کا

گر وقت ذبح نالہ کیا میں نے کیا ہوا
پیارے کسی کا ہاتھ کسی کی زباں سے چلے

اب شعرائے تذکرہ میں سے چند شاعروں کا ذکر کرتا ہوں جو کسی نہ کسی وجہ سے قابل ذکر و یادگار ہیں۔ بعض وہ عالم و فاضل ہیں جنکی شاعری علم و فضل کے جُبّہ و دستار میں چھپی رہ گئی۔ بعض وہ قابل شاعر ہیں جو پردہ گمنامی میں روپوش ہیں۔ بعض خاص رامپور کے اہل کمال ہیں جن کے شاعر یا صاحب تصنیف ہونے کا خود اہل رامپور کو بھی علم نہیں۔ اور ان کی تصانیف و دواوین کی جستجو و اشاعت ان کا فرض ہے۔ بعض ہندو سخن گو ہیں جن کا کلام لائق فکر و اشاعت ہے۔ بعض یورپین شعرا ہیں جنہوں نے فارسی و اردو میں اہل زبان کی مثل دادِ سخن دی ہے۔

ان چار سو دس شاعروں میں جن کا ذکر حضرت امیر مینائی نے انتخاب یادگار میں کیا ہے جہاں کم عمر و نومشق شاعر ہیں وہاں اساتذۂ فن بھی موجود ہیں۔ جہاں ایسے شعرا کا ذکر ہے جن کا کلام دوسرے تذکروں میں مل سکتا ہے وہاں ایسے باکمال سخن سنجوں کا تذکرہ بھی ہے جن کی یاد صرف اسی تذکرے سے زندہ ہے۔

شعر کے حالات میں منشی صاحب نے تذکرہ رئیساں رامپور کی سی سادگی نہیں برتی۔ بلکہ اکثر مقفّی عبارت لکھی ہے لیکن یہ التزام اسقدر غیر نمایاں ہے کہ عبارت کی سلاست و روانی میں فرق نہیں آیا۔ لبطور نمونہ چند شعرا کا حال منشی صاحب کی زبانی اور انکے انتخاب کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

آشفتہ عنبر شاہ خاں

اسرار زبان پارسی سے کماحقہ، ماہر مبلغ استعداد ان کی تالیفات سے ظاہر۔ منشآت میں گلشن فیض۔ جوش ہوش۔ سراج منہاج۔ گلزار عنبر۔ اشراق الخیال۔ سویدائے عنبر۔ اور قواعد پارسی میں جوہر عنبر ایذان الاوزان۔ نوادر المصادر۔ اور مصطلحات میں مرآۃ الاصطلاحات۔ اور ذکر شعرائے ہند و عجم میں ایک بیاض ریاض عنبر۔ اور دو دیوان نتیجۂ فکر ہیں۔ ایک زبان ریختہ میں تدقیق الخیال اور دوسرا زبان پارسی میں تشریق الخیال۔ اردو میں آشفتہ تخلص ہے اور فارسی میں عنبر۔ فارسی میں مولوی قدرت اللہ مرحوم متخلص بہ شوق کے شاگرد رشید تھے۔ چنانچہ حضرت مصحفی مرحوم نے اپنے تذکرے میں بھی لکھا ہے۔ اور اردو میں قیام الدین قائم شاگرد مرزا رفیع سودا کی صحبت سے مستفید تھے۔ سیر کلیات سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت ظرافت کی طرف بہت مائل تھی حتیٰ کہ صاحبقران کے رنگ پر بھی کچھ لکھا ہے مگر ہیچمدان نے بنظر تہذیب اس قسم کے اشعار میں سے کوئی شعر اسی تذکرے میں نہیں لکھا۔ المختصر یہ فرد کامل اسی دارالکمال میں پیدا ہوئے یہیں رہے یہیں نشو و نما پائی۔ مراد آباد میں رحلت فرمائی۔ سید خاں کے گھیر میں دفن ہوئے۔ سال وفات تحقیقاً نہیں معلوم مگر ۱۲۳۷ھ تک حیات ان کی متحقق ہے۔ ان کا کلام یہ ہے :-

ریختہ

اشک اس چشم تر کو کھو بیٹھا | آہ یہ لعل گھر کو کھو بیٹھے
نہ پھرا اس شرم نارسائی سے | خط مرا نامہ بر کو کھو بیٹھے

زندہ مانند شمع پھر نہ اُٹھا | اسکی محفل میں جلکے جو بیٹھا

فارسی

ہر سو از من سبب چاک گریباں پرسد | او ندیدہ است مگر برزدہ داماں را
از تغافل برخ یار ندیدن دوستاں | بخدا از پئے تسخیر بتاں خوش عمل است
بہ نیت چوں روم میرم ز جوش بدگمانی ہا | کہ ہرکس بنگرد سوئے کسے سمجھے تو می دانم

رباعی

ہر چند زر رسیدۂ ریشت نشاد است | در جنس قماش خانہ ات آباد است
چوں غنچۂ من دل بتمول خرم | کیں مال برنگ زر گل برباد است

تسکین میر حسین

ابن میر حسن عرف میران صاحب بسلسلہ ان کے نسب کا میر حیدر قاتل وزیر فرخ سیر تک پہنچتا ہے۔ فارسی مولوی امام بخش صہبائیؔ سے پڑھی۔ شعر گوئی کا جو شوق ہوا ابتدا میں شاہ نصیر مغفور سے اصلاح لی انتہا میں مومن خاں صاحب مرحوم کے فیض سے مشق سخن آفرینی کمال کو پہونچی۔ وطن ان کا دہلی ہے مگر اس دارالریاست میں سالہائے دراز نوکر رہے۔ قدر افزائی رئیس قدر دان سے نامور رہے۔ پچاس برس کی عمر ہوئی۔ شوال کی سترہویں تاریخ بارہ سو اڑسٹھ ۱۲۶۸ھ ہجری میں قضا کی اور نواب احمد علی خاں بہادر مرحوم کے مقبرے کے قریب مدفون ہوئے۔

انتخاب کلام

وحشت اب ہوش کو لیجا بیگی | تنگی گور سے گھر یاد آیا
کوچۂ یار میں ہم نے تسکیںؔ[1] | پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا

قسمت تو دیکھ جتنے کئے شکوے ہجر کے | ان کو گماں رہا گلۂ روزگار کا

آرام ہو وہ پہلو میں بیٹھے کوئی گھڑی | تسکیںؔ جو اضطراب تجھے اسقدر نہ ہو

نہ پہنچے پس مرگ بھی گور تک ہم | رہی پاؤں چلنے کی کیا بیٹھے بیٹھے
نہ اٹھا گیا دل کی باتوں سے تسکیں | کہا اس نے جو سب سنا بیٹھے بیٹھے

اب یہ حالت ہو کہ انسا بیدرد | میری بچنے کی دعا مانگے ہے

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے | کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

مزے یہ دیکھے ہیں آغاز عشق میں تسکیںؔ | کہ سوجھتا نہیں انجام کار مجھے

حیا صاحب عالم مرزا رحیم الدین

خلف صاحب عالم مرزا محمد کریم الدین رسا۔ اٹھتر برس کا سن ہے جیسا ظاہر ہے ویسا ہی باطن ہے۔ نہایت خوش طینت نیک خصال ہیں۔ آفرینش سخن میں بڑے ذی کمال ہیں۔ شطرنج بھی خوب کھیلتے ہیں۔ وطن قدیمی ان کا دہلی ہے مگر مدت سے اس سرکار فیض آثار میں تعلق ہے۔ مع اہل و عیال یہیں رہتے ہیں۔ مشق کا یہ عالم ہے کہ مضامین طبیعت سے دریا کی طرح بہتے ہیں۔ زبان اچھی مذاق اچھا ہے۔ فکر بلند ذہن رسا ہے۔ شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد رشید ہیں۔ اشعار ان کے قابل دید ہیں:-

انتخاب کلام

تھے اُن نگاہ میں ہر عقدے تمام حل | اتنا سا کام آپ کو دشوار ہو گیا

نکلنا دل سے تمنا کا امر مشکل تھا | یہ دم نہیں ادھر آیا اُدھر روانہ ہوا
تڑپنا میرا نہ دیکھا گیا یہ محض غلط | نہ بیٹھنے کا مگر ان کو اک بہانہ ہوا

---

[1] تسکین نے یہ مقطع غالب کے اس مقطع سے نکالا ہے۔ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ ⁂ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا (قادری)

دشمن صد چاک امن اور سود اعشق کا — یہ بھی کیا میں ہو گیا میرا گریباں ہو گیا
چین کیا آئے شب غم موت بھی آتی نہیں — یاس تو دم کا بھی نکلنا دل کا ارماں ہو گیا

یہ میدان محشر ہے دنیا نہیں ہے — کہ ٹکڑے اڑا دوگے گھر سے نکل کر

بالیں سے ساری رات نہ جانے دیا ہے — صد آفریں ہے ای نفس واپسیں تجھے

حیرت لالہ کنج بہاری لال

شاعر شیریں مقال بخشی لالہ کنج بہاری لال ابن بہادر سنگھ ابن رائے دوست سنگھ۔ پہلے خلّت تخلص تھا اب حیرت ہے کیا اچھی طبیعت ہے۔ دو دیوان فارسی مرتب ہیں ان میں شعر کے اقسام سب ہیں۔ باایں ہمہ پرگوئی کسی طرح کا پندار نہیں۔ کسر نفسی کا یہ عالم کہ اپنی شاعری کا کسی سے اظہار نہیں۔ برسوں مشاعرے کئے۔ طرح کی غزلوں سے دیوان ترتیب دئے۔ مولوی غیاث الدین صاحب مرحوم متخلص بہ عزت کو کلام دکھایا ہے۔ انہیں کی فیض صحبت سے اعتبار پایا ہے۔ ابتدائے عمر میں لکھنؤ گئے وہاں کئی برس نوکر رہے۔ پھر ریاست بھوپال میں نوکری کی وہاں بھی نامور رہے عہد جناب غفران مآب نواب محمد سعید خاں صاحب بہادر جنت آرامگاہ انار اللہ برہانہٗ سے اس دارالریاست میں آئے یہاں کی قدر افزائی سے روز بروز اعزاز بڑھا مرتبے پائے۔ اب تک خدمت بخشی گری پر مامور ہیں صفات خلق و تواضع سے نام نیک کی طرح مشہور ہیں۔ آبا و اجداد انکے الور شہر کے رہنے والے تھے۔ یہ یہیں پیدا ہوئے۔ اب ۶۷ برس کی عمر ہے حق تعالےٰ زندہ رکھے۔ یہ چند شعر بطور نمونہ لکھے گئے

انتخاب کلام

ترسی چرا ز ساغر و مینائے مے چنیں — زاہد مگر خدائے تو آمرزگار نیست

ہر کس ز جور دشمن خود شکوہ ہا کند — ما چوں کنیم دشمن ما آشنائی ماست

ای برق جلوہ تو نشاید بکار من — محتاج یک نگاہ کسے خرمن من است

مکن بہ پیری من عیب حیرتا ہرگز — کہ حرف عشق بتاں کردہ ام جوانی خویش

جام زلف ساقی گلفام گرفتم — امروز من از ہر دو جہاں کام گرفتم

صاحب جارج فانتوم

خلف کپتان برنارڈ فانتوم۔ یہ اصل میں فرانسیسی ہیں۔ باپ ان کے چندے پونا چیری میں کہ دارالحکومت شاہ فرانس ہے ہے رکن اول کونسل تھے پھر نواب نظام الملک والی دکن کی سرکار میں فرانسیسی فوج کے کپتان ہوئے اور اس سبب سے کہ افسر اس فوج کے جنرل موسی رامون صاحب ان کے عزیز تھے روز بروز ترقی کی۔ جب وہاں کا معاملہ میر عالم نائب نواب ممدوح کے فساد سے برہم ہو گیا۔ یہ کرنل گارڈنر صاحب عرف گارڈن صاحب کی فوج پر عہدۂ کپتانی پر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد سرکار انگلیشیہ میں جنرل اخترلونی صاحب کے زیر حکم اسی عہدے پر نوکر ہوئے سنہ ۱۸۱۶ء میں پنشن لے کر بقیہ عمر امرائے ہندوستان کے مصاحبت میں بسر کی۔ چنانچہ حسب اجازت گورنمنٹ نواب احمد علی خاں بہادر مرحوم کے علاج کو اس دارالریاست میں آئے۔ علاج مفید ہوا۔ پھر رسم آمد و رفت رہی۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں نواب ممدوح کے نوکر ہوئے۔ سنہ ۱۸۴۲ء میں قضا کی۔ یہاں تک تو حال کپتان برنارڈ فانتوم کا ہوا۔ اب جارج فانتوم کا حال فرزند جن کا ذکر مقصود اصلی ہے لکھا جاتا ہے کہ اب ان کی عمر ۵۲ برس کی ہے۔ حافظ شیرازی طالب اور مولوی محمد نورالاسلام اور مولوی محمد حفظ اللہ سے فارسی اور عربی کتابیں پڑھیں۔ اور میر نجف علی شفقت سے علم شعر سیکھا۔ صاحب اور جرجیس دونوں ان کے تخلص ہیں۔ اور فارسی اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ چونکہ ان کو اس سرکار سے آبائی توسل ہے اسواسطے نام ان کا اس تذکرے میں درج ہوا۔ یہ ان کا کلام ہے۔

ریختہ

دیکھنے والے قد بالا کے ہیں — کیوں نہ ہم چشموں میں ہو اونچی نگاہ

یہ آرزو ہے تری آنے کی مجھے ای شوخ — کہ جھوٹے وعدوں پہ بھی انتظار باقی ہے

فارسی

امید صبح وصال صنم نماند مرا
شب فراق بسوز سینہ نشاند مرا

رباعی

گر دوست مرا دوست ندارد چہ کنم
بر حال من از رحم نیارد چہ کنم
راضی برضای دوست باش ای جبرئیل
تحریر ازل نمی شود رد چہ کنم

قطعہ

با جواہر خوش آب در تہ دریا
نتادہ است کہ کس ہیچ از آن ندارد یاد
بسا گلے کہ دمیدہ است کس ندیدہ آن را
کہ بوی خویش بویرانہ می دہد برباد

صبا منشی گوبند لال

پسر منشی گوکل چند۔ لکھنؤ کے متوطن ساٹھ برس کے قریب سن ہے۔ معانی بیان عروض قافیہ معما حساب جبر و مقابلہ جغرافیہ تاریخ مساحت فلاحت میں دستگاہ۔ نقاشی و مصوری و خط نستعلیق و ناگری و انگریزی و ناخن نگاری سے آگاہ۔ سرکار شاہی و انگریزی میں نوکر رہے۔ حسن سرانجام خدمت سے نامور رہے۔ اب حضور پر نور کے نمکخوار ہیں یہ ان کے اشعار ہیں

ریختہ

رنگ ای گل پیرہن ٹپکا ہی پڑتا ہے ترا
اوڑھا گر سادہ بھی تو رنگیں دوپٹا ہو گیا
گرمیاں وہ کرکے غیروں سے جلاتے ہیں مجھے
میں مسلماں جیتے جی ہندو کا مردا ہو گیا

ذکر خانی وخدا بھی روی صاف جاناں میں نہیں
زاغ طوطی کی حکایت اس گلستاں میں نہیں

شغل انکا ہی ستار جو مجھ سے بگاڑ سے ہے
در پردہ میرے ملنے کو یہ چھیڑ چھاڑ ہے

انتخاب قصیدہ فارسی

ہلال عید عیاں شد گذشت ماہ صیام
ز فرط سود ہم آہنگ زہرہ شد بہرام
نوائے نغمہ بیماں کار سے کند امروز
کہ نفخ صور نمی کند بروز قیام
عجیب نیست کہ از انبعاث عیش و سرور
بعجز دیر نماید رقص ہا اصنام
صلائے عام بزد محتسب بشرب و سماع
چو صوم عید دریں روز توبہ است حرام
ز فرط جوش ترنم نگاہ حرت زدن
کند بجنبش لب ہا سرود استفہام
ز بسکہ جوش نشاط است بطول چہ بعید
کہ در سماع در آیند اجتہ در ارحام
ز فیض بخشش او دشت خود پر از زر گرد
جنیں غنچہ گل در مشیمہ اکمام
سیاست فتن از ارض ہفت کشور برد
چنانکہ خون بباز جسم فصد ہفت اندام

انتخاب غزلیات فارسی

سرگیں چشمت سناں با من سخن ہا کردہ است
حیرتے دارم کہ چونش سرمہ گویا کردہ است

نباشد ہم وہاں ہم کمر اورا۔ دگر باشد
سر موئے وہاں باشد۔ رگ موئے کمر باشد

رباعیات

قلنا شمس الضحی اردنا وجہک
خلنا بدر الدجی قصدنا وجہک
یاذ الاکرام والعطایا والمجد
بل افضل منہما وجدنا وجہک

ای حق شرفت بنوع انسان داد است
صد فضل ز ہر جنس کمالت یاد است
در دہر عدیلیت چو شریک باری
کلی است ولے ممتنع الافراد است

حسنت زنمود خط کجا کاستہ شد
بل خوشتر از یں سنبل نو خاستہ شد
بر روئے خوشی تو این مثل صادق گشت
گل بود بسبزہ نیز آراستہ شد

عبرت حکیم میر ضیاء الدین

ابن سید علاء الدین شاہجہاں آباد انکا وطن آبائی ہے۔ مگر انہوں نے پرورش اسی دارالریاست میں پائی ہے۔ مصطفےٰ خاں عرف بجو خاں مرحوم کے نوکر سے۔ فن شعر میں نواب محبت خاں کی شاگردی سے بہرہ در تھے۔ ان کا کلام اور تو کچھ نہ ملا یک مادت کو جسقدر انہوں نے اردو میں موزوں کیا تھا اسے انتخاب کرکے لکھی۔ انتخاب مثنوی یک مادت

در حمد

کشش ہو دلکی یاں جو آہ نکلی
بہ شکل تبسم ا شد نکلی
ہو وحدت پہ دلیل اس کی یہ کثرت
ہر اک سبزہ ہی انگشت شہادت

در نعت

محمد کا زباں پہ نام آیا | قلم نے سر کو سجدے میں جھکایا

محمد سرور دنیا و دیں ہے | محمد رحمۃ للعالمیں ہے

در مدح نواب

اگر ہو بازخوں بلد کے در پے | بلا اسکے ہوش اُڑا دے جوں لطافے

در سبب تالیف

بدل شنگرف کے رنگ شفق ہو | گلستاں کا نمونہ ہر ورق ہو

خموش الفاظ ہوں جوں غنچۂ گل | معانی میں چھپا ہو شور بلبل

در پیدائش پدماوت

جو پایا دائی نے عالم نرالا | بغل میں اس کو دل کی طرح پالا

اسے باد مخالف سے بچاتی | چراغ آسا تہ دامن چھپاتی

نظر سے چشم بد کی بسکہ ڈرتی | جدا آنکھوں سے جوں پتلی نہ کرتی

رفتن پدماوت بسیر باغ و غسل کردن در دریا

یہ کس کے غمزے نے مارا ہے شبخوں | کہ ہے غنچے کی شاخ اک تیر پر خوں

سُنی ہے کسکے مقدم کی خبر عام | سراپا چشم ہے ہر نخل بادام

پھلا دی سی کبھی یاں اور کبھی واں | نگہ ساتھ اسکے تھی افتاں و خیزاں

در کیفیت غسل حسینان

فلک سے ماہ کرتا تھا اشارے | کہ برج حوت میں اُترے ہیں تارے

عجمی ہیرالال ولد لالہ چنی لال قوم کایتھ۔ مولانا محمد غیاث الدین صاحب عزت مرحوم کے شاگرد۔ عربی اور فارسی بھاکا سنسکرت سب زبانوں میں کامل تھے۔ حساب کے فن میں ید طولیٰ تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ ۶۵ برس کو پہنچکر ۱۲۷۵ھ میں قضا کی۔ یہ کلام ان کا ہے:۔

انتخاب مثنوی جوگ لبشت کہ ذوبحرین گفتہ

در حمد شاہد حقیقی

تافتہ از جلوۂ روئے تو ماہ | ساختہ شب سایۂ موئیت سیاہ

دیدنی و بینش و بینا توئی | ساقی و پیمانہ و مینا توئی

در نعت

پردۂ میمے برخ انداختہ | از عرب احمد علم افراختہ

در صفت رقاصہ

راحتِ دل خندۂ دنداں نما | آفت جاں حلقۂ زلف دوتا

ماہ دو ہفتہ خجل از روئے او | سنبل تر منفعل از موئے او

نصیحت پیر مردے

ای دُر ارزندۂ درج جلال | اختر تابندۂ برج جمال

ہر کہ در اندیشۂ کارے بود | یا دلِ او در کفِ یارے بود

کوششِ او کاشفِ دل بستگی ست | محنت او ثمرۂ وارستگی است

گلۂ افلاس

آمدہ جانم بلب از بیکسی | نامدہ نانم بکف از مفلسی

آتش معدہ شدہ زاں بلند | کز تبِ ساختہ دل چوں سپند

نظام سید نظام شاہ ابن سید احمد شاہ۔ بڑے خوش فکر و خوش مذاق۔ عاشقانہ شعر کہنے میں طاق طبیعت ادا بندی کی طرف بہت جاتی ہے۔ فکر رنگیں کیا کیا گل کھلاتی ہے۔ جناب مستطاب نواب محمد یوسف علی خاں صاحب بہادر ناظم فردوس مکان انار اللہ برہانہ کے شاگرد رشید ہیں۔ شیخ علی بخش بیمار اور اپنے پیر و مرشد میاں احمد علی مرحوم احمد تخلص سے بھی مستفید ہیں۔ سرکار میں نوکر تھے۔ قدردانی سرکار سے موقر تھے۔ پچاس برس کی عمر ہوئی۔ شعبان کی پچیسویں تاریخ ۱۲۸۹ھ میں قضا کی۔ بندگان حضور دام ملکہم و اقبالہم نے سب مسودات ان کے جمع فرماکے دیوان ترتیب فرمایا۔ اسی دیوان

ــــہ اس صنعت کو متلون بھی کہتے ہیں۔ اس مثنوی کا ہر شعر دو مختلف بحروں میں پڑھا جاسکتا ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) مفتعلن مفتعلن فاعلن یا فاعلات ÷ (۲) فاعلاتن فاعلاتن فاعلن یا فاعلات

اہل شیراز نے اس صنعت میں مثنوی سحر حلال لکھی ہے جس میں اس صنعت کے علاوہ یہ بھی کمال ہے کہ ہر شعر میں دو قافیے ہیں یعنی ہر ردیف میں صنعت تجنیس تام ہے

اسکا ایک شعر یہ ہے اے شدہ درخانۂ جاں منزلت ÷ خانۂ جاں یافتہ زاں منزلت

کا انتخاب ضبطِ تحریر میں آیا۔

انتخابِ کلام

وہ مجھ کو نظام کیوں مناتے | کیا جانئے یہ بھی کیا محل تھا

نہ پوچھو میری آنے کا سبب تم | میں خود حیراں ہوں اس محفل میں آکر

یوں ہم کو نہ دل سے تم بھلاؤ | دیکھو کبھی یاد آئیں گے ہم

انداز اپنے دیکھتے ہیں آئینہ میں وہ | اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو
اک لطف روز کے ہر سوال و جواب میں | ہم خود یہ چاہتے ہیں کہ وعدہ وفا نہ ہو
کس کس طرح ستاتے ہیں بت ہمیں نظام | ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ | دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ
دنیا وہ اس کا ساغر مے یاد ہے نظام | منہ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

اب تو سب کا ترے کوچے ہی میں مسکن ٹھہرا | یہی آباد ہے دنیا میں زمیں تھوڑی سی

ارباب ہوس کو تو نہ کچھ حوصلہ ہوگا | اچھا ہے جو وہ عذر ستم کا نہیں کرتے

ایسی حسرت سے جان دی کہ تجھے | اک تماشا دکھا دیا میں نے

یہ نمونہ انتخاب ہے حضرت امیر مینائی کے دلچسپ تذکرہ انتخاب یادگار کا جس میں نے ان مشاہیر و اساتذہ کا ذکر بالقصد ترک کر دیا ہے جو بہت مشہور ہیں اور جن کا کلام شائع و مشتہر ہے مثلاً اسیر۔ تسلیم۔ جلال۔ جان صاحب۔ داغ۔ غالب۔ قائم۔ منیر۔

اس انتخاب سے تذکرہ کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ نواب خلد آشیاں کی فرمائش اور حضرت امیر مینائی کی کاوش نے صرف شعرائے رام پور کی یادگار قائم نہیں کر دی بلکہ اس زمانے کی تقریباً تمام اساتذہ فن کا حال و کلام جمع کر کے نہایت قابل قدر بزم سخن آراستہ کر دی ہے۔ اس عہد ہمایوں میں ریاست رامپور کو شان مرکزیت حاصل تھی کہ اہل کمال وہیں آ آکر جمع ہو گئے تھے۔ اگر میر تقی و میر حسن۔ مرزا علی لطف و مصحفی و آشفتہ وغیرہ کے تذکروں کو اس زمانے میں شائع کرنے کی ضرورت ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ منشی امیر احمد صاحب مینائی کا تذکرہ اشاعت کیلئے قابل التفات نہ سمجھا جائے

تاج!

(ایک حسین تصور)

(رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک فکر رس نظم)

(ظفر قریشی دہلوی)

شاہجہاں تیری پرشوکت سلطنت تباہ ہوگئی مگر تو نے محبت کے ایک قطرۂ اشک کو غیر فانی بنا دیا!

زمانہ کو قلب انسانی پر مطلق رحم نہیں آتا۔ وہ زمانہ کی اس مایوس کن جد و جہد پر خندہ زن ہوتا تھا جو محبت کی یادگار کو ذہن سے محو کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ تاج! —— تو نے اپنے حسن سے اسے مسحور کر لیا اور غیر متشکل موت کو ایک ابدی صورت عطا کر دی —!

تاج! —— تو رات کے بھیانک سکوت میں اپنی محبوبہ سے (جو تیری آغوش میں ہے) جس راز کی سرگوشی کرتا ہے وہ پتھروں کے ابدی سکوت سے بلند آہنگ ہو جاتا ہے!

سلطنتیں مٹ گئیں، اور صدیاں ایک ہی تصور بن کر رہ گئیں لیکن مرمر اب تک ستاروں سے کہتا ہے —— "مجھے یاد ہے!"

ہاں! —— "مجھے بھی یاد ہے!" —— مگر زندگی بھلا دیتی ہے کیونکہ وہ "لا تناہیت" کی طرف لبیک کہتی رہتی ہے اور بغیر کسی زاد راہ کے سفر کرتی ہے —— پھر اپنے پیچھے حسن کی فراموش شدہ یادگاروں کے سوا کچھ نہیں چھوڑ کر جاتی —— یہ ہے تاج کے ابدی سکوت کا راز جو مرمریں در و دیوار سے بلند آہنگ ہے! فقط

نوائے راز

ازجناب ابو الفاضل رازؔ چاند پوری

یہ تو سچ ہے دہر میں راحت مجھے حاصل نہ تھی
مطمئن تھا دل کہ کوئی خواہش باطل نہ تھی

یہ تو مانا تیرے دل میں خواہش باطل نہ تھی
کامیابی کی ہوس بھی زیست کا حاصل نہ تھی

اپنی قسمت، لذّت بادہ کشی حاصل نہ تھی
ورنہ ایسی پاک دامن توبۂ باطل نہ تھی

کامیابِ آرزو ہونا مقدر تھا یوں ہی
ابتدا کی بیکسی انجام سے واصل نہ تھی

وہم اوہام و توہم تھا جو سدِ راہ تھا
ورنہ راہِ عشق میں تو ایک بھی مشکل نہ تھی

کیوں شکستہ دل نہ ہوتی عالمِ اسباب میں
وہ مری تدبیر جو تقدیر کی قائل نہ تھی

اے تری رحمت کے صدقے، تیری شفقت کے نثار
ایسی خوش قسمت تو میری آرزوئے دل نہ تھی

عمر بھر آسودۂ صحرا نوردی ہی رہا
جادہ پیمائے ہوس کی کوئی بھی منزل نہ تھی

انتہائے میکشی میں ہوشیاری بڑھ گئی
ابتدا میں تو یہ کیفیت مجھے حاصل نہ تھی

اے خوشا تقدیر، اے بخت رسا صد مرحبا
اب کہاں ہے مدعی میری طلب کامل نہ تھی

کس سے کہتا، کون سنتا رازؔ میری سرگزشت
محفل ہستی تو اہل راز کی محفل نہ تھی

چینی کا انتقام

از جناب سیّد بادشاہ حسن۔ حیدرآبادی

وہ تھک کر چور چور تھے۔ مندر میں نظر بند تھے۔ اُن کے قویٰ بے قابو ہو چکے تھے۔ اور تینوں بے سدھ پڑے تھے۔ میکسوڈ اور بریلیٹ گہری نیند سو رہے تھے۔ مگر گارڈن شا کچھ بے چین سا تھا۔

عبادت گاہ کے سامنے ایک کھلا اور کشادہ میدان واقع تھا۔ سورج ڈوبنے لگا تھا۔ اور اپنے غیر محسوس برش سے فضا پر ہلکا زردی مائل رنگ بھر رہا تھا۔ میدان کے مشرقی جانب کرنیں ندی کے صاف شفاف پانی کے بوسے لے رہی تھیں۔ ندی کے اُس پار چینیوں کا ایک ہجوم تھا جس کی نظروں اور بندوقوں سے بچنے کے لئے ان آدمیوں نے مندر کے اس حصہ میں پناہ لی تھی۔ مندر میں دھندلکا چھا رہا تھا کیونکہ بڑے بڑے پتھروں کی مدد سے انہوں نے تمام شگافوں کو بند کر دیا تھا۔ عبادت گاہ کی عمر تقریباً پانچسو سال تھی۔ لیکن بریلیٹ کا خیال تھا کہ سوائے چند چھوٹے چھوٹے سوراخوں کے ان کی جائے پناہ کافی محفوظ تھی۔

اُن سوراخوں میں سے زرد زرد شعاعیں مندر میں داخل ہو رہی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سیاہ زرہ بکتر میں نیزہ کا زرد چمکتا ہوا پھل پیوست ہو رہا ہے۔ ایک شوخ شعاع نے میکسوڈ کے چہرہ کو چھوا۔ اس کے سر کے بال پیشانی سے ہوتے ہوئے بند آنکھوں پر بکھرے پڑے تھے۔ نتھنوں کی سانس اٹک اٹک کر چل رہا تھا جس کی وجہ سے ایک ہلکی سی آواز پیدا ہو کر خاموش فضا میں ارتعاش برپا کر رہی تھی۔ منہ قدرے کھلا ہوا تھا اور گردن ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔

دوسری شعاع بریلیٹ کے چہرہ پر پڑی۔ وہاں تھکن کی جھرّیوں اور غفلت کے آثار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ گارڈن شا کونے میں ہونے کی وجہ سے شعاع کی دسترس سے باہر تھا۔ خراٹوں کے آواز سے اس کی موجودگی ظاہر تھی۔ ایسی آواز جو کرب و بے چینی کے عالم میں نکلتی ہو۔ اس کے منہ یا ناک سے نکل رہی تھی۔ ہر لحظہ خراٹوں کی تبدیلی بتا رہی تھی کہ وہ ان تینوں میں سب سے زیادہ تھکا ہوا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میٹھی نیند سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔ اور اس کی آواز اور حرکتوں سے ظاہر تھا کہ وہ پریشان خواب دیکھ رہا ہے۔

بندوق کی آواز! وہ چونک پڑا۔ اور بدحواسی کے عالم میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف گھورنے لگا۔ لیکن عبادت گاہ میں دہشت ناک اندھیرا تھا۔ اُس کے ساتھیوں نے جھنجھلا کر حرکت کی۔ اس نے اپنی بندوق پر نظر ڈالی جو دیوار سے لگی کھڑی تھی۔

"ہائیں! کیا دوسرا حملہ ہو رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ آنکھ ملتے ہوئے وہ بولا "شاید رات ہو چکی ہے"! وہ اُٹھا اور اپنی بائیں آنکھ ایک سوراخ سے لگا کر باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ کیا دیکھتا ہے کہ چادر ماہتاب ایک لامحدود فضا پر تنی ہوئی ہے۔ کہیں کوئی شکن دکھائی نہیں دیتی۔ مگر بیچ میدان میں کوئی کالی چیز نظر آئی۔ غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ ایک چھ یا سات سال کا بچہ زمین پر پڑا ہے۔ ڈھلی ہوئی گردن اور ظاہری آثار سے تجربہ کار شا نے معلوم کر لیا کہ وہ لڑکا ابدی نیند سو رہا ہے۔ فضا سفید دھوئیں کے بادل سے مکدر ہو گئی تھی۔

یقیناً اس لڑکے کی حالت قابل رحم تھی۔ ممکن تھا کہ چینیوں کے ہجوم میں سے ہی کسی سپاہی نے اُسکو اپنا دشمن سمجھا ہو۔ اور اس دھوکہ میں بندوق چلا دی ہو۔ مگر وہ اس سفید چاندنی میں لڑکے کو ضرور پہچان گئے ہونگے۔ اُس کمسن بچہ اور ایک نوجوان شخص ان دونوں کا

ذِق ان پر واضح ہوگیا ہوگا۔ پھر لڑکا کیسے مرا اور بندوق کس طرف سے چلی اس کے دو جواب تھے۔ ایک ندی کے اُس پار سے۔ مگر یہ سراسر ناممکن تھا۔ دوسرے عبادت گاہ ــــ شا ابھی انہیں خیالات میں غرق تھا کہ ایک سفید جھنڈے نے اُس کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ ندی کی طرف سے متعدد آدمی اُس جھنڈے کے سایہ میں مندر کی طرف آرہے تھے۔

ان تینوں قیدیوں میں سے ایک نے گہرا سانس لیا اور شا کو بندوق کا گھوڑا چڑھانے کی آواز سنائی دی۔

"بلند لبلبی مت دباؤ!" اُس نے کہا "پاگل ہوگئے ہو؟ لوگ لڑکے کے قاتل کی تلاش میں آرہے ہیں۔"

"ہاں" بریلیٹ بولا۔ "اور تم شرط بدھ سکتے ہو کہ وہ کسی بڑے آدمی کا لڑکا ہے۔ ورنہ لوگ تکلیف نہ کرتے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

"قاتل ہے کون؟" شا نے دریافت کیا۔

"مجھے کیا معلوم؟" بریلیٹ نے کہا۔ "بندوق کی آواز نے مجھے نیند سے چونکا دیا۔"

"اور مجھے بھی" میکسوڈ بولا۔

تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ شا نے ان دونوں کے چہروں سے جرم پہچاننے کی کوشش کی۔ لیکن تاریکی کی وجہ سے ناکام رہا۔ اُسے یقین تھا کہ ایک نے سراسر جھوٹ کہا ہے۔ مزید ثبوت کے لئے دعوئیں کا وجود کافی تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ میکسوڈ نے یا بریلیٹ نے، کس نے بندوق داغی اور کیوں ایک معصوم کی ننھی جان لی؟

عذر گناہ کا صرف ایک پہلو تھا۔ ایک قیدی نیند سے یکایک چونک پڑا۔ بدحواسی کے عالم میں اُسے حملہ کا گمان ہوا۔ سوراخ سے باہر دیکھا ایک چیز آہستہ آہستہ مندر کی طرف بڑھی چلی آرہی تھی بس بندوق اُٹھائی اور ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ ایک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شا نے گردن ہلائی۔ "وحشیانہ ـــــ بالکل وحشیانہ!" اُس نے دل میں کہا۔

میکسوڈ کی کھانسی سے اسکے خیالات پراگندہ ہوگئے۔ میکسوڈ سوراخ میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔

"انہوں نے لڑکے کو اُٹھالیا ہے ـــــ ایک بوڑھا آدمی اُس کو اپنے ہاتھوں پر لئے ہوئے ہے ـــــ سپاہیوں کا پیرے رہنا اور تعظیم کرنا بڈھے کی شخصیت کو اہمیت دے رہا ہے ـــــ یہ ہے کون؟"

بریلیٹ اور شا بھی سوراخوں میں سے دیکھنے لگے۔ ایک متین مُسن شخص مقتول کو ہاتھوں پر لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ پیچھے نصف درجن چینی سپاہی سفید جھنڈیاں لئے ہوئے تھے۔ بوڑھا مندر کی طرف آرہا تھا۔ انہوں نے صاف طور پر دیکھا کہ یہ دراز قامت بوڑھا شخص چینیوں کا لباس زیب تن کئے ہوئے ہے۔ چاندنی میں اس کا کتابی چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں، اور نظاہری خدوخال سے فراست اور دانائی ٹپکتی تھی۔

بوڑھا آدمی مندر کی دیوار سے چند گز فاصلہ پر کھڑا ہوگیا۔ "میں کان سن ہوں" اُس نے صاف انگریزی میں کہا۔

میکسوڈ کے منہ سے بے ساختہ ایک ہلکی چیخ نکل گئی۔ اور بریلیٹ کی زبان سے بے اختیار "اوہ!" نکلا۔ وہ اس نام سے بخوبی واقف تھے۔

کان سن ابھی تک لاش کو سینہ سے لگائے تھا۔ اس نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس میں کوئی فریب نہ ہوگا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ مہربانی کرکے اپنے آپ کو ظاہر کیجئے۔"

"اگر ہم ایسا کریں گے تو عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔" بریلیٹ نے اندر کہا۔ "اسے بھی قتل کردینا چاہئے۔ بغاوت پوری ہو جائے گی اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اس نے بندوق کا گھوڑا چڑھایا۔

آواز کی رہبری پر شا نے ہاتھ بڑھایا اور حسن اتفاق سے بریلیٹ کا داہنا ہاتھ اس کی گرفت میں آگیا۔

"احمق!" اس نے کہا۔ "اس سے کیا مدد ملے گی؟ اب ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے۔ ہمیں اس کا کہا ماننا چاہئے۔" اس نے دوسرا ہاتھ دراز کیا اور سنتریوں کو ڈھکیل کر گرا دیا۔

کسی سیال چیز کی طرح چاندنی موقع پاکر فوراً ہی مندر میں داخل ہوگئی بس! بریلیٹ اور میکسوڈ یکے بعد دیگرے باہر نکلے۔ اور کان سن کے

روبرو کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اس نے ان کی طرف دیکھا۔ شا اس دردناک منظر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"مجھے افسوس ہے!" کان سن کہنے لگا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگوں پر حملہ کیا گیا۔ یہ لوگ (اس نے ندی کی طرف اشارہ کیا) بے وقوف ہیں۔ میں معافی چاہتا ہوں۔"

میکسوڈ نے ایک اطمینان کا سانس لیا۔

"میں یہاں اپنی فوج کے ہمراہ ایک گھنٹہ قبل آیا!" کان سن اپنی مخصوص آواز میں بولا۔ "اور آپ سے آکر معافی چاہنے والا ہی تھا کہ ۔۔ ۔۔۔۔ میرا لڑکا جو میرے ساتھ تھا ۔۔۔۔۔۔ یہی میرا چہیتا بچہ ہے" اس نے لڑکے کو ہاتھوں کے سہارے بلند کیا۔

میکسوڈ کے منہ سے ایک ہلکی سی خوفناک چیخ نکل گئی۔ بریلیٹ کے چہرہ سے کرب و بے چینی کے علامات ظاہر تھے۔

"وہ خیمہ سے باہر نکل پڑا۔" کان سن نے سلسلہ جاری رکھا۔ "وہ بہت کم سن تھا اور لڑکپن کی بے باکی سے اس مندر کی طرف آ نکلا ۔۔۔۔ تم میں سے کسی ایک نے اس کو مار ڈالا۔ یہ میرا اکلوتا لڑکا تھا۔ مجھے اس سے بے حد محبت تھی۔"

آہستہ سے اس نے آنکھیں پھیر لیں اور باری باری ایک ایک کی طرف ٹکٹکی لگائے اس خیال سے گھورتا رہا کہ شاید چہرہ سے دل کا حال معلوم ہو جائے۔

"اس کو کس نے قتل کیا؟"

"میں نے قتل نہیں کیا۔ میکسوڈ فوراً چلایا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ اس وقت میں سو رہا تھا۔"

"اور میں نے بھی نہیں مارا۔" بریلیٹ نے اطمینان دلایا۔

"اور تم؟" کان سن نے شا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ میں بھی سو رہا تھا۔"

بوڑھے نے نعش کی پیشانی کو چھوا۔ "تم میں سے ایک نے ضرور اس کو مارا۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تم اس کو ثابت نہیں کر سکتے۔" میکسوڈ چیخنے لگا۔ "شاید تمہارے ہی آدمیوں میں سے کسی نے اس کو مارا ہو۔ جان بوجھ کر نہیں بلکہ دھندلی روشنی میں۔ ممکن ہے ان کی نظروں نے دھوکا کھایا ہو۔ اور یہ سمجھ کر کہ ہم میں سے کوئی ہے گولی چلا دی ہو۔"

کان سن کے منہ سے ایک آواز نکلی جو نفرت کا اعلان کرتی تھی۔

"تم میں سے ایک نے اس کو مارا۔" اس نے دہرایا۔ "قاتل کو خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ لیکن دوسرے دونوں بالکل آزاد ہوں گے۔ بلکہ میں حکم دوں گا کہ انہیں حفاظت کے ساتھ وطن پہنچا دیا جائے۔ لیکن قاتل ۔۔۔۔ بتاؤ کون ہے؟"

"سچ کہتا ہوں میں سو رہا تھا۔" میکسوڈ چلایا ۔۔۔ "میں بھی نیند میں تھا۔" بریلیٹ نے کہا۔

کان سن کی نیم وا آنکھوں سے حقارت ٹپکنے لگی۔ وہ بلی کی طرح مسکرایا۔ "بندوق خود بخود نہیں دغتی" وہ کہنے لگا۔ "میں چینی ہوں۔ لیکن یورپ میں ایک عرصہ تک رہ چکا ہوں۔ اور اتنا بخوبی جانتا ہوں کہ جب تک کوئی لبلبی نہیں دباتا بندوق کی نالی سے گولی نہیں نکلتی ۔۔۔ اقبال جرم کے لئے میں ایک گھنٹہ کی مہلت دیتا ہوں۔" اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور ندی کی طرف اشارہ کیا۔

تینوں کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ انہیں ندی کے کنارے ایک توپ نظر آئی جس کے وجود کا علم انہیں اب تک نہ تھا۔ یکایک وہ بدحواس ہو گئے۔

"میرے یہاں توپ خانہ ہے" کان سن کہنے لگا۔ "اگر اس ایک گھنٹہ میں ملزم نے اقرار نہ کیا تو مندر میں تم تینوں کا خاتمہ کر دیا جائیگا۔ میری فوج میں سوار بھی ہیں اگر تم نے فرار ہونے کا ارادہ کیا تو ۔۔۔۔"

اس نے اپنے شانوں کو حرکت دی۔ وہ مڑا اور چل دیا۔ لڑکا ابھی تک اس کی آغوش میں تھا۔

تھوڑی دیر تک تو تینوں خاموش تھے۔ میکسوڈ اپنے عرق آلود چہرہ پہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ بریلیٹ کان سن کو واپس ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ شا تیزی سے سانس لے رہا تھا۔

"شیطان کہیں کا!" میکسوڈ نے طیش میں چلا کر کہا۔ "ہمیں ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی فکر میں ہے ۔۔۔"

"اگر قاتل اقرار نہ کرے تو" شا نے اضافہ کیا۔

"میں نے قتل نہیں کیا" میکسوڈ ہاتھ ہلاتے ہوئے تیزی سے کہنے لگا۔ "اے قاتلو! کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھ میں بےگناہ بھی موت کے گھاٹ اُتر جاؤں۔ محض اس لئے کہ تم اقبال جرم کی ہمت نہیں رکھتے"

"بس بس!" بریلیٹ چلایا "خرگوش کی طرح نہ دو۔ اگر اس سے تسلی ہوسکتی ہے تو سن۔ میں نے اس کو نہیں مارا"

"کیوں جھوٹ بولتے ہو؟" شا نے قطع کلام کیا "تم دونوں میں سے کسی ایک نے ضرور ہی بندوق داغی۔ دھماکے سے میں چونکا تو فضا میں دھواں موجود تھا"

تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا تم اس طریقہ سے اپنے آپ کو بےگناہ ثابت کرنا چاہتے ہو؟ خوب! اچھا ڈھنگ نکالا۔ مگر یاد رکھو اس سے کام نہ چلے گا"

"تمہاری نظروں میں میں بھی مشتبہ ضرور ہوں"۔ شا نے کہا "مگر..."

بریلیٹ نے ایک خشک قہقہہ لگایا۔ "اتنا ہم جانتے ہیں کہ قاتل ہم میں سے ایک ضرور ہے" وہ کہنے لگا "لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کون ہے۔ اب ہم بندوقوں کا معائنہ کریں گے۔ اس سے شاید پتہ چلے"

تینوں جانتے تھے کہ اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ بندوقیں ایک ساتھ دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔ چونکہ سب کی سب بھری رکھی گئی تھیں اس لئے جس میں ایک گولی کی کمی ہوئی اسی پر شبہ ہوسکتا تھا۔ بندوقوں کی دیکھ بھال کی گئی تو ایک میں گولی ندارد تھی۔ اس سے یہ تو یقین کے ساتھ معلوم ہوسکا کہ اسی بندوق کی مدد سے ایک معصوم کی جان لی گئی لیکن یہ معلوم کرنا دشوار بلکہ ناممکن تھا کہ کس شخص نے داغی۔

بریلیٹ نے اپنی گھڑی دیکھی۔ دس منٹ گذر چکے تھے۔

میکسوڈ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا "میں نے بندوق نہیں داغی۔ ایک ڈرپوک کی وجہ سے میں عذاب میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا۔ اور پھر چینیوں کا عذاب۔ ایک دفعہ ہی مرجانا اتنا تکلیف دہ نہیں لیکن یہ بدمعاش تو اپنے قیدی کی آہستہ آہستہ جان لیتے ہیں۔ سخت اذیتیں دیتے ہیں۔ میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا نہیں چاہتا۔ تم دونوں میں سے ایک کو جرأت کرنی چاہیئے۔ اوہ! خدا کے لئے ——!"

"دیکھو" بریلیٹ سخت لہجہ میں کہنے لگا۔ اگر ذرا بھی امکان ہوتا تو میں فرار ہونے کا مشورہ دیتا۔ لیکن کان کسن کے سواروں سے ہم نہیں بچ سکیں گے۔ اس وقت ایک کے بدلے تین جانیں اف! —— بہتر یہی ہے کہ قاتل بہادری سے کام لے کر اقرار کرلے۔ یاد رکھو چینی اپنے انتقام میں شیطان سے بدتر ہوتا ہے۔ اس کے چنگل سے رہائی پانا محال ہے۔ سچ کہتا ہوں اگر میں قاتل ہوتا تو ضرور اقبال کرلیتا۔ اپنی ایک جان کی وجہ سے دوسرے دو ساتھیوں کو کبھی برباد نہ کرتا۔ ہمت مردانہ کی ضرورت ہے"

"ہاں" شا نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا "میں بھی اقبال کرلیتا"

میکسوڈ کے مرتعش لبوں کو جنبش ہوئی۔ "اور میں بھی"

پھر ایک بار خاموشی چھا گئی۔ چاندنی میں صاف نظر آرہا تھا کہ تینوں ایک دوسرے کے چہرہ کو مشکوک نظروں سے تک رہے ہیں۔ جہاں تک نظریں کام کرتی تھیں کوئی متنفس دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن ندی کے کنارے ایک کالی سی لمبی چیز نظر آرہی تھی۔ وہی جسے چینی اپنا انتقام لینے والا تھا' اور جس کے دیکھنے سے تینوں کے دلوں میں دہشت پیدا ہوتی تھی۔

جیسا کہ اکثر ہوتا ہے اس موقعہ پر شا کی نظروں کے آگے گذشتہ واقعات یکے بعد دیگرے آنے لگے۔

اُس نے دیکھا کہ وہ اپنے دواخانے میں کام کررہا ہے۔ اسکی نگرانی' ہمدردی اور محنت نے چینی دیہاتیوں کو گرویدہ کرلیا۔ گو وہ وطن سے دور تنہائی کی زندگی بسر کررہا تھا لیکن وہ نوجوان تھا اور فطرت سے ایک غمگسار دل لیکر پیدا ہوا تھا۔

یکایک خانہ جنگی شروع ہوئی۔ زخمیوں سے شا کا دواخانہ بھر گیا۔ جس طرف دیکھو کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ دیہاتی کان کسن کا نام کانپتے ہوئے لیتے اور خدا کی پناہ مانگتے کیونکہ وہ اسے امن کا دشمن خیال کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے قصبے' گاؤں اور شہر خالی کرنے شروع کئے اور جان بچاکر ملک کے مغربی حصہ میں امن و امان کی زندگی بسر کرنے چلدیئے۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ شا اپنے دواخانہ میں' جو خالی پڑا تھا' کام میں مصروف تھا۔ کہ یکایک دو انگریز اس کے یہاں وارد ہوئے۔

وہ ندی عبور کر کے آ رہے تھے۔

"جلدی کرو۔ جلدی کرو" ایک نے پریشانی کی حالت میں کہا۔ "چلو۔ یہاں سے بھاگ نکلو۔ کان سن اس طرف آ رہا ہے۔ وہ بہت قریب پہونچ چکا ہے۔ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرو —— یا اللہ! سننا! —— باہر ایک زوردار دھماکہ ہوا۔

شا نے فوراً ایک گٹھڑی میں کھانے کی چیزیں باندھ لیں اور تینوں تیزی سے ندی کے کنارے پہونچ گئے۔ کشتی کھیتے ہوئے وہ دور نکل گئے۔ دونوں اجنبی پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھ رہے تھے۔ جب ذرا اطمینان ہوا تو دونوں نے اپنا تعارف کرایا۔ ایک کا نام میکسوڈ تھا۔ وہ ریشم کے کارخانہ کا ایجنٹ تھا۔ دوسرا بریلٹ تھا۔ وہ یہاں انجنیئر تھا۔

"ابھی ہم کچھ زیادہ محفوظ نہیں ہیں" بریلٹ کہہ رہا تھا "کیوں کہ کان سن اور اس کے ساتھی بے دردی کے ساتھ گولی چلاتے ہیں"

شا کو معلوم تھا کہ کان سن ایک مہذب، عقلمند اور تعلیم یافتہ چینی تھا۔ یہ بلوہ صرف ایک ظالم و جابر صوبہ دار کے خلاف برپا کیا گیا تھا۔

میکسوڈ کے اوسان اب بحال ہو چکے تھے۔ اس نے اپنے گذشتہ واقعات بڑے مزے لے لے کر سنانا شروع کئے۔ چینیوں کی زندگی، ان کا سادہ طرز عمل اور تجارت میں میکسوڈ کی عیاری مکاری اور دھوکہ بازی ایک پرلطف داستان تھی۔ بریلٹ نے بھی اپنے تجربات فخر و مباہات کے لہجہ میں بیان کئے۔ اسے ناز تھا کہ اس نے غریب چینیوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی اور انہیں دھوکہ دے کر اپنا دامن زر و جواہر سے بھر لیا۔ شا کا ان باتوں سے ناک میں دم آ گیا۔

اس نے اپنے دل میں کہا "یہ گورے لوگ ہیں۔ انہیں مہذب اور متمدن ہونے کا دعویٰ ہے —— اُف ری ذہنیت! اپنی بدکاری اور دغابازی پر ناز ہو رہا ہے۔ سچ ہے ایسے ہی نامعقول انگریزوں کی وجہ سے ملک بدنام ہوتا ہے" اور اس نے اونچی آواز سے کہا "کیا انسانیت اسی کا نام ہے؟"

"رہنے بھی دو"۔ بریلٹ نے بات کاٹ کر کہا "یہ پند و نصیحت کرنے کا موقع نہیں ہے"

"چپ رہو" میکسوڈ کہنے لگا "چپ رہو! واہ! یہ بھی کوئی لڑنے جھگڑنے کا وقت ہے؟ اپنی اپنی خیر مناؤ۔ دیکھتے نہیں کہ دشمن ہماری گھات میں ہے؟"

تینوں چپ ہو گئے۔ صرف کشتی کھینے کی آواز کان میں آ رہی تھی یا بندوق چلنے کی دھیمی صدا۔ میکسوڈ کے بشرے سے خوف کے علامات ہویدا تھے۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا اور مارے دہشت کے کانپ جاتا تھا۔

بریلٹ نے یہ حالت دیکھ کر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا "آؤ کچھ دیر کے لئے تاش کھیلیں۔ شاید اس سے تمہارا دل بہل جائے"

شا نے اپنی جیب سے پتے نکالے مگر بریلٹ کے پاس بھی ایک گنجفہ تھا۔ اس نے شا کو اپنے پتے رکھ لینے کے لئے کہا۔ ایک گھنٹہ تک وہ برابر تاش کھیلتے رہے۔ آخر وہ کنارے پر پہونچے یہاں انہیں بے شمار کشتیاں نظر آئیں جن پر مسلح سپاہی سوار تھے۔

"یا اللہ!" میکسوڈ چلایا "یہ تو کان سن کے سپاہی معلوم ہوتے ہیں۔ ہم ......" یکایک وہ رکا۔ ایک گولی سن سے اس کے کان پر سے نکل گئی۔ تینوں ساتھی کشتی کے پیندے سے چمٹ گئے اور چیخ چیخ کر ملاح سے کہنے لگے "جلدی کر۔ جلدی کر —— تیز چلا" چینیوں کی ایک کشتی اُن کے تعاقب میں نکلی۔ پانی پر رہ کر بچنا تو محال تھا۔ کیونکہ چینیوں کی کشتی تیز رفتار تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ ان کو آ لیگی۔ لامحالہ جان پر کھیل کر انہوں نے کنارہ کا رخ کیا کہ زمین پر پہونچ کر چٹانوں کی آڑ میں کہیں نہ کہیں پناہ لیں گے۔

خدا خدا کر کے کشتی کنارے لگی۔ میکسوڈ سب سے پہلے کودا۔ بریلٹ بندوقیں سنبھال کر اُترا۔ اور پیچھے شا توشہ لیکر زمین پر پہونچا۔ چٹانوں کے پیچھے ایک کھلا میدان تھا۔ اور نصف میل کے فاصلہ پر ایک پرانی عمارت دکھائی دی۔ اس عرصہ میں دشمن بھی کنارے پر آ پہنچے تھے۔ گولیاں تڑ تڑ ان کے تعاقب میں آ رہی تھیں۔ اگر چٹانیں بیچ میں نہ ہوتیں تو تینوں کبھی کے

ڈھیر ہو جاتے۔ غرض جان ہتھیلی پر لئے چھپتے چھپاتے بھاگ رہے تھے۔ اور جب کبھی موقع ملتا دھائیں دھائیں گولیاں چلاتے۔ آخر کب تک مقابلہ کرتے۔ ادھر تین تھکے ماندے بھوکے پیاسے آدمی اور ادھر ایک مسلح فوجی دستہ۔

آفتاب غروب ہونے کو تھا۔ اور پرانی عمارت جو عبادت گاہ معلوم دیتی تھی، تھوڑے فاصلہ پر تھی۔ اگر وہ اس کے اندر صحیح سلامت پہنچ جائیں تو کچھ امید ہو سکتی تھی تینوں لپک کر اس میں جا گھسے اور انہوں نے بڑے بڑے پتھروں سے راستہ بند کر دیا۔ چند سوراخ کھلے رکھ دیئے تاکہ اندر سے دیکھ سکیں اور بروقت ضرورت بندوق چلا سکیں۔ اطمینان سے رات یہاں کٹ سکتی تھی میکسوڈ اور برلیٹ پر نیند نے فوراً ہی اپنا تسلط جمالیا۔ لیکن شا کچھ بے چین سا تھا۔

"صرف چالیس منٹ باقی ہیں"، برلیٹ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم میں سے ایک کو وہاں جلد پہنچ جانا چاہیئے"، میکسوڈ بڑبڑایا۔ "ورنہ ہمارا خون ناحق تمہاری گردن پر ہوگا"۔

"نہیں نہیں! یوں تصفیہ نہ ہوگا"، شا نے کہا۔ "ہمیں قرعہ اندازی سے کام لینا چاہیئے۔ اس صورت میں اگر ایک بے گناہ قتل بھی ہو جائے تو کیا؟ دوسرا بے گناہ تو بچ جائے گا"۔

"مجھے اس سے اتفاق ہے"، برلیٹ نے درشت لہجہ میں کہا۔

"مگر۔ مگر"، میکسوڈ کہنے لگا۔ "یہ خوفناک! فرض کرو کہ قرعہ میرے نام پر پڑے؟ چینیوں کا انتقام ——— اُف! میں جانتا ہوں۔ خدا کی پناہ! وہ ———"

"اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا"، برلیٹ نے لاپروائی سے کہا۔ "یہی ایک طریقہ ہے ——— قرعہ اندازی کس طرح کرنی چاہیئے؟"

"لینا یہ پتے ہیں!" شا بولا۔

"نہیں نہیں!"، میکسوڈ چلانے لگا۔ "سوچو تو۔ یہ اہم معاملہ ہے نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

برلیٹ نے اپنی ٹھوڑی کھجائی۔ پھر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا جس میں طنز کا لہجہ عیاں تھا۔ "اچھا ایسا کریں گے، میکسوڈ"، وہ بولا۔ "ہم میں سے ہر شخص ایک ایک پتہ لے گا جس کو سب سے پہلے اکا ملے، اس کو کان سن کے پاس بلا چون وچرا چلا جانا چاہیئے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

میکسوڈ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے دوبار منہ کھولا۔ لیکن کوئی آواز نہ نکلی بشرہ سے وحشت اور پریشانی ظاہر تھی۔

"ٹھیک ہے"، شا بولا۔ "بس اسی طرح تصفیہ کرنا چاہیئے"۔

میکسوڈ ابھی ہکا بکا ہو کر کبھی شا اور کبھی برلیٹ کا منہ تک ہی رہا تھا کہ شا نے برلیٹ کے پتے اس کے ہاتھ میں دیدیئے۔ "لو! انہیں اچھی طرح ملا کر رکھدو"۔

سوراخوں سے چاند کی شعاعوں نے داخل ہو کر جگہ کو کافی روشن بنا رکھا تھا۔ اس کی روشنی میں تینوں کے چہرے صاف نظر آرہے تھے۔ میکسوڈ پسینے میں شرابور تھا۔ اور ایک آدھ قطرہ پیشانی سے کبھی کبھی ٹپک جاتا تھا۔ آنکھیں بہت کم جھپکتی تھیں۔ چار ناچار اس نے پتے ملانے شروع کئے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ دل میں عزم کر لیا کہ خدانخواستہ اگر اکا پہلے اس کے حصہ میں آیا تو وہ کبھی جانے پر راضی نہ ہوگا۔ بلکہ چیخ چیخ کر انہیں اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرے گا۔ چاہے دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے۔ مگر وہ اس طرح موت کے منہ میں ہرگز ہرگز نہ جائے گا۔ برلیٹ کے چہرے سے متانت ٹپکتی تھی۔ اور شا زرد پڑ گیا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو سنبھالے رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

میکسوڈ نے سب سے پہلے پتا اُٹھایا ——— بادشاہ تھا۔ اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔

برلیٹ کے حصہ میں رانی آئی ——— شا کا پتا غلام نکلا۔

تھوڑی دیر تک اسی طرح پتوں کے دور ہوتے رہے۔ لیکن اب تک کسی کو اکا نہ ملا۔ حالانکہ پتے تقریباً ختم تھے۔ صرف دس پتے باقی رہ گئے تھے۔ جن میں چار یقینی اکے تھے!

میکسوڈ نے اپنے چہرہ سے پسینہ پونچھا اور ڈرتے ڈرتے پتا اٹھایا ——— دہلا تھا۔ وہ مارے خوشی کے اچھل پڑا۔ "دیکھا! دہلا ہے دہلا!" وہ چلایا "میرے حصہ میں دہلا آیا ہے۔ اکا نہیں۔

دیا ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔ برلیٹ چلو اپنا پتا اُٹھاؤ۔ دیکھو تو سہی کا تو نہیں۔ چلو جلدی کرو۔"

برلیٹ نے بھی پتا اٹھایا۔ اس کے منہ سے خوشی کی ایک ہلکی چیخ نکل گئی۔ پتا نہلا تھا۔ اب شا کی باری تھی۔

شا نے اپنا ہاتھ بڑھایا جو کس قدر کانپ رہا تھا میکسوڈ اور برلیٹ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پتے کو جو الٹا رکھا ہوا تھا، دیکھ رہے تھے۔ شا نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بند کر لئے۔ اپنے ساتھیوں پر نگاہ غلط انداز ڈالی اور پھر ——— اور پھر پتا اٹھایا۔ جیک تھا ——— دو چیخوں نے ایک گہرے سانس کی آواز کو دبا دیا۔ اب میکسوڈ کی باری تھی۔

"میں بے گناہ ہوں" اس نے جوش سے کہنا شروع کیا "تم لوگ جانتے ہو کہ میں بالکل بے گناہ ہوں۔ پھر بھی میں تمہاری جان بچانے کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیتا ——— لیکن کیا کروں کہ میں ——— میں ——— میری جوان بیوی اور دو چھوٹے چھوٹے بچوں کا خیال دامنگیر ہوتا ہے اگر میں مارا جاؤں تو اُن کا کوئی پرساں حال نہ ہوگا۔ نگرانی کون کرے گا؟ بنک میں ایک پیسہ بھی نہیں رکھا اور نہ بیمہ کمپنی میں ایک حبہ جمع کرایا۔ بس سمجھ لو کہ میرے ساتھ دو معصوم بچوں اور مفلس بیوی کا خاتمہ ہو جائے گا۔" میکسوڈ نے اپنی گردن نیچی کر لی تاکہ اس کے چہرے سے اس کا جھوٹ عیاں نہ ہو جائے۔ میکسوڈ کی نہ بیوی تھی اور نہ بچے۔

"شا ہے تو ذرا بیوقوف" برلیٹ اپنے دل میں کہنے لگا "لاؤ میں بھی میکسوڈ کا طریقہ کیوں نہ اختیار کروں؟ ممکن ہے نبھ جائے۔" اُس نے اونچی آواز سے کہا "میکسوڈ! یہ سچ ہے کہ میں ابھی کنوارا ہوں، لیکن تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ میری ماں سخت بیمار ہے۔ اسی لئے میں جلد گھر لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فطرتاً میری یہ خواہش بجا ہے کہ اس کے مرنے سے پہلے میں اس کا دیدار کر لوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی لازمی ہے کہ وہ بھی میرے لئے بیحد بے چین ہوگی۔ میری موت کی خبر آنا اس کی جان لے لیگی۔ پس ظاہر ہے کہ میری زندگی سے ایک اور عزیز جان وابستہ ہے۔" برلیٹ نے اپنی گردن پھیر لی اور توپ کی طرف دیکھنے لگا۔

شا نے یکے بعد دیگرے دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی نوجوان تھا اس کے جذبات میں ہیجان عظیم برپا ہو گیا۔ "ان دونوں میں سے ایک یقیناً قاتل ہے۔" اس نے سوچا۔ "پھر میں کیوں خواہ مخواہ ———

"میکسوڈ کے معصوم بچے اور مفلس بیوی" ایک غیبی آواز نے اس کے کان میں کہا۔ "برلیٹ کی بیمار ضعیف ماں ——— لیکن تجھے نہ تو بیوی بچے ہیں اور نہ ضعیف ماں۔ دنیا میں تجھ سے بہتر اور ہمدرد ڈاکٹر موجود ہیں۔ پھر تو کیوں . . ." متضاد جذبات باہم دگر دست گریباں ہونے لگے۔

دل نے کہا "تو ابھی نوجوان ہے۔ صرف ۲۶ بہاریں ہی دیکھی ہیں تجھے دنیا میں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ ان دونوں میں سے ایک ضرور قاتل ہے۔ پھر تو اپنی جان مفت میں کیوں گنواتا ہے؟"

"شا!" ضمیر نے کہا۔ "انسانیت کا خیال ہے اور شرافت کا پاس ہے تو ایثار کر۔ ایثار! تیری وجہ سے ایک بے گناہ کی جان بچ سکتی ہے" ——— شا اب ایک فیصلہ پر پہنچ چکا تھا۔

میکسوڈ گردن جھکائے کسی سوچ میں غرق تھا۔ برلیٹ گردن موڑے توپ کو ٹکٹکی لگائے گھور رہا تھا۔ شا نے جلدی سے اپنے پتوں میں سے نظر بچا کر ایک اکّا اُٹھا لیا اور کہا "یہ دیکھو!" دونوں نے ایکدم سے اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس کے ہاتھ پر نظر ڈالی۔ ایک ساتھ دونوں کے منہ سے چیخ نکل گئی ——— خوشی کی چیخ!

"اوہ!" میکسوڈ، شا کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے چلایا "شاباش شا۔ شاباش! دیکھنا برلیٹ! اس کو اکّا ملا ہے۔ اب ہم بچ جائیں گے۔ کیوں ہے نا؟ واہ بھئی واہ! جوانمرد ایسے ہوتے ہیں"

"واللہ راست! تم سے ایسی ہی امید تھی" برلیٹ نے اپنی خوشی کو دباتے ہوئے کہا "آدمی مرے بھی تو بہادری سے مرے۔"

میکسوڈ بھرائی ہوئی آواز سے کہنے لگا "شا! مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے۔ مگر کیا کروں کہ بیوی بچوں کا خیال مجھے ستا رہا ہے۔ ورنہ یاد رکھو تمہارے لئے میں اپنی جان تک دیدیتا۔"

"تم جو کچھ کر رہے ہو عین انسانیت کا تقاضہ ہے شا!" برلیٹ نے کہا۔ "میں خود بھی ایسے موقعہ پر یہی کرتا لیکن کیا کروں؟ مجبور ہوں ——— ماں ——— میری پیاری اماں!"

شا موت کے پنجہ میں جا رہا تھا۔ اور میکسوڈ اور برلیٹ کی مسرور

آنکھیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ آخر جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میکسوڈ نے ایک قہقہہ لگایا "ہم اب بالکل محفوظ ہیں" اس نے اطمینان کے لہجہ میں کہا "کان سن نے وعدہ کیا تھا کہ ہمیں بحفاظت تمام وطن پہنچا دے گا۔ یہ چینی وعدہ کے پکے ہوتے ہیں۔ کیوں ہے نا؟ —— ممکن ہے شا نے ہی اس لڑکے کو قتل کیا ہو"

"ناممکن۔ سراسر ناممکن" برلیٹ کہنے لگا "علانیہ اس نے قربانی کی۔ باری تمہاری تھی اور حقیقت میں کان سن کے ہاں تمہیں جانا چاہیئے تھا"

"یہ تو سچ ہے" میکسوڈ نے اقرار کیا "لیکن —— لیکن —— اگر میں نہ گیا تو تم کو جانا چاہیئے تھا۔ کیونکہ میرے بعد تمہاری باری تھی"

"میں کیوں جاتا؟" برلیٹ نے کڑک کر پوچھا۔ "قرعہ اندازی کے لحاظ سے تو تم کو جانا چاہیئے تھا اور اگر تمہیں پس و پیش تھا تو یہ تمہاری بزدلی تھی"

"لاحول ولا!" میکسوڈ نے اپنا لہجہ بدل کر کہا "پھر وہی کج بحثی۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ جان کے معاملے میں قرعہ اندازی کچھ ٹھیک نہیں۔ یہ تو علانیہ ظلم اور جرم تھا کہ خواہ مخواہ ایک بے گناہ کو شکارِ اجل بنایا جائے۔ سوچو تو سہی۔ اگر شا بھی مجھ جیسا بے گناہ ہوتا تو جان بوجھ کر اپنے آپ کو موت کے منہ میں نہ لے جاتا۔ یقین مانو۔ بے جرم، بے گناہ شخص اپنے مرنے پر یوں کمر نہیں کستا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یقیناً شا ہی قاتل ہے۔ مانا کہ اس وقت میری باری تھی مگر اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میں کبھی بے گناہ مرنا پسند نہ کرتا اور نہ تم ہی چاہتے۔ اگر وہ نہ جاتا تو ہم تینوں موت کے گھاٹ اُتار دئیے جاتے۔ ایسی صورت میں بھی اس کا مرنا لازمی تھا۔ ضمیر برابر نیک ہدایت کرتا ہے۔ خواہ وہ قاتل کا ہو یا بے گناہ کا آخر وہ اقبالِ جرم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اب چاہے تم اس کو اعتراف گناہ سمجھو یا قربانی اور ایثار"

"تم جھوٹے ہو"۔ برلیٹ نے تیز ہو کر کہا۔ "میرا ضمیر کہتا ہے کہ تم ہی قاتل ہو۔ اور میں شرط باندھنے کے لئے تیار ہوں"

"بھلے آدمی یہ شرط باندھنے کا وقت نہیں۔ جان بچانے کا وقت ہے" میکسوڈ مسکرا کر بولا۔

شا اس موت کے میدان میں آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ فضا پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور سماں خواب آور تھا۔ ایک لمحہ کے لئے شا کو خیال گذرا کہ وہ شاید خواب دیکھ رہا ہے۔ لیکن سامنے کچھ فاصلہ پر رکھی ہوئی توپ اُسے یقین دلا رہی تھی کہ وہ سچ مچ کان سن کے آگے اپنے دونوں ہمسفر ساتھیوں کی جان بچانے کی خاطر اپنے آپ کو قاتل کی حیثیت میں پیش کر رہا ہے۔

"خوب! کوئی کرے گناہ کسی پر عذاب ہو" اس نے خیال کیا۔ میں اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی کیوں ماروں؟ قاتل تو بحفاظت تمام وطن کی راہ لے اور ناکردہ گنہگار چینی مظالم اور اذیتوں کا نشانہ بنے۔ آخر یہ بھی کوئی انصاف ہے؟ وہ چلتے چلتے رک گیا اور سوچنے لگا۔ ایک دفعہ اس کے جی میں آئی کہ فوراً بھاگ کھڑا ہو مگر اس سے فائدہ؟ کان سن کے سواروں سے وہ کبھی نہیں بچ سکتا۔ اور خوش قسمتی سے اگر بچ بھی جائے تو توپ —— اس نے پلٹ کر مندر کی طرف حسرت سے دیکھا۔ اس میں دو آدمی تھے۔

"وہ کبھی اقرار نہ کرینگے" اس نے سوچا "بزدل، ڈرپوک کہیں کے! چوری کرنے کے بعد چور ڈرپوک ہو جاتا ہے اور قتل کے بعد قاتل بودا۔ کم از کم مجھے تو دلیری سے کام لینا چاہیئے —— اس کے علاوہ میکسوڈ کی مفلس بیوی اور معصوم بچے۔ برلیٹ کی ضعیف ماں —— میں دنیا میں اکیلا ہوں۔ میرے مرنے کے کسی کو صدمہ نہ ہوگا ......"

اب وہ استقلال اور تیزی سے قدم اُٹھانے لگا۔ یہاں تک کہ اس کو تھوڑے فاصلہ پر کچھ سپاہی نظر آئے۔ کان سن ان کے بیچ میں زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے لڑکے کی لاش تھی۔ جوں ہی شا قریب پہنچا سپاہی آگے بڑھے اور اس کو اپنی حراست میں لے لیا۔ ہاتھ پیچھے باندھ دئیے۔ اور کان سن کے حضور میں پیش کیا۔ شا کی آنکھوں سے اطمینان ظاہر تھا۔ اور چہرہ سے متانت اور استقلال ٹپک رہا تھا۔

کان سن کی نظریں شا کے چہرہ پر گڑ گئیں "تو کہئے آپ ہی نے میرے چہیتے بچے کو قتل کیا؟" اس نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

شا نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے سپاہیوں نے آپ کا تعاقب کیا۔ جی ہاں انہوں نے آپ کا تعاقب کیا۔ یہ ان کا کمینہ پن اور بزدلی تھی۔ میں نے اپنے بعض سپاہیوں کو سخت سزا بھی دی۔ لیکن کہئے ایک معصوم لڑکے کو قتل کرنے سے زیادہ کوئی بزدل حرکت ہوسکتی ہے؟"

شا خاموش تھا۔

کان سن نے چند سپاہیوں کو چینی زبان میں کچھ کہا۔ وہ توپ کی طرف گئے۔ شا نے اپنی بندھی ہوئی مٹھیاں کس لیں۔ اور دانت مضبوطی سے بھینچ لئے اس کے قلب کی حرکت میں اضافہ ہوگیا۔ اس کے پاؤں ضبط کے باوجود قدرے کانپنے لگے۔

"یہ ایک بزدل کا کام ہے" کان سن نے مسکراتے ہوئے کہا جی ہاں جس نے میرے چہیتے بچے کو قتل کیا وہ پرلے درجہ کا بزدل ہے۔ میرے بال سفید ہو چکے ہیں۔ مجھے اپنے تجربہ پر بھروسہ ہے ——— تمہاری آنکھوں سے بزدلی نہیں ٹپکتی۔ تمہارے چہرہ سے کمینہ پن مترشح نہیں۔ قاتل بزدل ہے۔ اور قاتل کبھی اس طرح میرے پاس نہ آتا ——— بھلا قسم تو کھاؤ کہ تمہیں نے میرے چہیتے بچے کو قتل کیا ہے؟"

وہ تھوڑی دیر ٹھہرا۔ مگر جواب نہ پاکر پھر گویا ہوا "تم خاموش ہو ——— مجھے یقین ہے کہ تم اپنے دوستوں کی جان بچانے کی خاطر یہاں آئے ہو۔ تمہارے دوست دونوں کے دونوں بزدل ہیں۔ اور ان میں سے ایک میرے چہیتے بچے کا قاتل ہے۔ تم نے خواہ مخواہ ان بزدلوں کی خاطر قربانی کی۔ قاتل اپنے کیفر کردار کو پہونچیگا"

سپاہی توپ کا منہ مندر کی طرف پھیر رہے تھے۔

شا نے حیران و پریشان ہوکر پوچھا "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"اپنے بچے کے خون کا بدلہ لے رہا ہوں" کان سن نے مسکرا کر کہا۔ "اور آپ کو میرے آدمی بحفاظت وطن پہونچادیں گے"

معاً ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ اور مندر سے دھوئیں کے بادل اُٹھنے لگے۔ فقط۔

(سید بادشاہ حسن)

کائنات میں میرا حصہ!

(بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو کی ایک فکر رس نظم)

(ظفر قریشی دہلوی)

دشت و چمن کو بہار کی رنگ و بو ——— مبارک!
اپنے بازو کی قوت پر عقاب و مرغ کو ناز ——— مبارک!
ہرن کو اپنی شوخیاں ——— مبارک!
قمری کو نوا سنجی ——— مبارک!
فاختہ کو رنگینیٔ پر ——— مبارک!
مگر میرے لئے میرے آقا! "محبت" کی سرشاریاں مبارک!

غواص بحر کے لئے دُرہائے یتیم ——— مبارک!
عروس نو کے لئے اپنے شوہر کا مطالعہ رخ ——— مبارک!
تصور پسند کے لئے جوانی کے خواب ہائے شیریں کی یاد ——— مبارک!
مگر میرے لئے میرے آقا! جوش "حق پرستی" ——— مبارک!
مصلحوں، رہنماؤں، اور "مذہب پیشہ" لوگوں کو اپنے حصول مقصد کی خوشی ——— مبارک!
بادشاہوں اور انکے حاشیہ نشینوں کو کامرانیاں ——— مبارک!
پس ماندگان کو سکون ابدی اور قوی تر لوگوں کو نشاط امیدیں ——— مبارک!
مگر میرے لئے میرے آقا! "نغمہ!" کی سرمستیاں مبارک

——— :o: ———

بے ثباتی!

از نغماتِ دردِ ادیب العصر جناب سید کاظم صاحب نشر لکھنوی!

نوجوانانِ چمن سوتے ہیں قبروں میں خموش
صحنِ آزادی کے طائرِ باغِ تن سے اُڑ گئے
بے ثباتی کا جہاں میں رنگ گل دکھلا گئے
آئے، کھولی آنکھ، جاگے کوئی دم، پھر سو گئے!
زندگانی بحرِ ہستی میں ہے اک نقشِ بر آب
بلبلے کی طرح اُبھرے بحرِ غم آلود میں
سیکڑوں ارماں بھرے دنیا سے اہلِ دل گئے
خسروانِ ملک جنکے کرّ و فر شاہانہ تھے
بستیوں میں بسنے والوں کا نشاں کچھ بھی نہیں
اس مسافر گاہ میں دم بھر ٹھکانے کے لئے

کل جو تھے گل پوش گلرو، آج ہیں وہ خاک پوش
اپنی اپنی بولیاں بولیں۔ چمن سے اُڑ گئے
دوپہر کو جو کھلے وہ شام کو مُرجھا گئے
خاک کے پتلے بنے مٹی سے، مٹی ہو گئے
ایک جھونکے سے ہوا کے ٹوٹ جاتا ہے حباب
ٹوٹ کر پھر مل گئے دریائے لامحدود میں
خاک سے پیدا ہوئے اور خاک ہی میں مل گئے
یوں ہوئے ناپید جیسے وہ کبھی پیدا نہ تھے
ڈھیر ہے اک ہڈیوں کا اور وہاں کچھ بھی نہیں
سب مسافر آئے ہیں اک روز جانے کے لئے

پتہ پتہ کی زباں پر بے ثباتی کی پکار
ساری دنیا کو فنا ہے غیر ذاتِ کردگار

شاعری اور نعت و مناقب

(از جناب ابوظفر طالب انصاری گنوری منشی فاضل)

شاعری کی فطرت ذوق سخن آرائی کی طرف جب ہمہ تن مائل ہو جاتی ہے تو اس کے سامنے علاوہ مختلف مناظر کے مذاق طبعی کی مناسبت سے دو خاص صورتیں جلوہ برانداز ہوتی ہیں ایک جذبات نفسانی دوسری کیفیات روحانی اگر اس کا ذوق طبیعت نفسیات عشق و محبت کے ساتھ شغف رکھتا ہے تو حسن مجازی کی گوناگوں دلفریبیاں اس کے انداز تکلم سے نمایاں ہونگی اور اسیطرح اگر اس کی فطرت سلیم عشق حقیقی کی طرف مائل ہے تو اس کے حسن کلام میں روحانیت کی بوقلموں مرصع کاریاں نظر آئیں گی۔ شاعر خدائے سخن۔ خلاق معانی۔ مصور جذبات۔ ترجمانِ حقیقت۔ غرض مختلف اسماء والقاب سے پکارا جاتا ہے۔ ظاہربین نگاہیں خواہ کیسی ہی تنگ نظری کو کام میں لائیں۔ لیکن حقیقت آشنا اہلِ نظر وثوق کامل کے ساتھ یہ کہنے کے لئے آمادہ ہوجائیں گے کہ شاعر کے لئے یہ القاب خلاف واقعات نہیں ہیں بلکہ اس نے اپنے کمالات کی نمائش کے بعد ان خطابات کو حاصل کیا ہے۔

حسن مجاز پر میلانِ طبیعت۔ طبیعتِ انسان کا فطری فرض ہے جس سے انکار نہیں ہوسکتا یہی سبب ہے کہ دنیائے شاعری کی تمام وکمال زیب وزینت اسی پر موقوف ہے آج بھی خیالات وافکار کی تمام تر توجہ اسی طرف ہے۔ عشق حقیقی اگرچہ مدارِ تخلیق انسانی ہے مگر

ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را ندہند

خال خال اس طرف رسائی ہوتی ہے۔ شاعر کیفیات باطن کی جانب مائل ہوجانے پر ضرور قادر ہے مگر جب تک اس کا ضمیر حقائق باطنی کا تجلی گاہ نہ ہوجائے اور اس کو روحانیت سے صحیح نسبت پیدا نہ ہوجائے اس وقت تک اس سعادت سے لطف اندوز ہونا اس کی قدرت سے خارج ہے۔

مجاز و حقیقت کا اشتراک شاعرانہ نقطہ نظر سے بھی کسیطرح صحیح نہیں۔ مجاز میں تخئیل تمام شروط و قیود سے آزاد ایک عالم وسیع کی سیر میں مصروف ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے حقیقت کے آداب احترام مخصوص ہیں یہاں ہر ہر قدم پر لغزش کا اندیشہ ہے تمام بلند پروازیاں ممنوع ہیں جدت طرازیاں۔ مضامین آفرینیاں حدودِ ادب سے باہر قدم نہیں اُٹھاسکتیں۔

یہی سبب ہے کہ شاعری کی اکثریت نے ان حدود میں داخل ہونا اپنے مطمح نظر سے خارج سمجھا بعض شعراء جو اس جانب اُن کو فقدان مذاق مالیہ کے سبب کوئی شہرت خاص حاصل نہ ہوئی۔

حقیقت جس کو ہم حقائق الہیہ کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں وہ عامیانہ مذاق سے بالکل جدا ایک روحانی و اعتقادی شاعری ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں منزل حقیقی تک رسائی کے لئے جس طرح فنافی الشیخ۔ فنافی الرسول اور فنافی اللہ تین درجے ہیں اسی طرح اصناف سخن میں حمد و نعت و مناقب عشق حقیقی کے اظہار کے لئے تین صنفیں ہیں۔

حمد ذات باری کے تشکر و امتنان کے لئے مخصوص ہے مسلم شعراء نے ہر دور میں اپنا فرض اولین بھی رکھا کہ دیوان کی ابتدا حمد سے کی۔

نعت سرکار رسالت روحی لہ الفداہ کے مدح و محاسن کا نام ہے۔ غایت جوشِ ایمانی کا تقاضا ہے کہ ہر مسلمان شاعر بارگاہِ رسالت میں خصوصی شان نیاز کے ساتھ تمام لوازم آداب کو ملحوظ رکھتے

ہوئے جذبات عقیدت کا اظہار کرے چنانچہ بیشتر شعرا حمد کے بعد حصول برکت و سعادت کے لئے کم از کم ایک غزل نعت کی ضرور لکھتے ہیں۔

مناقب ۔ اہلبیت و اصحاب نبوی و دیگر اکابر اسلام کی ثنا و صفت کا نام ہے۔ مشرب جس طبقہ اور جس گروہ کے ساتھ نسبت قوی رکھتا ہے ان کے اکابر کے ساتھ اپنے حسن ارادت کا اظہار کرتا ہے حضرات اہل تسنن نے اہل بیت و اصحاب اور حضرات تشیع نے اہل بیت کے مناقب کو جزو دیوان اور طرہ امتیاز کلام بنایا اول الذکر شعرائے کے یہاں مناقب کا کوئی التزام نہیں کیا گیا بخلاف اسکے ثانی الذکر حضرات نے مراثی کے ذریعہ سے اس صنف خاص کو معراج کمال تک پہونچا دیا۔ آج ہماری تنقیدی نگاہیں ادبی حیثیت سے ایک صاحب فن کے کلام میں سے گہرہائے آبدار چن رہی ہیں۔

تاج مضامین

حضرت مولانا ضیاء القادری البدایونی کے رشحات مناقب کا مجموعہ ہے مشرب سلسلہ قادریہ سے زبردست نسبت رکھنے والے ہیں کلام میں صرف نسبت ہی کا اظہار نہیں ہے بلکہ جنون عشق کی ایک لہر ہے جو سارے دیوان میں موج خیز معلوم ہوتی ہے آپ کے پیش نگاہ اپنے شیخ طریقت کا برزخ ہے جو ہمہ اوقات آئینہ نظر بنا ہوا ہے تمام اکابر اسلام کا جمال آپ صرف اسی آئینہ حق نما میں کس طرح دیکھتے ہیں کہ

نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد

برزخ شیخ کو آن واحد کیلئے بھی دور رکھنا گوارا نہیں باوجود اس توغل اور والہانہ بیخودی کہیں دامن ادب ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ مناقب میں گہرہائے آبدار کی فراوانی ہے مگر قلزم نعت کی آبیاری کے سوا ممکن نہیں کہ تلاش سے بھی کوئی شعر ایسا ملے جو نعت کی حد تک پہنچ سکے۔ دیوان کی خصوصیات۔ لطف سخن۔ رنگ غزل آداب شریعت۔ جذبات عقیدت پیش نظر کرتی ہیں۔

لطف سخن

شعر اگر پیکر خیال ہے تو لطف سخن روح کے مترادف ہے۔ لطف سخن کے ساتھ شعر ایک روحانیت کا زندہ مجسمہ ہو جاتا ہے اور صاحب فن یا اہل نظر ایسے شعر کی طرف بے ساختہ متوجہ ہو جاتے ہیں۔ انسانی ہیولی اگر حواس خمسہ سے بے نیاز ہو تو جس طرح وہ ایک بیکار وجود سمجھا جائے گا اسی طرح شعر کے ارکان خمسہ سلاست زبان۔ نزاکت تخیل، بندش الفاظ ندرت مضمون۔ حسن ادا اس کے محاسن میں جان ڈال دیتے ہیں۔

تاج مضامین اگرچہ بہمہ وجوہ عقیدت و ارادت کا مرقع ہے لیکن لطف سخن اس کے مصنف کی ایک امتیازی شان کو از اول تا آخر نمایاں کرتا ہے۔ چند اشعار نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں جس سے ناظرین اندازہ کر سکیں گے کہ حضرت ضیاء القادری نے اس محدود منزل کو کس طرح طے کیا ہے۔

بہت واضح ہے یہ شان نزول آیۃ الکرسی
ہے زینہ عرش اعظم باب ایوان محمد کا

ایک ذی علم واعظ جب ممبر پر کھڑے ہو کر کسی آیت قرآنی کی تفسیر کرتا ہے تو اس کے سیاق و سباق کو کبھی مجمل اور کبھی مفصل بیان کرتا ہے۔ شعر میں نزول و سعود کی وضاحت عرش اعظم کو زینہ قرار دے کر کی گئی ہے۔ شعر مضمون کی وسعت کو اجمال و اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہوئے ایک واعظ کی چلتی ہوئی زبان معلوم ہوتا ہے ؎

جھکا جاتا ہے پلہ نیکیوں کا بر سر میزاں
ملائک تک رہے ہیں منہ غلامان محمد کا

واقعہ نگاری کے لئے جو حسن ادا قلم میں ہونا چاہئے وہ شعر سے ظاہر ہے۔ میزان محشر پر امت شفیع محشر کے اعمال تولے جا رہے ہیں شان رحمت کی دستگیری سے غلاموں کی نیکیوں کا پلہ خود بھاری ہو جاتا ہے اس پر فرشتوں کا تعجب سے تکنا ایک واقعہ ہے۔ جس کے انداز بیان میں مترادف الفاظ کا استعمال کہنہ مشقی

کی دلیل ہے

غم دوری سے ہوئی ناکامیاں اپنی ترقی پر   ہجوم یاس سے شیرازۂ دل منتشر دیکھا
مری فرد عمل جب حشر میں کھولی ملائک نے   سرنامہ رقم عِندَ مَلیکٍ مقتدر دیکھا

مناقب نویسی یہ انداز بیاں کمال زباندانی ہے سلاست زبان اور بندش اشعار دونوں اشعار میں نمایاں ہیں۔ مفارقت شیخ کی گرانباری ناکامیوں کی ترقی سے ہجوم یاس کا پیدا ہونا جس نتیجہ پر نگاہ پہنچاتا ہے وہ کس لطیف پیرایہ میں دکھایا گیا ہے۔ یا یہ کہئے کہ انتشار قلب کے وجوہات کو کس برجستگی سے ادا کیا ہے۔ دیوان میں مقتدر کا لفظ بکثرت آیا ہے ضیاء صاحب کے شیخ طریقت کا اسم گرامی حضرت مولانا عبد المقتدر صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہے اپنی نسبت کا اظہار کس لطف سے کرتے ہیں کہ فرد عمل کا سرنامہ بھی قرآن معظم کی اس آیت سے دکھایا ہے جس میں آپ کا اسم صفت مقتدر موجود ہے

ہوگئی مائل خدائی دیکھکر ماتھے کا داغ   وہ نشان سجدہ گویا نقش تھا تسخیر کا
بنایا اپنے منظور نظر کو تونے اپنا سا   تری صورت کو دیکھا جب آئینہ نظر آیا
جلوہ بے حجاب سے درد جگر چمک گیا   تابش حسن نے سوا سوز و گداز کر دیا
نظارہ جو نظر ہے زمیں بوس آستاں   ہے عرش پر دماغ ہماری امید کا

اشعار بالا میں لطف سخن کے ذوق آشنا شاعر کے حسن تکلم کو بغور دیکھکر کس قدر دلکش طرز ادا ہے۔ ماتھے پر جو نشان سجدہ ہے اس کو نقش تسخیر ثابت کرنے کے لئے مخلوق کو داغ جبیں کا مائل بنانا ہے دوسرے شعر میں کنایہ صوری و معنوی ہے مولانا عبد الماجد صاحب قادری جو ہندوستان کے مایہ ناز بزرگ ہیں منظور تخلص فرماتے ہیں اور ضیا صاحب کے شیخ طریقت کے فرزند معنوی بھی ہیں شیخ نے اپنے فیض صورت سے اپنے منظور نظر کو یعنی ــــ مولانا عبد الماجد صاحب کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ اور بالکل اپنے صفات کمال کا آئینہ بنا دیا ہے اب گویا ان کو دیکھکر شیخ کی صورت پیش نظر ہو جاتی ہے۔

تیسرے شعر میں جلوہ بے حجاب کا تلازم قابل داد ہے۔ جلوہ جب بے پردہ ہوا درد جگر بھی چمکا۔ حسن کی تابش بھی بڑھی جس نے درد کے سوز و گداز کو بھی سوا کر دیا ہے۔

چوتھے شعر میں نظارہ جو نظر کتنی برجستہ ترکیب لفظی ہے۔ شیخ کی آستاں بوسی مرید کے رفعت مراتب کو اس قدر بلند کرتی ہے کہ اس کی تمناؤں کا دماغ عرش تک پہنچتا ہے

ذیل کے اشعار بلا کسی تشریح کے خود لطف سخن کی پوری تشریح کرتے ہیں ناظرین بطور خود لطف اندوز ہوں گے

صبح سے ہوتی ہے دم جھم صہبائے نور   نور کے تڑکے کھلا ہے قادری میخانہ آج
ہیں جو بزم مست میں ساقی نشۂ گیسو دراز   قسمت میں ملتی ہے زنجیر در میخانہ آج
ہے عینیت میں جدائی خلاف شان کرم   تم عین حق ہو رہو آنکھ میں نظر کی طرح
وہ حسن وہ سج دھج ہے کہ ہیں بزم جہاں میں   محبوب خدا حضرت سلطان مشائخ
بڑھ گئے شوق دید کے شام وصال جھوم کر   عارض دل نواز پر زلف دراز دیکھکر
پایا مقام قرب الٰہی کا یہ سراغ   ہے جادۂ مراد تری رہگذر کے پاس
غالب ہے رزم میں اسد اللہ کا جلال   میدان میں کھیلتی ہے عدو کا شکار تیغ
ہے اشک ندامت سر سے اونچا ہو گیا   کیوں رو رہے آب رواں کی سر پہ چادر ہو
وہ بے نشاں ہوں کہ ہر ہست و نیست سے ہوں جدا   ازل سے خود مری ہستی مرے سراغ میں ہے

رنگ تغزل

ہماری شاعری میں رنگ تغزل ہی ایک مابہ الامتیاز شے ہے۔ شہرت عامہ کے لئے حقیقتاً حاصل شاعری اسی کو سمجھا گیا ہے۔ تمام اصناف سخن میں جو عام گرویدگی اور قوت جاذبہ غزل کو حاصل ہے وہ دیگر اقسام نظم کو میسر نہیں۔

جناب ضیا کے کلام میں کوئی غزل رنگینی و شوخی ادا سے بے نیاز نہیں ہے صرف چند غزلوں کے دو چار شعر میں اس عنوان کے تحت میں دکھانا چاہتا ہوں۔

ملتے ہی آنکھ چل گئیں عشق کی پھلجھڑیاں   نیچی نظر حضور کی کر گئی کام تیر کا

شعر میں عاشقانہ تخیل کو صرف لفظ حضور نے منقبت بنا دیا ہے یہی کمال مشق سخن ہے۔

رنگ وحدت میں ہر دامان نظر ڈوبا ہوا   رنگ ہے کیا صبغۃ اللہی تری تصویر کا

وہی شوخی وہی رنگینی جو عاشقانہ کلام میں ہوتی ہے۔ اس شعر میں بھی موجود ہے۔

شہابی سرخ ڈورے ہیں مے وحدت کے آنکھوں میں   سرور افزا عجب نشہ ہے تیری خوش نگاہی کا

حضرت سلطان جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بدایونی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے سلسلے کے ایک بزرگ ہیں اس نسبت سے شہابی سرخ ڈورے کا

جمد استعارہ کے کے اس شعر میں منقبت کا کیف پیدا گیا ہے ورنہ بادی النظر میں رنگ تغزل کی شوخی موجود ہے۔

منبع بحر ظفر ہر موج آب ذوالفقار   فتح و نصرت آ منہ وار ہوئے بوتراب

شوکت الفاظ کے ساتھ شانِ تغزل کا کتنا خوشنما منظر سامنے کر دیا گیا ہے

جی میں آتا ہے یہ رہ رہ کر خیال   دل ہی کو لوں میں تمہاری صورت
رکھ دیا سامنے محبوب کے دل   ہمتے شیشہ میں اتاری صورت

دونوں شعر رنگینیٔ ادا میں ہجوم آرزو اور کمال مصوری کی نظر فریب تصویر معلوم ہوتے ہیں۔

نہیں ہے پھولوں کی چادر مزار اطہر پر   عروس حسن کے سر پر ردائے حور ہے آج
شاخ گل مراد ہیں شجرہ کی ڈالیاں   اس قادری چمن کا ہے کیا رنگ دلپسند
ہے تصویر شہید کربلا کا پیرہن کاغذ   نظر آتا ہے رنگ خونِ ناحق سے چمن کاغذ
شہید تشنہ لب کا قتل تاریخی شہادت ہے   اس افسانہ کی سرخی سے بنا اصل میں کاغذ
اٹھو نہ سکی جبینِ شوق تقاضائے فنائیت کا ذوق   سجدے مچلکے رہ گئے کیف نماز دیکھ کر

ہر ہر شعر رنگ تغزل میں ڈوبا ہوا ہے اور ہر پڑھنے اور سننے والے کے لئے سرور بخش ہے۔

آداب شریعت و جذبات عقیدت

تاج مضامین کی خصوصیات میں نئے نئے عنوان سے عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔ افراط و تفریط لوازمہ شاعری کہے جاتے ہیں شاعر نے اپنے جذبات کی رو میں بزرگانِ دین کے احترام کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے مراتب علیہ کی رونمائی کی ہے مثال کے طور پر اشعار ذیل قابل ملاحظہ ہیں

بعد حضرت کے جو ہوتا کوئی دنیا میں نبی
اے ضیا شانِ نبوت بھی تھی شایان عمر
تجلیات الٰہی کے آفتاب ہو تم
ہے تم میں جلوۂ نورِ خدا غریب نواز

شعر اوّل حدیث کا صحیح ترجمہ آداب شریعت کا نمایاں پہلو لئے ہوئے کیا گیا ہے اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی منزلت عظیمہ کا اظہار ہے دوسرے شعر میں بھی خواجہ غریب نواز رح اجمیری کے کمال مرتبت کو کس خوش اسلوبی سے دکھایا گیا ہے

سب سے تصدیق رسالت پہلے
مظہر صدق مقال صدیق
مظہر مجموعہ آیات من آیات اللہ
صاحب حجت و برہان امام اعظم

پہلے شعر میں کمال عظمت کے ساتھ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کا سچا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اور دوسرے شعر میں حضرت امام اعظم رح کے فضائل کو باحترام شوخی کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔

ہے آئینۂ جلوۂ لن ترانی   تمہارا رخ حق نما غوث اعظم
منتشر ہو گئے سب مصحفِ ناطق کے ورق   پارہ پارہ ہوئے سیپارہ قرآن حسین

حدود شرع سے قلم باہر نہیں جاتا۔ منقبت نگاری کا کمال یہ ہے کہ توصیف و ثنا میں مرتبۂ علیہ کی انتہائی بلندی کا اظہار ہوتا ہے مگر قادر الکلامی با عظمت شریعت ذرا لغزش نہیں آنے دیتی جذبات عقیدت کے اظہار میں کس قدر خود رفتگی اور عاشقانہ نیاز مندی ہے کہ ایک شعر کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

مے مقدر میری عرض سن محمد تو یہ تکریم ہے دھن   کہ ضیا بھی تو ہم آشنا رہ تاجدار حجاز میں
ضیا سے بس ہراں کو تو کیا تعجب ہے   کہ خاص انس تھا محمود کو ایاز کے ساتھ
تنگ کر دیکھو نہ اتنا دل ناشاد مجھے   لوگ کہتے ہیں غلام شہ بغداد مجھے
تصور میں شبیہ مقتدر یہ مجھ سے کہتی ہے   مجھے دیکھو کہ میں قدرت نمائے غوث اعظم ہوں
مدد ہیں پہ آزار میں غربت میں تنہا ہو   مے خواجہ مدد کرنا کہ دشمن زیر ہو جائے
بڑھائے دست بیعت جو مریدی لا تخف کہہ کر   میں اس زور ید اللہی کے ایسے پنجۂ محکم

تاج مضامین کے مندرجہ بالا اشعار تمام دیوان کی روح رواں ہیں اور اس کا وجود ہر مسلمان کے لئے حقیقت میں سرمایۂ نجات ہے۔ آخر میں ہم اعتراف کے طور پر اس کے مصنف حضرت ضیاء القادری صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ آپ نے اسقدر تنگ وادی کو نہایت پامردی کے ساتھ طے کیا ہے ہماری یہ تنقید بطور ہدیہ تبریک ہے جو صرف نقادانِ سخن کی دلبس

پاداشِ عمل

طبعزاد افسانہ

از جناب چودھری محمد طفیل صاحب نیّر بی اے بی لٹ

(۱)

نواب اسد اللہ خاں اس لئے نواب نہیں تھے کہ یہ اُن کا آبائی لقب تھا بلکہ اس لئے کہ چند مطلب پرست حاشیہ نشینوں نے اُن کو "نواب صاحب" کا خطاب دے کر اپنا اُلو سیدھا کر رکھا تھا۔ اور وہ بھی پھولے نہیں سماتے تھے۔ ذرا کسی نے "نواب صاحب" کہہ کر پکارا تو آپ کی باچھیں کھل گئیں۔ جب کبھی شام کے وقت چاوڑی بازار کی سیر کے لئے نکلے تو درجنوں مفت خورے، جلو میں ہو لئے جو ہر ہر قدم پر آنکھیں بچھاتے تھے۔

اسد اللہ خاں کوئی خاندانی متمول آدمی نہیں تھے۔ مگر دس ایک لاکھ کی جائداد نواب دولت یار خاں کی ہنگامی موت سے جو اُن کے قرابت دار تھے اتفاقیہ ان کے حصے میں آئی تھی۔ عمر بھی بائیس سال کی تھی۔ والدین کا سایہ بچپنے ہی میں سر سے اُٹھ چکا تھا اور مفت خورے دوست بھی ضرورت سے زیادہ موجود تھے۔ اس لئے اگر ایسے حالات میں اُن کی بے اعتدالیاں حد سے متجاوز تھیں تو کوئی حیرانی کی بات نہ تھی۔ اُن کا دیوان خانہ اچھا خاصہ میخانہ تھا جہاں ہر قسم کی شراب کی درجنوں بوتلیں ہمیشہ موجود رہتی تھیں محفل احباب ہر وقت گرم رہتی تھی جہاں سوائے شراب اور رنڈیوں کے تیسرا کوئی مضمون ہی نہیں ہوتا تھا جسکا مذکور ہو۔ ہر راہگیر کو جسکا ادھر سے گذر ہو یا تو بوتلوں کے کاگ اُڑنے کی آواز آتی تھی یا رقص و سرود کی سریلی جھنکار اور طبلے کی تھاپ سنائی دیتی تھی۔ وہاں کہ اگر دھواں اُٹھتا تھا تو دود کباب تھا بو آتی تھی تو بوئے شراب تھی اور آواز آتی تھی تو نغمۂ رباب تھا۔

چاوڑی بھر میں کوئی رنڈی نہیں تھی جس کا ایک دفعہ گانا نواب اسد اللہ خاں نے نہ سنا ہو دہلی بھر میں ان کی مستی اور عیش پرستی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ان کا دسترخوان خوانِ کرم تھا۔ آپ جس وقت کھانے پر بیٹھتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی حویلی میں کوئی برات اُتری ہوئی ہے اور فراشخانے میں ہر وقت رونق رہتی تھی بالخصوص وزیرو۔ بھاندو۔ جمن۔ ننھو۔ چھیدا۔ اہلم۔ کلن خاں اور امراؤ سنگھ وغیرہ تو اس طرح منڈلاتے رہتے تھے کہ گویا کسی برات کے منتظم ہیں۔

نواب صاحب کی بیوی صابرہ بیگم اسم با مسمّٰی تھی۔ گو شوہر کی عادتوں سے بخوبی واقف تھی لیکن سچی مسلمان عورت تھی اور ہر وقت نواب صاحب کی دلجوئی کرتی تھی۔ ہر چند باسلیقہ ہوشیار اور سگھڑ تھی تاہم اپنے خاوند کی حرکتوں سے بہت جُز بُز تھی اور ہر وقت اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی۔

(۲)

جون کا آخری ہفتہ تھا گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ موسم نہایت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی بوندیں بھی پڑ رہی تھیں۔ صبح صبح نواب صاحب کو "باغ سیر" کا شوق چرایا۔ بس پھر کیا تھا حکم کی دیر تھی اور کشمیری دروازے کے باہر باغ کے ایک تختے میں شامیانے لگ گئے شراب کباب اور رباب کے تمام سامان مہیا ہو گئے۔ دس بجے کے قریب نواب صاحب بھی مع حشم و

قدم پہنچ گئے۔ اور شامیانے میں قدم رکھتے ہی آپ نے یہ شعر پڑھا

ساقیا! آکہ مئے روح فزا بھی آئی
ابر کعبہ بھی اٹھا کالی گھٹا بھی آئی (نیّر)

پھر ہاتھ میں ساغر لے کر کہا

دور چلے دور چلے دور ساقیا

بھوندو خاں نے فوراً آگے بڑھ کر مصرعہ ثانی پڑھا

اور چلے اور چلے اور ساقیا

وزیرو نے فضا کی طرف اشارہ کر کے یہ شعر گایا ؎

یہ ہوائیں یہ گھٹائیں اور یہ کیفیتیں
کون رہ سکتا ہے نیّر ایسے ساماں دیکھ کر

بس پھر کیا تھا نواب صاحب نے ساغروں پر ساغر چڑھانے شروع کر دیئے اور مستی میں آکر بار بار یہ شعر پڑھنے لگے۔

ہر شب شب برات ہے ہر روز روز عید
سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کے

یاران شاطر نے مرحبا مرحبا کے نعرے بلند کئے۔ اور حواس باختہ کو اور اُلّو بنانے

وزیرو۔ کیوں نہ ہو نواب صاحب جو ٹھہرے

نتھو۔ خاندانی آدمی ہیں کوئی مفلس قلاش تھوڑے ہیں۔

کلن۔ خدا رکھے میرے سرکار اشرفیوں میں کھیلتے ہیں طبیعت ہو تو ایسی ہو۔ جیسی شراب یہ پیتے ہیں۔ بڑے بڑے رئیسوں کو عمر بھر میں ایک آدھ دفعہ بھی نصیب نہیں ہوتی۔

چمن۔ آدمی کی قدر بھی خوب کرتے ہیں اور ہماری وفاداری کو بھی جانتے ہیں۔

بھوندو (شراب کے نشے میں) تم سب کچھ خوشامدی ہو۔ بلکہ میں کہوں گا کہ نواب صاحب دولت میں قارون اور سخاوت میں حاتم ہیں

امراؤ سنگھ۔ خوب کہا

پھیرو رام۔ بالکل بجا کہا۔

بھوندو ؎ میں محو شور کشر ہوں مگر تو خموش ہے
ساقی اک اور جام ابھی مجھکو ہوش ہے (نیّر)

نواب صاحب ع این قدر مستم کہ از چشم شراب آید بروں

پھیرو رام ع وز دل پر حسرتم دود کباب آید بروں

نواب صاحب۔ دوستو پیو اور خوب پیو۔ دل میں کوئی حسرت باقی نہ رہ جائے۔

کلن۔ ضرور۔ ضرور۔

"کلن" یہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

امراؤ سنگھ (نشے کی لے میں) نواب صاحب وہ آپ کے دوست اختر کیا ہوئے

نواب صاحب (ایک سرد آہ بھر کر) افسوس وہ ہم سے جدا ہو گئے۔

پھیرو رام۔ بدنصیب تھے۔ وہ تو تنگدستی کے یار تھے۔

نتھو چلو جی خس کم جہاں پاک۔ کمبخت ہمارے عیش میں خلل انداز ہوتا۔

نواب صاحب۔ ان کا ذکر چھوڑو

شب وصال ہے روشن چراغ گل کر دو
خوشی کی بات میں کیا کام جلنے والوں کا

عیش کے وقت ایسے زاہد خشک کا ذکر کرنا کیا ضرور۔ ابھی چھوڑو بھی (شمشاد رقاصہ کی طرف اشارہ کر کے) ہاں تو کوئی اچھی سی غزل اڑ جائے۔

شمشاد نے ایک غزل گائی جس کا پہلا شعر تھا ؎

پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانے سے
جھک کے کچھ بات کہی شیشے نے پیمانے سے

نواب صاحب واہ واہ کرتے اٹھے تاکہ شمشاد سے بغلگیر ہو جائیں لیکن پاؤں لڑکھڑائے اور آپ "اگالدان" پر منہ کے بل گر پڑے ماتھے پر سخت چوٹ آئی۔ لہو نکلا۔ اور آپ کچھ کثرت شراب کی وجہ سے اور کچھ صدمے کے باعث بے ہوش ہو گئے۔ گرمی محفل سرد پڑ گئی سب کے نشے ہرن ہو گئے اور ان کو ہوش میں لانے کی فکر ہونے لگی۔

(۳)

"پیاری صابرہ! تم نے حق تیمارداری ادا کر دیا"

یہ الفاظ نواب اسد اللہ خاں نے مسہری پر لیٹے ہوئے اپنی بیوی صابرہ بیگم سے کچھ اس لجاجت آمیز لہجے میں کہے کہ نیک دل صابرہ کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے اور اس نے نگاہ نیچی کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ میں تو آپ کی کنیز ہوں۔ میرے والدین نے مجھے یہی تعلیم دی تھی کہ نیک عورت کے لئے خدا اور رسول صلعم کے بعد اپنے خاوند کی فرمانبرداری اور خدمتگذاری اس کا فرض ہے کہئے اب آپ کا مزاج کیسا ہے؟

نواب صاحب۔ بالکل ٹھیک ہے۔ زخم تو مندمل ہو ہی چکا ہے البتہ کمزوری باقی ہے وہ بھی آہستہ آہستہ رفع ہو جائے گی۔

صابرہ اگر ڈاکٹر اجازت دے تو غسل صحت فرما لیجئے جمعے کا دن ہے نہا دھو کر لباس بھی تبدیل کیجئے اور نماز جمعہ بھی شاہی مسجد میں ادا کیجئے۔

نواب صاحب نماز کا ذکر سنکر بہت گھبرائے اور نہ پڑھنے کے لئے پیشانی کے زخم کا عذرِ لنگ پیش کیا ہی چاہتے تھے کہ باہر سے خادمہ نے اختر حسین کی آمد کی اطلاع دی۔ بیگم صاحبہ مکان کے اندرونی حصے میں چلی گئیں اور ملاقاتی دوست تشریف لے آئے۔

نو وارد وہی صاحب تھے جو نواب صاحب کے آڑے میں کام آتے تھے اور جب سے ان حضرت کو دولت ملی اور شراب کی چاٹ لگی غریب اختر حسین کبھی تشریف نہیں لائے۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو ان کے چہرے سے غم و غصہ کے آثار نمایاں تھے۔ آپ نے آتے ہی نواب صاحب سے کیفیت حال دریافت کی اور دو چار باتیں کر کے چلنے کی اجازت چاہی۔

نواب صاحب۔ حضرت! آپ آئے بھی اور چل بھی دئے۔

اختر حسین گو آپ سے ملنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن ایسے وقت میں عیادت کو نہ آنا مروّت سے بعید تھا۔

نواب صاحب۔ میں اپنے کئے پر بہت نادم ہوں۔ نہ صرف معافی چاہتا ہوں بلکہ آپ کو آئندہ کے لئے یقین دلاتا ہوں کہ ایسی باتیں پھر سننے میں نہیں آئیں گی۔

اختر حسین۔ آپ اور ندامت؟ توبہ اور پھر وہ بھی میکشوں کی جنکی نیت بادل کے ساتھ ہی بدل جاتی ہے۔

نواب صاحب بس آپ مجھے زیادہ شرمندہ نہ کیجئے

اختر حسین۔ مجھے کیا ضرورت ہے وہ تو کل ایک دوست نے ذکر کیا تھا کہ آپ بیمار ہیں اس لئے چلا آیا۔ لیکن میں نے آپ سے کوئی ایسی بات نہیں کی جو آپ کی تکلیف کا باعث ہو۔

نواب صاحب (نہایت لجاجت آمیز لہجے میں) خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔ خدا سو گناہ معاف کرتا ہے آپ ایک معاف کیجئے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ سا وفادار دوست مجھے ڈھونڈے سے بھی نہیں ملیگا۔ اگر آپ ناراض ہوئے تو میری زندگی حرام ہو جائے گی۔ میں سچے دل سے توبہ کرتا ہوں۔

اختر حسین گو مجھے آپ کی توبہ کا یقین نہیں۔ لیکن اگر آپ منہ کی کھا کر بھی شراب سے توبہ نہ کریں تو آپ جیسا عقل کا دشمن کوئی نہیں ہوگا (اٹھتے ہوئے) اچھا میں تو چلتا ہوں خدا آپ کو اس عہد پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرما دے۔

(۴)

نواب صاحب کا غسل صحت کیا ہوا گویا توبہ بھی ساتھ ہی بہ گئی۔ ہمپیالہ احباب پھر آموجود ہوئے۔ صحتیابی کی خوشی میں مبارکبادیں دی گئیں جن کو شرفِ قبولیت بخشنے کے لئے نواب صاحب نے بڑی بھاری اور پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ فقیروں یتیموں مسکینوں اور ناداروں میں خیراتیں تقسیم ہوئیں اور صدقے اتارے گئے۔ پھر خاص احباب کی دعوتِ خاص ہوئی۔ جس میں نہایت قیمتی اور اعلیٰ قسم کی شرابیں رائے سینا کی انگریزی دکانوں سے مہیا کیں۔ ایک رقاصہ نے یہ اشعار گا کر نواب صاحب کا "جامِ صحت" نوش کیا۔

میری ٹوٹی ہوئی توبہ کے ٹکڑے کوئی لادے درِ پیرِ مغاں سے
کہ ان کو جوڑ کر پھر توڑ ڈالوں میں اک جامِ شرابِ ارغواں سے

یہ اشعار نواب صاحب کے سمندِ شراب نوشی پر تازیانے کا کام کر گئے فتنہ ہائے خوابیدہ جاگ اٹھے اور آپ نے پھر چند دن کے روزہ کے بعد بے رمضان کی عید منائی مگر ذرا اعتدال سے پی۔ وغیرہ وغیرہ۔

بھوندو، پھیرو وغیرہم سب شریک جلسہ تھے۔ وزیرو تو مختار کل تھا جو چاہتا تھا کرتا تھا اسی لئے "یارلوگ" اس کی خوشامد کچھ زیادہ ہی کیا کرتے تھے۔

محفل گرم تھی دور چل رہا تھا اور گانا بھی ہو رہا تھا جبکہ کلن خاں نے بناوٹی حیرت و استعجاب کے انداز میں نواب صاحب کے دیوان خانے میں آ دھمکا۔ نواب صاحب نے دیکھتے ہی کہا

"کہو کلن خاں کہاں رہے"

کلن۔ حضور کیا بتاؤں۔ ایک مال دیکھا ہے جو بس حضور ہی کے لائق ہے۔

نواب صاحب (چونک کر) کیا یہ سچ ہے۔ کہاں ہے؟

اتنے میں کلن وزیرو کے کان میں کچھ کہہ چکا تھا جس نے فوراً جواب دیا۔

حضور مجھے بھی یاد آ گیا۔ کلن کہتا تو ٹھیک ہے مگر ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔

نواب صاحب۔ کیوں خدانخواستہ کہیں جان کا خطرہ ہے؟

وزیرو۔ توبہ حضور نے کیا فرمایا۔ اگر کوئی ایسی ہی بات ہوتی تو (سب کی طرف اشارہ کر کے) یہ غلام کب کے قربان ہو گئے ہوتے مگر یہاں تو (ہاتھوں سے روپیہ ٹھنکانے کا اشارہ کرتے ہوئے) "سخن درین است" والا معاملہ ہے۔

نواب صاحب۔ تو پھر کیا دیر ہے۔

وزیرو۔ حضور روپیہ بالکل نہیں بارہ ہزار تو کلیر شریف کے میلے پر اُٹھ گیا۔ دس ہزار جوہر جان لے گئی بیس ہزار حضور نے اپنے دست مبارک سے محتاجوں میں تقسیم کر دیا۔ دس ہزار اس دن دعوتِ عام پر خرچ ہو گیا اور تقریباً آٹھ ہزار باغ سیر پر صرف ہوا اس کے علاوہ حضور کی علالت اور علاج معالجہ پر دس پندرہ ہزار لگ گیا۔ پھر گھوڑے ہیں موٹریں ہیں۔ ملازم ہیں۔ باورچی ہیں خانساماں ہیں اور ہزاروں طرح کے خرچ اخراجات ہیں۔ اس طرح کم و بیش ایک لاکھ روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ حضور خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں (فہرست پیش کرتے ہوئے) یہ کل میزان ہے اور سچ بات تو یہ ہے کہ حضور ہی کا حوصلہ ہے جو اسقدر رقم صرف ہو گئی اور پیشانی پر بل نہیں آیا۔

بھوندو۔ بل کیسے آتا ہمارے سرکار دریا دل ہیں دریا دل۔

نواب صاحب (لاپروائی مگر بے صبری سے) اچھا روپے کا انتظام ہو جائے گا مگر یہ تو بتاؤ وہ مال ہے کہاں۔

کلن۔ حضور کیا پوچھتے ہیں۔ چاوڑی بازار میں ننھی جان نامی ایک نئی طوائف آئی ہے۔ مقبول صورت۔ پستہ قد۔ سڈول جسم۔ گورا رنگ۔ نرگسیں آنکھیں۔ سیاہ بال۔ بس مختصر یہ کہ اس کی سب سے بڑی تعریف یہی ہے کہ وہ حضور کے لائق ہے۔

نواب صاحب۔ بس بس تو پھر جلدی روپے کا انتظام کرنا چاہئے۔ آج ہی سیٹھ بدری پرشاد کے ہاں جاؤ اور وہ پیلی کوٹھی جو دریا کے پاس ہے اسکا فیصلہ کر دو۔ پچاس ساٹھ ہزار تک غرض جتنے بھی پٹ سکیں لے آؤ۔ ہاں جلدی جاؤ۔

جمن۔ تاں حضور یہ نہیں ہو سکتا۔ خدانخواستہ یہ کیوں ہونے لگا۔ بڑوں کا نام ہے دہلی بھر کی سب جائداد تو پہلے ہی ختم ہو چکی ہے۔ لے دیکے یہی ایک کوٹھی رہتی ہے۔ اگر آپ کا کام دو چار ہزار سے چل سکتا ہو تو یہ غلام کہیں نہ کہیں سے بہم پہنچا سکتا ہے۔

کلن۔ چل بے کہیں کے پاگل۔ نواب صاحب کا کام اور دو چار ہزار میں۔ دیکھیئے نواب صاحب وہ کوئی طوائف نہیں ہے کسی شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ کسی ایرے غیرے کو تو اپنے کوٹھے پر بھی نہیں آنے دیتی۔ ابھی کل کی بات ہے کہ لالہ درگا داس بیرسٹر ایک گلوری کے عوض پانصد روپیہ نذر کر آئے لیکن پھر بھی وہاں آمد و رفت نہ رہ سکی۔ حضور کیا پوچھتے ہیں۔ بڑے سلیقے والی عورت ہے ہر کسی کو منہ تھوڑے ہی لگاتی ہے۔ وہ تو کل میں نے حضور کا ذکر خیر کیا تو سُن کر مشتاق ہی ہو گئی۔

نواب صاحب۔ جمن بھائی کیا ہرج ہے آخر ایک کوٹھی ہی ہے نا۔

جمن (منہ بسور کر) حضور کی مرضی۔ یہ غلام کیا کر سکتا ہے۔ کاش ہماری بھی اتنی بساط ہوتی تو ہرگز آپ کو کوٹھی الگ نہ کرنے دیتے۔ برسوں آپکا نمک کھایا کیا ہمارے لئے یہ شرم کا مقام نہیں۔

وزیرو۔ جمن تم سچ کہتے ہو مگر کس برتے پہ تتا پانی۔ کیا ہم اور کیا

ہماری اوقات۔ اسے یہ تو امیروں کے کام ہیں نوابوں کے۔

نواب صاحب ۔ وزیرو بس بہت جلد انتظام ہو جائے۔ کل رات ہم ضرور وہاں جائیں گے۔ ہاں تو کلن ذرا اُن سے کہہ رکھنا کہ کل نواب صاحب آئیں گے۔ بس وہاں اور کوئی غیر شخص نہ آنے پائے۔

جمن ۔ توبہ کیجے حضور وہاں کسی کی مجال ہے کہ دم بھی مارے۔ وہ کوئی رنڈی تھوڑی ہے۔

نواب صاحب (لیٹتے ہوئے) وزیرو دیکھو آج ہی سب انتظام مکمل ہو جائے۔

وزیرو ۔ بہت اچھا حضور! ابھی جاتا ہوں۔

کلن (اُٹھتے ہوئے) چلو بھائی نواب صاحب استراحت فرمائینگے اور سب چلے گئے۔

(۵)

ننھی جان طوائف جس کی کساد بازاری اُسے آگرے سے دہلی لے آئی تھی آج نہایت ہی خوبصورت اور حسین معلوم ہوتی تھی . . . . ۔ ہار سنگار اور غازہ وگلگونہ کے بل بوتے پر اس کا عارضی حسن بہت ہی دلفریب اور دیدہ زیب نظر آرہا تھا مگر یہ اس لئے تھا کہ جمن خاں نے اپنی گرہ سے سو پچاس کی رقم خرچ کر کے ننھی جان کے کرشمہ و ادا کو تیغ تیز بنا رکھا تھا۔

آٹھ بجے شام کے قریب نواب صاحب چند ایک حاشیہ نشینوں کے ہمراہ تشریف لائے۔ ایک طرف وزیرو اور بھوندو دوسری جانب نتھو اور بھیرو رام تھے۔ البتہ کلن جمن اور امراؤ سنگھ وغیرہ پیشوائی کے لئے پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ نواب صاحب ننھی جان کے کوٹھے پر نہایت کروفر اور تزک و احتشام سے آئے۔ ننھی جان بھی زینے تک استقبال کے لئے آئی اور نواب صاحب سے بے تکلفانہ مصافحہ کر کے گاؤ تکئے کے ایک طرف نواب صاحب کو بٹھا کر دوسری طرف خود بیٹھ گئی۔

ننھی جان ۔ جناب کی تشریف آوری میرے لئے انتہائی عزت کا باعث ہے میں بہت شکر گذار ہوں۔

مگر نواب صاحب ایسے لٹو ہوئے کہ کوئی جواب نہ بن آیا اور خاموش ہو رہے۔

کلن ۔ کیا بتاؤں نواب صاحب تو آپ کے اسقدر مشتاق ہیں کہ جب میں نے ذکر کیا بس بیتاب ہی تو ہو گئے۔

جمن ۔ نہایت شریف اور خاندانی آدمی ہیں۔

ننھی جان ۔ واقعی بہت متین اور کم گو واقع ہوئے ہیں۔ پہلے تو دہلی میں طبیعت ہی نہیں لگتی تھی کیونکہ یہاں جتنے بھی بڑے بڑے لوگ آئے نہایت جلد باز پست حوصلہ اور کمینے خیال کے آدمی ثابت ہوئے مگر نواب صاحب ماشاءاللہ نہایت ہی عالی حوصلہ اور بلند خیال معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی ہے۔ اب امید ہے کہ دہلی میں چار دن اچھے گذر جائیں گے۔

نواب صاحب (ذرا سنبھلکر) چار دن کیا اب تو ہمارے خیال میں آپ کو یہاں ہی رہنا چاہئے . . . . واقعی جیسا سنا تھا اس سے بڑھکر پایا۔

ننھی جان یہ تو جناب کی قدر افزائی ہے ورنہ میں تو آپ کی خادمہ ہوں۔

نواب صاحب (ذرا اور اینٹھکر) اور ہم بھی وہ قدر کریں گے کہ آپ ہی داد دیں گی۔

ننھی جان (موقعہ شناسی سے کام لے کر گلوری پیش کرتے ہوئے) اچھا وقت خود بتا دے گا۔ انسان کی باتیں بہت اچھی ہوئی مگر عمل باتوں سے کہیں زیادہ حسین ہوتے ہیں۔

نواب صاحب نے گلوری اُٹھاتے ہوئے معنی خیز نظروں سے وزیرو کی طرف دیکھا جس نے نہایت بے تکلفی سے ایک ہزار روپیہ تھالی میں ڈھیر کر دیا۔

ننھی جان کورنش بجالائی اور رقم کو ایک بار ہاتھ لگا کر وزیرو کو واپس دینے کے لئے یہ کہتے ہوئے کہ نواب صاحب کا دیا ہوا بہت کچھ ہے۔ تھالی اُدھر بڑھادی۔

کلن جو ذرا پرے ہٹ کر بیٹھا ہوا تھا بیتاب ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا اور ننھی جان کے پاس آکر کہنے لگا۔

دیکھنا کہیں یہ غضب نہ کرنا۔ نواب صاحب کسی کو کچھ دیکر واپس نہیں لیا کرتے وہ تو آپ کی وجہ سے ہیں ورنہ کب کے ناراض ہو کر

تشریف لے گئے ہوتے"

ننھی جان نے حیرت سے کہا

"اچھا یہ بات ہے (پھر جھک کر سلام کر کے) مجھ سے غلطی ہوئی میں معافی چاہتی ہوں"

اور روپے والی تھالی پھر اپنی طرف کھینچ لی۔

نواب صاحب نے ذرا ہنسوڑی صورت بناکر کہا

"کچھ مضائقہ نہیں"

اس کے بعد نحو کی طرف سے گانے کی فرمائش ہوئی مگر ننھی جان نے کھانستے ہوئے گلے کی خرابی کا عذر پیش کیا۔

میں خود شرمسار ہوں کہ نواب صاحب تشریف بھی لائے اور میں انہیں محظوظ نہ کرسکی۔

جمن۔ کوئی بات نہیں۔ پھر دیکھا جائے گا۔ نواب صاحب کل ڈاکٹری معائنہ کرادیں گے۔

نواب صاحب۔ ہاں صبح میجر جیمبرز کو ہمارا سلام بولنا۔

جمن۔ بہت اچھا حضور

اتنے میں ننھی جان کے ایک ملازم نے حقہ پیچوان پر رکھتے ہوئے چلم انڈیل دی۔ دیکھتے ہوئے کوئلے قالین پر گر گئے دست پناہ وہاں موجود نہ تھا باورچی خانے سے لاتے لاتے قالین کا کچھ حصہ جل گیا۔

بس پھر کیا تھا لگی ننھی جان برسنے ملازم پر۔

"منڈی کاٹے نے دو ہزار کا قالیچہ جلا دیا اور ہمارے رنگ میں بھنگ الگ ڈالی۔ نواب صاحب کیا کہیں گے کہ ان کے ملازم ایسے بدتمیز ہیں جا دور ہو جا میری آنکھوں سے۔ کل سے برخواست"

مگر ملازم نے پاؤں پڑتے ہوئے شیشے کا گلاس توڑ دیا۔

اب تو ننھی جان کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔

لیکن نواب صاحب نے دخل دے کر بیچ بچاؤ کر دیا اور وزیرو سے یہ کہہ کر

"کل دو ایرانی قالین اور سونے کے دو گلاس بھجوا دینا"

معاملہ رفت گزشت کر دیا۔

ننھی جان مسکرا کر پھر آداب بجا لائی اور ساتھ ہی نواب صاحب کے شوق کو مہمیز کرنے کے لئے ایک نہایت زبردست انگڑائی لی جسے دیکھ کر وہ تو بالکل ہی "لٹو" ہو گئے۔

رنڈی بلا کی چالاک تھی بھانپ گئی کہ وار چل گیا۔ بس فوراً نیند کا بہانہ کرکے اٹھنے کے لئے طیار ہوگئی اور نواب صاحب طوعاً وکرہاً وہاں سے جذبات کا طوفانِ بے پایاں لے کر اٹھے۔

(۶)

نواب صاحب اپنے دیوانخانے میں بیٹھے پیچوان کے دھوئیں اڑا رہے تھے اور یارانِ بے شرط پاس بیٹھے ہر بات میں جی حضور، اور "بندہ پرور" اس طرح کہہ اٹھتے تھے جیسے کوئی گہری نیند سے اچانک چونک اٹھتا ہے۔ لیکن آج نواب صاحب خلافِ معمول بہت زیادہ متفکر اور مشوش تھے کیونکہ مالی مشکلات کا سامنا تھا۔ تمام جائداد رہن ہو چکی تھی۔ لے دے کر ایک حویلی بچی تھی جس میں خود رہتے تھے جب نواب صاحب پوچھتے تھے — وزیرو اب کیا کیا جائے"— تو وہ سر جھکا کر کہتا۔

ہم تو سرکار کے دیرینہ خدمتگذار اور پرانے نمک خوار ہیں۔ کوئی کام نہیں کیا اس لئے ہمارے پاس کچھ نہیں اگر غیر مناسب ہو تو حویلی کو ٹھکانے لگا کر انتظام ہوسکتا ہے۔ میں نے کل آپ کے علم کے بغیر ہی سیٹھ بدری پرشاد سے بات چیت کی تھی۔ بھاڑ میں جائے ایسی حویلی فکر کے مارے تو حضور کی جان سوکھ رہی ہے۔

جمن۔ ہاں بھئی میں تو پہلے بھی پیلی کوٹھی رہن رکھنے کے وقت روکتا ہی رہا اور اب بھی یہی بات کہتا ہوں کہ یہ ٹھیک نہیں۔

نواب صاحب۔ مگر سود کی تکرار تو دم نہیں لینے دیتی اس کا بھی تو کچھ بندوبست ہونا چاہئے۔

امراؤ سنگھ آپ گھبرائیں نہیں۔ میں نے سیٹھ صاحب سے کل بھی کہا تھا اور آج پھر کہوں گا امید ہے مان جائیں گے اور مہلت میں کچھ اضافہ ہو جائے گا . . . . میں ابھی جاتا ہوں۔

عین اس وقت دربان ایک لفافہ لے کر حاضر ہوا نواب صاحب نے جب کھول کر پڑھا تو اس کا مضمون حسب ذیل تھا۔

پیارے نواب صاحب۔ آپ جتنی دفعہ بھی تشریف لائے

آپ کے ہمراہ بہت سے لوگ تھے اس لئے کبھی جی بھر کے آپ سے باتیں نہ کر سکی لہذا عرض پرداز ہوں کہ آئندہ جب کبھی ارادہ ہوا کیلے ہی تشریف لاویں۔ ——— "ننھی جان"

یہ خط بھی یار لوگوں کی چالاکی کا نتیجہ تھا کیونکہ اب وہ مسیح علیہ السلام کی طرح ساتھ چھوڑنا چاہتے تھے۔ نواب صاحب نے خط پڑھ کر جیب میں ڈال لیا۔ اور نہ ہی دوستوں میں سے کسی نے پوچھا۔

پہلے امراؤ سنگھ گیا پھر پھیرو رام اور پھر یکے بعد دیگرے دوسرے بھی کھسکنے شروع ہوئے۔ ابھی وزیرو اور ھوندو اٹھنے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ اختر حسین کے آنے کی اطلاع ملی۔

اختر حسین بلا اطلاع کبھی نہیں آتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اسد اللہ خاں اس کی عزت کرتا ہے اور اس سے جھجکتا بھی ہے۔ اس لئے وہ موقعہ دینا چاہتا تھا کہ اس کے اندر آنے سے پہلے پہلے آلات میکشی اٹھوا دئے جائیں اختر حسین کے اندر آنے سے پیشتر ہی اٹھنے والے اٹھ گئے۔

نواب صاحب نے اختر حسین کا استقبال اٹھ کر کیا اور بیٹھتے ہی بے وقت آنے کی علت غائی پوچھی۔

نواب صاحب۔ آپنے دوپہر کے وقت تکلیف اٹھا کر مجھے بہت ممنون فرمایا ہے۔

اختر حسین۔ مجھے ایک ضروری کام تھا اس لئے چلا آیا ہوں

نواب صاحب۔ فرمائیے دل و جان سے حاضر ہوں۔

اختر حسین۔ مجھے پانچ ہزار روپے کی سخت ضرورت ہے اور ابھی ابھی چاہیئے

نواب صاحب۔ آج کی مہلت چاہتا ہوں کل اس حویلی کو الگ کرنے کے متعلق غور کروں گا۔ جو رقم آئے گی اس میں سے آپ بھی لے لیجئے گا۔

اختر حسین جو روپیہ بنک میں تھا وہ کیا ہوا۔

نواب صاحب (بغلیں جھانک کر) یونہی خرچ ہو گیا۔

اختر حسین۔ اور باقی غیر منقولہ جائداد کیا ہوئی جو اس غریب حویلی تک نوبت آپہنچی۔

نواب صاحب بالکل خاموش تھے۔ کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں۔

اختر حسین۔ نواب اسد اللہ خاں صاحب غور سے سنئے۔ مجھے روپے کی بالکل ضرورت نہیں میں تو صرف اس لئے آیا تھا کہ کل آپ کے ہمنوالہ احباب میں سے چند ایک سیٹھ بدری پرشاد سے یہ کہہ رہے تھے کہ اسد اللہ خاں کے پاس کچھ نہیں رہا دعویٰ دائر کر کے تمام جائداد قرق کرالو۔ اور اپنے پیسے وصول کرو۔ میں بدری پرشاد سے یہ باتیں سنکر بہت حیران ہوا ایک تو مجھے ان دوستوں کی طوطا چشمی پر افسوس ہوا اور دوسرے آپکے حالات سنکر بہت رنج پہنچا۔

نواب صاحب۔ میں یہ ماننے کے لئے بالکل تیار نہیں۔ ممکن ہے کسی غیر آدمی نے کہا ہو میرے دوست بڑے جاں نثار ہیں۔

اختر حسین معلوم ہوتا ہے کہ دولت کے ساتھ ساتھ عقل نے بھی آپ کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ ان کے متعلق آپ کو اس وقت یقین آئے گا جب آپ بالکل تباہ ہو جائیں گے۔ خیر . . .

نواب صاحب (غصے میں آکر) اچھا میں بھی تو سنوں۔ کون کون نمکحرام ہے۔

اختر حسین۔ افسوس مجھے سیٹھ صاحب نے نام نہیں بتائے اور نہ ہی میں نے دریافت کرنے کی ضرورت سمجھی کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ وہ سب کے سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

نواب صاحب خیر تو معلوم ہوا کہ سیٹھ صاحب نے یونہی آپ سے کہہ دیا ہوگا۔ میرے دوست ایسے ویسے نہیں ہیں۔

اختر حسین۔ اچھا سلام علیکم۔ پھر اس وقت ملیں گے جب انکو دوستوں کی نمک حرامی کا پورا یقین ہو جائے گا۔

نواب صاحب یعنی؟

اختر حسین آپ یا تو مجھے دوست رکھ سکتے ہیں یا اُن کو

نواب صاحب اگر یہ بات ہے تو آپ کی خوشی۔ میں ایک شخص کے لئے دنیا کو نہیں چھوڑ سکتا۔

اختر حسین اچھا بھائی سلامت رہو۔

———

(۷)

نواب صاحب سے یار لوگ ایسے گئے کہ ان میں سے کوئی بھی واپس نہ آیا بلکہ ایک دو دفعہ کہلا بھیجنے پر بھی سوائے وزیرو کے کسی نے شکل تک نہ دکھائی اور وہ بھی اس لئے کہ حسابات میں کچھ گول مال تھا اور بہت سا روپیہ غط ربود ہو چکا تھا اب وزیرو کا خیال تھا کہ کسی نہ کسی طرح نواب صاحب سے ایمانداری کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا جائے۔

جب نواب صاحب اختر حسین کے کہنے سننے پر اور برافروختہ ہوئے تو وزیرو نے اس شکر رنجی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور ایک دن نواب صاحب سے کہدیا کہ آپکے دوست ہمیں اس بات کا الزام دیتے ہیں کہ ہم نے آپ کی دولت برباد کر دی ہے۔

نواب صاحب جو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ اختر حسین کا نام آتے ہی کہنے لگے۔

"وہ کون ہے جو ہماری باتوں میں دخل دے"

وزیرو۔ حضور یہی تو سوچنے کی بات ہے آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے عمر کا بہترین حصہ آپ کی خدمت میں گذار دیا ہے اب اگر کوئی کام کرنے کی کوشش کریں بھی تو نہیں ملیگا کیونکہ بدنامی بُری چیز ہوتی ہے۔ ہم تو آپ کے نمک پروردہ ہیں لیکن آپ کو معلوم ہے ہر وقت خرچ کرنے کے بعد کوڑی کوڑی کا حساب دیتا رہا ہوں دوسرے احباب کے ہاتھوں میں پیسہ جاتا ہی نہیں تھا پھر ہم لوگ کیسے کھا گئے۔ اور سنئے حضور اختر حسین سیٹھ صاحب کے ہاں عموماً جاتے ہیں اور انہیں نوٹس دینے اور دعویٰ دائر کرنے پر اکساتے ہیں۔ خیر وہ تو بھلا ہوا امراؤ سنگھ کا جس نے بدری پرشاد کو روک رکھا ہے ورنہ اُس سے بڑا کوئی نہیں۔ لیکن دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ اختر حسین صاحب نے تو کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔

نواب صاحب۔ وہ تو مجھے کہتے تھے کہ تمہارے دوست بدری پرشاد کے ہاں بہت جاتے رہتے ہیں۔

وزیرو۔ حضور یہی تو مزے کی بات ہے کسقدر چالاک آدمی ہے۔

نواب صاحب۔ جتنا شریف معلوم ہوتا ہے اتنا ہی کینہ توز ہے کسقدر گہرا اور چالاک ہے اور کیا خوب چال چلا ہے۔

وزیرو۔ مگر حضور کوئی ایسے ویسے تھوڑے ہی تھے جا کہتے ہیں بیچارے

نواب صاحب (خوش ہو کر) کیوں نہیں۔ ہزار شکوک اسلئے تھی کوشش کی مگر یہاں سنتا ہی کون تھا۔

وزیرو۔ یہ تو حضور کی مہربانی ہے۔ مگر جب اتنی نوازشیں ہیں تو ایک پرزہ کاغذ بھی لکھ دیجئے۔

نواب صاحب۔ کس بات کا کاغذ؟ کیا تنخواہ کا پرونوٹ لکھوا ئیگے

وزیرو۔ اے حضور آپ بھی کیسی بھولی باتیں کرتے ہیں۔ مجھے تو صرف اس طرح کا سرٹیفکیٹ چاہیئے کہ آپ کے ہاں اتنی مدت کا مختار رہا اور اچھی طرح کام سرانجام دیتا رہا۔ حضور اس سے یہ مدعا ہے کہ کہیں کوئی کام مل جائے گا۔ اپنا پیٹ پالیں گے اور حضور کو دعا دیکر حق نمک ادا کر ینگے۔ میرا اب یہاں پڑے رہنا مناسب نہیں۔ کیونکہ آپ کو بھی تکلیف ہے اور دوسرے لوگ بھی انگلیاں اُٹھانے لگ گئے ہیں اس لئے سلامتی اسی میں ہے کہ رخصت ہی لے لی جائے۔ علاوہ ازیں ننھی جان کا بھی یہی ایما ہے کہ آپ زیادہ اُسی کے ہاں رہا کریں اور اکیلے ہی تشریف لے جایا کریں پھر فرمائیے ہماری دال کہاں گل سکتی ہے۔

نواب صاحب۔ اچھا لاؤ لکھ دیتا ہوں۔

اور قلم دوات لے کر لکھنا شروع کر دیا۔

وزیرو۔ تو ہاں حضور! اتنی سی بات اور بڑھا دیجئے گا کہ نہایت دیانتدار آدمی ہے اور ہمارا آج تک کا حساب بیباق کر کے جا رہا ہے؟ حضور غرض یہ ہے کہ اگر اختر حسین پھر کہیں طعن و تشنیع کریں تو اُن کا منہ بند کیا جا سکے!

نواب صاحب بھرّے میں آ گئے اور وزیرو اپنی من مانی باتیں لکھوا کر عہدۂ وزارت سے سبکدوش ہو کر رفو چکر ہو گیا۔

چونکہ نواب صاحب کی طبیعت اُداس تھی اس لئے ذرا غم غلط کرنے کے ارادے سے ننھی جان کی بیٹھک پر تشریف لے گئے۔ جب وہاں پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ دو ایک بار کھٹکھٹایا مگر کوئی جواب نہ پایا۔ آخر زنجیر ہلانی شروع کی اور دو تین بار آہستہ زور سے



گلوں سے خار بہتر ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں

دستک دی کہ بالاخانے کے ساکنوں کو دروازہ کھولنا ہی پڑا۔ مگر اندر جاکر جو کچھ دیکھا وہ نواب صاحب کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے لئے کافی سے زیادہ تھا۔ ننھی جان ایک اور شخص کے ساتھ بوس و کنار میں مشغول ہے۔ اور پاس ہی ان کے بھرائے ہوئے گلاس شراب سے بھرے ہیں۔

یہ دیکھ کر نواب صاحب کی آنکھوں میں خون کے آنسو اتر آئے اور نہایت کرخت آواز میں کڑک کر بولے۔

"او بے وفا۔ بے غیرت۔ حق ناشناس اس کے کیا معنی؟"

ننھی جان - آپ کون ہیں جو اس وقت پرائے مکان میں گھس آئے ہیں۔ آپ کی دستک سے میں تو یہ سمجھی تھی کہ شائد کوئی نوکر سودا لینے کے لئے گیا تھا جو باہر رہ گیا ورنہ دروازہ کیوں کھلتا۔

نواب صاحب - او بے مروت خوبصورت بلا یہ چیزیں کس کی ہیں۔ یہ زیورات کہاں سے آئے ہیں؟

ننھی جان - ہوش کی دوا کیجئے۔ ابے کوئی ہے جو اس پاگل کو یہاں سے نکالے تاکہ ہمارے عیش میں خلل انداز نہ ہو۔

نواب صاحب (غصے سے تھرا کر) او بدکار رنڈی زادی یہ بے وفائی؟

ننھی جان (ہنسکر) للہ معاف کرو۔ میں تو تمہیں جانتی بھی نہیں میں نے آج سے پہلے تو کبھی یہ شکل بھی نہیں دیکھی۔

نواب صاحب - اف یہ طوطا چشمی اور بے مروتی؟ سچ ہے

"اصل بد از خطا خطا نہ کند"

ظالم خدا سے ڈر۔

ننھی جان (پھر ہنسکر) جاتیے یہ وعظ جمعہ کے دن جامعہ مسجد کے ممبر پر کیجئے۔

نواب صاحب (اور بگڑ کر) اُف یہ بیوفائی۔ بدذات عورت تو مجھے لوٹ کر یہ عوض دیتی ہے۔

ننھی جان (منہ چڑا کر) بڑے نواب ٹھہرے۔ پاس پھوٹی کوڑی نہیں اور لٹنے والے آگئے بے ملک نواب کہیں کے جائیے تشریف لے جائیے ورنہ مجھے پولیس کو بلانا پڑے گا۔

نواب صاحب - اُف بے وفا دنیا۔ تف ہے تجھ پر اور لعنت ہو ان لوگوں پر جو تیری چند روزہ خوبصورتی پر عاقبت کو بھول گئے۔

ننھی جان - بے شک بے شک

اور نواب صاحب کف افسوس ملتے ہوئے بیک بینی و دوگوش صحیح سلامت گھر واپس تشریف لے آئے۔

(۸)

ننھی جان کی بے وفائی نے نواب اسد اللہ خاں کو اسقدر آزار پہنچایا کہ آپ کی صحت بگڑنی شروع ہوئی اور اس جانکاہ صدمے کی وجہ سے چند دن صاحب فراش بھی رہے۔ کچھ ہوش آیا تو ایک اور دلگداز خبر سنی۔ وہ بھی دن تھے کہ شہر میں پکنک پر گولی بھی چلی تو نواب صاحب کو خبر تک نہ ہوئی اور اب یہ حالت تھی کہ تمام شہر کے واقعات نہایت دلچسپی سے سنتے تھے۔ ایک دن علی الصبح یہ اطلاع ملی کہ ننھی جان۔ وزیرو۔ چمن۔ نتھو وغیرہم کے درمیان سخت فساد ہوا ہے۔ ننھی جان ہسپتال میں ہے اور باقی سب پولیس کی حوالات میں ہیں۔

قصہ یوں ہوا کہ ننھی جان نے جسقدر نقدی۔ زیورات اور دوسری چیزیں نواب صاحب سے وصول کی تھیں وہ سب ایک منظم سازش کا نتیجہ تھیں۔ اس لئے جب نواب صاحب اچھی طرح لٹ چکنے کے بعد بالکل "بے ملک" ہوگئے تو "یار لوگوں" نے بقدر حصہ رسدی اپنی اپنی خدمات کا صلہ چاہا مگر ننھی جان نے سب کو ٹکا سا جواب دیا۔ اسپر میاں نتھو خاں بگڑے اور ننھی جان کو بالاخانے کی کھڑکی سے باہر چاوڑی بازار میں پھینک دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ننھی تو صرف بچ گئی لیکن نتھو اور باقی سب دھر لئے گئے

جب یہ رپٹ نواب صاحب کو پہنچی تو ہوش کے طوطے اڑ گئے کئی روز سے شراب نہیں ملی تھی آج بغیر پیے بے ہوش ہوگئے ایک بوڑھا ملازم تھا جس نے ہوش میں لانے کی فکر کی لیکن مرتے کو مارے شاہ مدار۔ جب آنکھ کھلی تو سیٹھ بدری پرشاد کا نوٹس ملا جس میں لکھا تھا کہ پچاس ہزار روپیہ سود ایک ہفتے کے اندر ادا کرو ورنہ عدالت میں کل روپے کے لئے چارہ جوئی

کی جائے گی۔

نواب صاحب یہ نوٹس پڑھ کر ذرا ہوش میں آگئے اور کمرے کرنے حویلی کی علیحدگی کی تجویزیں۔ مگر کوئی خریدار نہ ملا۔ اسی اُدھیڑبن میں چار دن گذر گئے۔ اب ایک اور نوٹس ملا لیکن یہ بدری پرشاد کی طرف سے نہیں بلکہ سعادت یار خاں کی طرف سے تھا کیونکہ جو جائداد نواب صاحب کو دولت یار خاں کے ترکہ میں ملی تھی اُس کا جائز وارث سعادت یار خاں تھا۔

بات یہ ہوئی کہ نواب دولت یار خاں کا اکلوتا بیٹا سعادت یار خاں تین سال کی عمر میں گم ہوگیا تھا جسے کسی قزاق نے کانپور کے ایک لاولد شخص احمد خاں نامی کے پاس پانصد روپیہ میں فروخت کر ڈالا تھا۔ پندرہ سال کے بعد احمد خاں اور اس کی بیوی دونوں نے ہیضہ کیا اور سعادت یار دہلی آپہنچا۔ گو نواب دولت یار کا انتقال ہوچکا تھا لیکن اُس کی بیوی زندہ تھی جسے ترکہ میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی جائداد ملی تھی اور وہ نہایت اچھی طرح اوقات بسر کر رہی تھی۔

سعادت یار کو اگرچہ احمد خاں کے ورثے میں کئی لاکھ کی جائداد ملی تھی لیکن پھر بھی چونکہ اُس کی تعلیم و تربیت اچھے گھر میں ہوئی تھی اس لئے اُس نے بیکار بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور کاروبار کے سلسلے میں دہلی آپہنچا۔ کیونکہ اُس کے خیال میں دہلی تجارت کا مرکز تھا۔ ایک دن چاندنی چوک میں گھومتے گھومتے اُسے اماں نصیبن نے جو اُس کی دایا تھی پہچان لیا۔ اُس کا نام اگرچہ اب اور تھا اور عمر بھی بہت زیادہ تھی تاہم خط و خال اور چہرے کی ساخت میں ہنوز کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ دایا نے ٹھہر کر پوچھا سعادت نے ہرچند لاعلمی ظاہر کی لیکن اُسے معلوم ہوتا تھا کہ جو باتیں یہ بڑھیا کہہ رہی ہے اُس نے ضرور خواب کی صورت میں دیکھی ہوئی ہیں۔ تاہم بوڑھیا اُسے مکان پر لے گئی جہاں وہ اپنی والدہ سے ملا

استردادِ جائداد کا یہ نوٹس اسی سعادت یار خاں کی طرف سے تھا جسے پڑھ کر نواب صاحب کے قدم ڈگمگائے اور آنکھوں میں دنیا سیاہ ہوگئی۔ پھر اپنے آپ سنبھلکر اور باختہ حواس کو بہزار دقت مجتمع کر کے کاغذ کے ایک پرزے پر کچھ لکھ کر ملازم کو دیکر کہا کہ ہمارے جانے کے ایک گھنٹہ بعد بیگم صاحبہ کو دے دینا۔ اور خود باؤلے کتے کی طرح بھاگ نکلے۔

آج تانگہ تھا نہ موٹر بلکہ دیوانہ وار بھاگے چلے جا رہے تھے سیدھے جمنا کے پل پر پہنچے اور ہاتھ بلند کر کے یہ دُعا مانگی

ئے اللہ اے پاک پروردگار تو حاضر و ناظر ہے جو کچھ بھی میں نے کیا تو نے سب کچھ دیکھا اور مواخذہ نہ کیا۔ تو نے مجھے توبہ کے لئے مہلت دی لیکن میں نے پروا نہیں کی۔ اب میری ڈھیل ختم ہوچکی ہے۔ میں نے اپنے کئے کی سزا بھر پائی۔ بے شک تیری گرفت بہت سخت ہے

اے زمینوں اور آسمانوں کے سچے بادشاہ میری جھوٹی نوابی ختم ہوئی تو ستار العیوب اور غفار الذنوب ہے اپنے حبیب پاک کے طفیل۔ اپنے نیک بندوں کے صدقے میں میرے گناہ معاف کردے۔ مجھے معلوم ہے کہ خودکشی گناہ ہے اور پچھلے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے ایک اور گناہِ عظیم کا مرتکب ہوتا ہوں مگر تو عالم الغیب ہے تو جانتا ہے کہ مجبور و معذور ہوں دنیا مجھ پر تنگ ہے اور میں ننگِ خاندان ہوں میرا جینا بیکار ہے

اے غفور الرحیم میرے گناہوں کی طرف نہ دیکھ بلکہ اپنی رحمت پر نظر کر اور مجھے معاف کردے۔

اے میری وفا شعار صابرہ تو واقعی میری سچی جاں نثار رفیق حیات ہے۔ تو نے میری خدمتگذاری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن میں تجھے ہمیشہ دھوکہ دیتا رہا اور تیرے حقوق غصب کرتا رہا۔ میں تیرا قصوروار ہوں تو بھی مجھے معاف کردے

اے میرے عزیز دوست اختر حسین میں تجھ سے بہت شرمندہ ہوں۔ تو سچا تھا کہ میں جھوٹے خوشامدیوں کے نرغے میں ہوں میں نے ناحق تیرا دل دکھایا۔ تو بھی مجھے معاف کر۔

اے ننھی جان میں نے تیری الفت میں دل پھنسا کر اپنے آپکو ہلاک کیا لیکن تو بھی سزا پا چکی۔ اے وزیرو اے بھوندو۔ اے نتھو۔ اے امراؤ سنگھ۔ اے جمن اے کلن اور اے پھیرو رام تم سب دغاباز نکلے تم نے میرے ساتھ دغا کی اور ننھی جان نے

تمہیں دھوکہ دیا۔ اُسے سزا مل گئی اور تمہیں مل رہی ہے۔ اور میں اپنے کیفرِ کردار کو پہنچنے والا ہوں'

اے بے وفا دنیا تف ہے تری بھا لینے والی صورت پر اور لعنت ہے ان لوگوں پر جو تری صورت پہ بھول جاتے ہیں۔ اے دنیائے دوں الوداع!"

یہ کہہ کر دریا میں کودنے کو تھے کہ پیچھے سے کسی نے پکڑ لیا۔ مڑ کر دیکھا تو وہی بڑھا ملازم تھا جسے آپ دھتکار چکے تھے۔ دوڑ کر گلے سے لپٹ گئے اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے جب دل کی بھڑاس نکل چکی تو پھر غش کھا کر پیچھے ہٹے۔ لیکن جب آنکھ ملا کر دیکھا تو بجائے بوڑھے ملازم کے اختر حسین تھا جس کے پاؤں میں مصنوعی ڈاڑھی اور سر کے بال پڑے ہوئے تھے۔ اس بھول بھلیاں نے نواب صاحب کے دل سے خودکشی کا خیال ایک لمحے کے لئے بھلا دیا۔ دوڑ کر پھر لپٹ گئے اور زار زار رونے لگے۔

اختر حسین۔ بھائی حرام موت مرنا نامردوں کا کام ہے اگر آپ اپنی پیدا کی ہوئی مشکلات پر قابو نہیں پا سکتے تو سنو
"بدری پرشاد کا تمام روپیہ ادا ہو چکا ہے"

نواب صاحب۔ ہو چکا؟

اختر حسین (رسید دکھا کر) ہاں ہو چکا۔

نواب صاحب۔ لیکن میں پھر بھی زندہ رہ کر کیا کروں گا۔ جائداد کا اصلی وارث آ چکا ہے۔

اختر حسین۔ اب آپ کے سوائے کوئی وارث نہیں۔ نوٹس دینے والا سعادت یار خاں اصل میں آپ کا نام نہاد دوست اختر حسین اور فی الحقیقت آپ کا ایک ادنیٰ غلام تھا۔ چونکہ آپ نے سچے دل سے توبہ کر لی ہے اس لئے میں نے سب کچھ معاف کر دیا۔

مجھے دہلی میں آ کر جب جائداد کے متعلق آپ کی وراثت کا حال معلوم ہوا اُسی دن سے آپ سے واقفیت پیدا کر کے دوستانہ بنایا اور پھر ایک بہروپ بنا کر آپ کی ملازمت اختیار کی جائز یا ناجائز طور پر کسی کے حصے میں آئی ہوئی جائداد کو چھین لینا میرے نزدیک اچھا نہ تھا اس لئے میں نے اس کی واپسی کا تقاضا ہی نہیں کیا۔ لیکن چونکہ یہ جائداد میرے والد بزرگوار نے پیدا کی ہوئی تھی اس لئے اُسے یوں ضائع ہوتے ہوئے دیکھنا میرے لئے سخت روحانی تکلیف کا باعث تھا۔

نواب صاحب تصویرِ حیرت بنے کھڑے سن رہے تھے جب اختر حسین اپنی تقریر ختم کر چکا تو نواب صاحب دوڑ کر پاؤں میں گر پڑے نواب صاحب اپنے محسن کے پاؤں آنسوؤں سے دھو رہے تھے اور اختر حسین محبت و شفقتِ برادرانہ کے سچے موتی نچھاور کر رہا تھا۔

نغمۂ سازِ عاشقی

از حضرت سرور

جلوہ ہوا ہے سر بسر آج نیاز عاشقی
دامنِ حسن پر ہے پھر دستِ درازِ عاشقی

قبلۂ اہلِ حسن ہے، کعبۂ اہلِ عشق ہے
آپ کا نازِ دلبری، میرا نیازِ عاشقی

جورِ دفا نواز سے، لطفِ جنوں طراز سے
چشم زدن میں طے ہوئی راہِ درازِ عاشقی

عہد میں تیرے حسن کے پیرو شوق میں ہوئے
دیتے ہیں شیخ و شاب بھی حکمِ جوازِ عاشقی

تیری نگاہِ شوق ہے عقدہ کشائے دلبری
میری نگاہِ شوق ہے نکتہ طرازِ عاشقی

میرا کلام نغز ہے روح و روانِ شاعری
میری نوائے درد ہے نغمۂ سازِ عاشقی

سرورِ بے نیاز سے کاش یہ کوئی جا کہے
اب ترا لطف کیوں نہیں صرف نیاز عاشقی

صدائے شوکت

از جناب شوکت تھانوی

غم اب جنوں کا تابعِ فرماں نہیں رہا
پابستۂ قیودِ گریباں نہیں رہا

اِک ابر اور ابر میں طوفانِ برق و باد
اب آشیاں رہا تو گلستاں نہیں رہا

اس حد پہ ہے جو کفر تو اب کیا کہوں اسے
عصیاں مری نگاہ میں عصیاں نہیں رہا

اُف رے دلِ حزیں کو مٹا اور یوں مٹا
اک قطرہ خون بھی سرِ پیکاں نہیں رہا

یہ میری محویت کیلئے ایک بات ہے
جسوقت چاہا عالمِ امکاں نہیں رہا

عہدِ وفا میں میرے لئے اک گناہ تھی
وہ توبہ جس کے بعد پشیماں نہیں رہا

جو مجھ سے ہو سکا وہ کسی سے نہ ہو سکا
آئینہ میری طرح سے حیراں نہیں رہا

اس منظرِ جمال کو سمجھوں گا میں جمال
جب دل کہے کہ اب مجھے ارماں نہیں رہا

شوکت وہ جانتا ہے خلش ہائے غیر کو
جسکے خیال میں بھی گلستاں نہیں رہا

اردو اخبار نویسی

پر ایک نہایت مختصر تاریخی تبصرہ

از جناب مولوی محمد عبداللہ صاحب قریشی

تمر لیست کہ آوازہ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

اخبار کا مفہوم اخبار جمع ہے عربی لفظ خبر کی جسکے معنی ہیں تازہ اطلاعات یا نئی باتیں۔ مگر بعض لوگ حدیث کو بھی خبر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

انگریزی زبان میں خبر کو نیوز (News) کہتے ہیں جس کے لغوی معنی ہیں تازہ واقعات۔ جدید معلومات۔ نئی باتیں یا ان واقعات کی پہلی اطلاع جو اب تک ظہور میں نہ آئے ہوں۔ مگر معنی کی جامعیت کے لحاظ سے لفظ نیوز کے چاروں حروف ذیل کے چار الفاظ کے ابتدائی حروف خیال کئے جاتے ہیں:۔

North نارتھ بمعنی شمال یا اُتر
East ایسٹ بمعنی مشرق یا پورب
West ویسٹ بمعنی مغرب یا پچھم
South ساؤتھ بمعنی جنوب یا دکھن

اس حیثیت سے اخبار کو چہار دانگ عالم کی خبروں کا مجموعہ ہوتا ہے اخبار کہتے ہیں۔

اخبار کی کئی قسمیں ہیں۔ روزانہ۔ ہفتہ وار۔ پندرہ روزہ۔ ماہوار اور سہ ماہی تو سبھی جگہ ہوتے ہیں مگر بعض متمدن ممالک میں دن میں دو بار شائع ہونے والے اور گھنٹہ گھنٹہ کے بعد نکلنے والے بھی موجود ہیں۔

فن صحافت کی ابتدا فن صحافت کی ایجاد کا سہرا اہل چین کے سر بندھتا ہے۔ جنہوں نے آج سے تین ہزار سال قبل اخبار پیکن جاری کر کے اس تحیر انگیز ذہانت و ذکاوت کا عملی ثبوت پیش کیا جو صانع قدرت نے چینی قوم کے دل و دماغ میں ودیعت کر رکھی ہے۔

یورپ میں سب سے پہلا اخبار "اشاعت" جمہوریہ وینس میں جو اطالیہ کے کردڑپتی تاجدران تجارت کا مرکز تھی جاری ہوا، انگلستان کا سب سے پہلا اخبار "ویکلی نیوز" بتایا جاتا ہے۔ جو بلدہ لندن سے ۱۶۲۲ء میں شائع ہوا تھا، جرمنی کا قدیم ترین اخبار "فرنکفرٹر سائینگ" ہے جو ۱۶۱۵ء میں جاری ہوا تھا۔ ممالک متحدہ امریکہ میں اخبارات کا رواج ۱۶۹۰ء میں ہوا۔ وہاں کا سب سے پہلا اخبار پبلک اکرنسز ہے جو بوسٹن سے جاری ہوا تھا، فرانس میں صحافت کی ابتدا اکٹرٹ ڈی فرانس سے ہوئی جو ۱۶۳۱ء میں شائع ہوا۔ سویڈن میں اخبارات کا سلسلہ ۱۸۶۰ء سے۔ ڈنمارک میں ۱۸۶۳ء سے ناروے میں ۱۷۶۳ء سے بلجیم و ہالینڈ میں ۱۹۰۵ء سے۔ روس میں ۱۷۰۳ء سے۔ اسپین میں ۱۷۲۶ء سے اور ٹرکی میں ۱۷۹۵ء سے شروع ہوتا ہے۔

ہندوستان میں اخبارات کا رواج ہندوستان میں یہ صنف شاہان اسلامیہ اور بالخصوص شاہان تیموریہ کے عہد میں رواج پذیر ہوئی۔ اس وقت اخبار نگاری کا

کام وقائع نگاروں اور پرچہ نویسوں سے لیا جاتا تھا جو اپنے اپنے روزنامچوں میں روزمرہ کے واقعات قلمبند کرتے تھے اور انکی نقل صدر دفتر کے ذریعے دربار میں بھیج دیتے تھے۔ یہ روزنامچے تاریخ نویسی میں بھی بہت مدد دیتے تھے۔ چنانچہ جن بادشاہوں نے اپنے عہد کی تاریخیں خود مرتب کرائی ہیں انہیں روزنامچوں کے مسودے یا نقلیں تاریخ نویس کے پاس بھیجنے کا خاص اہتمام کرنا پڑا ہے۔

ہندوستان میں مطابع کا قیام ایسٹ انڈیا کمپنی کے وقت میں ہوا۔ مگر اس وقت جتنے اخبار معرض ظہور میں آئے وہ انگریزی زبان کے ہیں۔ اس لئے صحیح معنوں میں ہندوستانی اخبار کہلانے کے مستحق نہیں ان میں، دی بنگال ہرکارہ اور انڈین گزٹ خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہ دونوں بعد میں انڈین ڈیلی نیوز کی صورت میں منتقل ہو گئے۔ جو اس وقت ہندوستان کا بہترین اخبار خیال کیا جاتا ہے۔

اُردو میں اخبار نگاری کا آغاز

اردو میں اخبار نگاری کا آغاز گزشتہ صدی کے اوائل میں ہوا۔ مگر اس وقت کے اخباروں کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہ تھی۔ ان کے مدیران کو اخبار نکالنے سے پیشتر ایک لائسنس لینا پڑتا تھا۔ جس کی رُو سے ان کا یہ فرض ہو جاتا تھا کہ وہ جو کچھ لکھیں اسے شائع کرنے سے پہلے سنسر کرا لیا کریں۔ یہ قانون ۱۷۹۹ء میں لارڈ ویلزلی نے نافذ کیا تھا۔ جس کی خلاف ورزی پر ایڈیٹر کو ہندوستان سے جلاوطنی کی سزا دی جاتی تھی۔

ہندوستانی اخبارات کی آزادی

۱۸۱۸ء میں جب لارڈ وارن ہیسٹنگز نے قانون مطابع منسوخ کر کے ہندوستانی اخبارات کو آزاد کیا تو بہت سے اخبار عرصہ شہود پر جلوہ گر ہو گئے۔ یہاں تک کہ ۱۸۳۲ء میں ان کی تعداد گیارہ تک پہنچ گئی۔ جن میں پانچ خالص ہندوستانی تھے۔

فرانس کے فاضل مستشرق گارسن ڈی ٹاسی نے (جو ایک مدت تک ہندوستان کے طول و عرض میں سیاحت کرتا رہا) ۱۸۵۳ء میں پیرس کے مقام پر اپنی سالانہ تقریر کے دوران میں بیان کیا کہ ہندوستان میں اس وقت ۲۰ مختلف قسم کے اخبار ہیں جو اردو زبان میں شائع ہوتے ہیں۔

اُردو صحافت کا ارتقائی دور

اردو صحافت کی ترقی کا دور غدر کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور اس سلسلہ کا پہلا اخبار غالباً "اودھ" ہے۔ جو ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ کے مشہور پبلشر منشی نولکشور آنجہانی نے جاری کیا تھا۔ اور گو شروع شروع میں یہ اخبار ان کے کاروبار کے اشتہار کا کام دیتا تھا۔ مگر جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا یہ بھی اپنی روش بدلتا گیا۔ اور آخرکار جب تعلیم میں ہر دلعزیزی بڑھ گئی تو اخبارات کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۸۲ء میں جب حساب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہاں کے اخبارات کی تعداد ۳۰۷ تک پہنچ چکی ہے۔

اُردو صحافت کی ترقی میں لاہور کا حصّہ

اردو صحافت کو معراج ترقی پر پہنچانے اور ملک کو موجودہ روش کے معیاری اخباروں سے روشناس کرانے میں جتنا کام پنجاب اور بالخصوص لاہور نے کیا ہے وہ اسی کا حصّہ ہے۔ اس معاملہ میں ہندوستان کا کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس نے نہ صرف خود متعدد بلند پایہ اور ارزاں اخبارات شائع کئے بلکہ ہندوستان بھر کے اردو اخبارات و رسائل کے ایڈیٹروں کو اس فن کا سبق دیا۔ اس نے چند چٹکلے۔ تھوڑی سی باسی خبریں۔ اور راجوں نوابوں اور رئیسوں کی مدح سرائی میں صفحوں کے صفحے سیاہ کرنے والے اخبارات کو اصلی اخباریت سے روشناس کرایا اور ملکی سیاست پر خامہ فرسائی کرنے کی طرح ڈالی۔ اس نے مشاعروں کی روئدادیں چھاپنے والے اور ریل گاڑی سردی۔ گرمی۔ قلم دوات مسمریزم اور قیافہ شناسی پر جواب مضمون لکھنے والے رسائل کو اعلیٰ درجہ کے علمی۔ ادبی اور تاریخی مضامین پیش کرنے کا گر بتایا، اور اسی پر ہی بس نہیں کی بلکہ مضامین کو مصور کرنے کی رسم ڈال کر اُردو صحافت کو غیر ملکی صحافت کے دوش بدوش کھڑا کرنے کے قابل بنا دیا۔

آج ہندوستانی اخبار نویسی میں لاہور کا درجہ سب سے ممتاز ہے۔ یہاں سے شائع ہونے والے اخباروں میں کئی کئی بار ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر ملک کے کونے کونے میں پہنچتے ہیں۔ اور لوگوں کے دلوں میں جوش عمل کی روح پھونک کر انہیں ترقی کے لئے ابھارتے ہیں۔ بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک کی موجودہ سیاسی۔ تمدنی۔ معاشری

اور نہ ہی بیداری لاہور کے دم سے وابستہ ہے۔ کیونکہ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ جہاں اخبار نویسوں کی اس قدر رہتات ہو۔ جہاں جرائد و رسائل اس کثرت سے نکلتے ہوں کہ شاید کتابیں بھی شائع نہ ہوتی ہوں اور پھر ایسی مطبوعات کا حلقۂ اشاعت ہزاروں تک پہنچتا ہو۔ وہاں کی تعلیمی حالت بہتر تجارت ہمہ گیر۔ کتابت و طباعت اعلیٰ اور مصوری و نقاشی عمدہ ہو گی۔ علاوہ ازیں وہاں وقت کی پابندی۔ فرض کا احساس۔ معاملہ کی صفائی۔ کام کی ہمدگی۔ معاشرت کے جملہ امور کی تنظیم نہایت احسن طریق پر ہو گی۔ کیونکہ انہی چیزوں کے مجموعے کا نام اخبار اور اخبار نویسی ہے۔

جرنلسٹوں کیلئے ایک مفید لائحہ عمل

یہ درست ہے کہ مہذب ممالک میں جرنلزم ملکی معاشرت۔ سیاست اور ذہنی ارتقاء پر پوری طرح حاوی ہوتی ہے۔ مگر اس بات سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ایک اخبار نویس کی ذمہ داریاں بہت اہم۔ اس کے فرائض نہایت مقدس اور اس کا قلم ایک جادو بیان مقرر یا آتش زبان مدبر سے کسی حالت میں کم نہیں ہوتا۔ وہ انسانوں کو کام کے لئے ابھارتا ہے اور ان کے جوشِ عمل کو درست امور کی طرف راغب کرتا ہے۔ بسا اوقات وہ ابلتے ہوئے پانی پر تیل کا کام دیتا ہے۔ اور امن و سکون کا پیغام ملک کے طول و عرض میں پہنچاتا ہے۔ اس لحاظ سے جرنلسٹ بنی نوع انسان کا حقیقی خیر خواہ ہوتا ہے۔ لیکن اس موقع پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا جرنلسٹ شاعروں کی طرح پیدائشی ہوتا ہے یا بنایا جاتا ہے؟ پیدا تو وہ ضرور ہوتا ہے۔ مگر بنایا بھی جا سکتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی بعض یونیورسٹیوں میں جرنلزم کی باقاعدہ ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ اور تاریخ صحافت اس بات کو ثابت کر رہی ہے کہ جو تعلیم انھوں نے وہاں حاصل کی ہے۔ ملک اور ملت کے لئے نہایت مفید ثابت ہوئی ہے۔ اس نے نہ صرف نوجوانوں کے لئے ایک نئی شاہراہ کا دروازہ کھول دیا ہے بلکہ ان کے دماغوں کو روشن اور سینوں کو فراخ کر دیا ہے۔ مگر بدقسمت ہندوستان میں کوئی یونیورسٹی اپنے فارغ التحصیل طلباء کو اس قسم کی ڈگریاں نہیں دیتی۔

ہندوستان میں آجکل تعلیم و تعلم کا بڑا زور شور ہے۔ اور تہذیب و شائستگی کافی وسعت اختیار کر رہی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جرنلزم بھی اس کے ساتھ ساتھ ترقی کرے اور ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں صحیح مذاق پیدا کرے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان سابق سر سریندر ناتھ بینرجی۔ لعل موہن گھوش۔ سید حسین۔ مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خاں جیسے جلیل القدر جرنلسٹوں پر فخر کر سکتا ہے مگر یہ خاص خاص نظیریں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں نے بھی کسی دارالعلوم سے جرنلزم کی تعلیم حاصل نہیں کی ہمارے خیال میں اس شعبہ کی باقاعدہ تعلیم سے اس سے زیادہ شاندار نتائج بھی برآمد ہو سکتے ہیں۔ اور جرنلزم کی تاریخ میں ایک نہایت اہم باب کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ جب ڈاکٹری۔ وکالت۔ انجنیئرنگ اور دیگر ایسے ایسے پیشوں کے لئے دارالعلوم کی تعلیم ضروری سمجھی جاتی ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ جرنلزم کو کیوں اور کس لئے اس سے محروم رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ شعبہ بھی ان سے کچھ کم حیثیت اور اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر ملک کی موجودہ معاشی کمزوری کا خیال کرتے ہوئے ہر دارالعلوم میں اس کے لئے الگ الگ استاد مقرر نہیں کئے جا سکتے۔ تو اسے اختیاری مضامین میں کیوں جگہ نہیں دی جاتی اور انٹرمیڈیٹ سے لے کر پوسٹ گریجوایٹوں کے نصاب میں اسے کیوں داخل نہیں کیا جاتا؟

یہ نصاب دو حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ ایک علمی۔ دوسرا عملی۔ جرنلسٹ بننے کے لئے ضروری ہے۔ کہ آدمی علمی مذاق رکھتا ہو اور مشہور ترین مصنفین مثلاً گبن۔ میکالے۔ مورلے اور رسکن وغیرہ کو نہایت عمیق نگاہی سے مطالعہ کر چکا ہو اور علم ادب کی مضبوط بنیادوں کے ساتھ سیاست سائنس۔ تاریخ اور معاشرت پر کافی عبور حاصل کر چکا ہو اور مطالعہ کے مندرجہ ذیل شعبوں پر پوری دسترس رکھتا ہو:۔

(۱) تصویر کشی (۲) مختصر نویسی

(۳) فن ملاقات (۴) افتتاحیہ نگاری

(۵) مقالہ نگاری (۶) فن اشتہار بازی

(۷) فن طباعت

دوسرا حصہ خاص عمل سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس کے لئے کسی کامیاب اخبار کے دفتر میں کام کرنا نہایت لازمی ہے

جہاں تک ہندوستانی اخبار نویسی کا تعلق ہے۔ دیسی اخبارات کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ہندوستانی اخبارات کا آئندہ مستقبل نہایت شاندار ہے۔ اور اسے تھوڑے ہی عرصہ

میں فاضل ترین اشخاص اور خاص خاص صوبوں کی زبان میں مہارت تامہ رکھنے والے نوجوانوں کی خاص ضرورت لاحق ہوگی۔ اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں ذیل کا لائحہ عمل پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے :-

انٹرمیڈیٹ آرٹ میں جرنلزم کی ایک آزاد اور اختیاری جماعت پیدا کرنی چاہیئے جس میں تاریخ۔ مختصر نویسی۔ ٹائپ اور کوئی دیسی زبان لازمی طور پر شامل ہونی چاہیئے۔ ڈگری کے امتحان میں جاکر سیاست۔ معاشرت۔ معاشیات اور تاریخ ضروری کر دینے چاہئیں۔ اور کم از کم ایک سال کے لئے کسی اچھے اخبار کے دفتر میں عملی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیج دینا چاہیئے۔

اعلیٰ تعلیم اور بہترین تربیت کے ذریعے ہمیں امید ہے کہ ہمارے پاس قابل اخبار نویسوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو سکتی ہے۔ جو اعلیٰ قابلیت اور بہترین اخلاق کے ساتھ فرقہ وارانہ تعصب سے بالاتر ہوگی۔ اور ملکی سیاسیات میں پوری دلچسپی لیتی ہوگی۔ اس وقت ہماری جرنلزم ایک زبردست طاقت ہوگی۔ کیا ہم امید کر سکتے ہیں۔ کہ ہمارے ملک کی کم از کم ایک یونی ورسٹی تو ضرور ہی اس تجویز پر عمل کریگی اور جرنلزم کو اپنے فرائض میں تجربتاً داخل کرے گی ؛

(محمد عبداللہ قریشی)

کیفیات

(مولانا عشرت رحمانی مدیر "نیرنگ" دہلی)

کر چکے برباد دِل کو زینتِ ویرانہ ہم
تیری خدمت اور کیا کرتے غمِ جانانہ ہم

در پئے آزارِ قسمت، ضبط سے بیگانہ ہم
تا بہ کے آخر نہ کہتے عشق کا افسانہ ہم

دِل رُبائی کی ضرورت ہے نگاہ جانستاں
تیری بزمِ ناز میں لائے ہیں اک دیوانہ ہم

کچھ نہ پوچھو کیفیاتِ سوزِ عشق و سازِ حُسن
دیکھتے ہیں شمع میں سوزشِ پروانہ ہم

ہر قدم پر جوشِ مستی رنگ سے مے خانہ بنا
کھو چکے اب احترامِ لغزشِ مستانہ ہم

ہوش کا معیار کیا ہے کیا ہے نظمِ بیخودی
جانتے ہیں اپنی مے نوشی کا ہر پیمانہ ہم

چشمِ میگوں نے کبھی ڈالی تھی در دیدہ نظر
جب سے آنکھوں میں لئے پھرتے ہیں اک میخانہ ہم

بزمِ انجم منتظر ہے دم بخود ہے کائنات
دیکھ کس کس کو سُناتے ہیں ترا افسانہ ہم

ہوش والوں سے نہ پوچھ اپنی نظر کی مستیاں
جانتے ہیں خوب رازِ گردشِ پیمانہ ہم

دیدۂ خونبار نے عنوان قائم کر دیا
ختم کرتے ہیں حیاتِ دَرد کا افسانہ ہم

فطرتِ غم دوست عشرت ہے مسرّت کی حریف
اشک غم سے رکھتے ہیں بنیادِ عشرت خانہ ہم

"فاختہ سے"

(از جناب کنور لطافت علی صاحب طالب باغپتی)

سن او سکوں کی پیغام بر سروش بہار　　عروس گلشن ہندوستان رشک ہزار
کلید درس تصوف تری نوائے خروش　　سکون وادی عرفاں تری ادائے خموش
یہ حال و قال یہ اک مشت پر تری ہستی!　　خراب بادۂ توحید - مستقل مستی!!
کبھی ببول پہ پڑھنا وظیفہ "یاہو"　　کبھی کنیر پہ مصروف نغمہ "کوکو"
کبھی پروں کو پھلا کر خرام مستانہ　　کبھی وہ سر کو اٹھانا بشان شاہانہ
کبھی اچھل کے ہری پتیوں میں کھو جانا　　کبھی ادا سے نئی کونپلوں میں سو جانا
کبھی بجوش مسرت بلند اڑ جانا　　ہوا میں کھول کے پر خود بخود اتر آنا
یہ ایک شعر مجسّم تری حیات لطیف　　یہ اک تبسم رنگیں تری بساط ضعیف
چمن طراز یہ اپریل کی نئی گرمی　　نئے درخت، نئی کونپلیں، نئی پتی
نئی امنگ تری، تو نئی، بہار نئی،　　نئی فضائیں، نئے زمزمے، نئی شوخی
زمانہ تیرے نئے گیت کو سمجھ نہ سکا　　تری نوائے مسرت کو صرف میں سمجھا

پیام رخصت سرما سنانے آئی ہے
مرے انار کو دلہن بنانے آئی ہے

ہیرا

افراد مجلس

اجنبی .... ایک چور

مسٹر پرکن .... ایماندار شوہر

مسنر پرکن .... حریص بیوی

مس پرکن .... مسٹر پرکن کی دختر

البرٹ .... مس پرکن کا دوست

مقام لنڈن .... وقت شام

ایک چھوٹے سے کمرے میں مسٹر پرکن اور ان کی دختر بیٹھے ہیں۔ مسٹر پرکن اخبار پڑھ رہے ہیں۔ لڑکی ایک معمہ حل کرنے میں محو ہے۔ اور مسنر پرکن ایک جراب بن رہی ہیں۔ دیوار پر ایک کلاک ٹک ٹک کر رہا ہے۔ کمرہ بجلی کی روشنی سے منور ہے۔

مسنر پرکن۔ ہماری زندگی بھی کوئی زندگی ہے ؟ —— آہ ؟

مسٹر پرکن ۔ کیوں ؟ کیوں !

مسنر پرکن ۔ کھانا کھانے کے بعد اس طرح سست بیٹھے رہنے سے طبیعت اکتا جاتی ہے اور پھر ہر رات جبکہ یہی معمول ہو جائے —— بیزار ایسی زندگی سے ——

مسٹر۔ مگر یہ ہم سب کے لئے ہے۔

مسنر پرکن۔ سب کے لئے؟ کیسے ؟ کیا تم روزمرہ صبح سے شام تک باہر نہیں رہتے ؟ سیر و تفریح سے دل نہیں بہلاتے ؟

مسٹر پرکن۔ اور اگر ایسا نہ ہو۔ تو میں تمہاری تکلیف کا باعث ہوں گا۔

مس پرکن۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر آج رات ہم سینما جاتے۔

مسٹر پرکن۔ تاکہ تمہاری ملاقات تمہارے دوست سے ہو جاتی۔ کیوں ٹھیک ہے نا ؟

مس پرکن ۔ آپ جانتے ہیں۔ کہ وہ شام کو ہمیشہ معروف ہوتا ہے۔

مسٹر۔ کہاں ؟

مس پرکن ۔ مجھے نہیں معلوم ۔

مسٹر۔ وہ کیا کام کرتا ہے

مس ۔ آہ ۔ البرٹ کیا کام کرتا ہے ؟ —— اس نے مجھے کبھی نہیں بتلایا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ ایک راز ہے۔ اور یہ راز ہی رہنا چاہیئے

مسٹر۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا ۔ تو ضرور معلوم کر لیتا۔

(لڑکی پھر معمہ حل کرنے میں معروف ہو جاتی ہے۔ مسنر پرکن جراب بننی شروع کر دیتی ہے۔ اور مسٹر پرکن اخبار پڑھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ تھوڑے وقفے کے لئے کمرے پر سکوت طاری ہو جاتا ہے۔)

مسنر پرکن ۔ کوئی تازہ خبر؟

مسٹر پرکن ۔ کونسل کی ممبری کے انتخابات ——

مسنر پرکن ۔ کوئی دلچسپ خبر؟

مسٹر پرکن ۔ دیکھو۔ ایک لڑکے نے ایک شلنگ چرایا۔ اور چوری کے الزام کے خوف سے نکل گیا۔

مسنر پرکن۔ اوہوں !

مسٹر پرکن ۔ لو اور تمہارے مذاق کے مطابق خبر ہے ایک بیش بہا ہیرے کی چوری مسز ناظم خاں کا ہیرا غائب"

مسز پرکن۔ کب؟

مسٹر پرکن۔ آج۔ وہ ایک ملاکہ ہے۔ گرینڈ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ ہیرا اڑا کر کسی نے اس کی جگہ جعلی ہیرا ——— ادنیٰ قسم کے پتھر کا ٹکڑا رکھ دیا ہے

مس پرکن۔ مگر چور کو اصلی کی جگہ نقلی رکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

مسٹر پرکن۔ ہاں کچھ نہ کچھ تو اس جگہ رکھنا چاہیے تھا۔

مس پرکن۔ کیوں؟

مسٹر پرکن۔ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اکثر چور ایسا ہی کرتے ہیں۔ مشرق کا یہ ایک درخشندہ نایاب خزانہ تھا۔ یہ ایشیائی چوروں کی چالاکی معلوم ہوتی ہے۔ اس کا اب تک کوئی سراغ نہیں ملا۔ شرلک ہومز اور مشہور جاسوسوں کو تاریں دی گئی ہیں۔

مس پرکن۔ اس کی قیمت کیا ہوگی۔ بھلا۔

مسٹر پرکن۔ بہت زیادہ کہتے ہیں۔ اس گم شدہ ہیرے کے سامنے "کوہ نور" مات تھا۔

مسز پرکن۔ واقعی؟

مسٹر پرکن۔ ہاں! تو اگر میں یہی ہیرا تمہیں تحفۃً لا کر دیتا ——— تو؟

مسز پرکن۔ تو میں اسے ضرور پہنتی۔

مس پرکن۔ یہ بہت مشکل ——— چور ہمیشہ اس کی تاک میں رہتے اور تمہاری زندگی مخدوش۔

مسز پرکن۔ مگر چور اتنی شہرۂ آفاق چیز چرا کر اسے کیونکر کام میں لا سکتے ہیں۔؟

مسٹر پرکن۔ وہ اسے کاٹ کاٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنا لیں گے اور اس کے بعد امریکہ لے جا کر فروخت کریں گے۔ وہاں انہیں کوئی گرفتار نہیں کر سکتا۔ بیٹی پالی! دیکھو پردہ اٹھا ہوا ہے۔ اسے ذرا سی ڈالو ———

مس پرکن۔ عام لوگ اندر دیکھیں گے۔

مسٹر پرکن۔ نہیں ——— تو ——— اس وقت آمد و رفت بہت کم ہے۔

(مسٹر پرکن کی کرسی پر بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ جاتی ہے۔)

مسز پرکن۔ ستو! کوئی دوڑا جا رہا ہے؟

(کوئی شے کھڑکی کے شیشے کو توڑ کر اندر گرتی ہے۔ اور شیشہ چکنا چور ہو جاتا ہے۔)

مس پرکن۔ اف خدایا!

مسز پرکن۔ رحم خدایا!

مسٹر پرکن۔ (اٹھ کر) کیوں؟ کیا ہوا؟ کہیں آگ تو نہیں لگ گئی؟

مسز پرکن۔ لڑکوں کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔ اٹھو! دوڑ کر جانے نہ پائیں

مسٹر پرکن۔ کیا؟ کہاں؟

مس پرکن۔ نہیں ابا جی! ہمیں تنہا چھوڑ کر آپ باہر نہ جائیں۔ یہ لڑکے نہیں ہو سکتے

مسٹر پرکن۔ (شیشے کو دیکھ کر۔ آنکھیں ملتے ہوئے) سخت نادانی ———

مس پرکن۔ باہر سے کسی نے پتھر مارا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ———

مسز پرکن۔ اب وہ بھاگ گئے ہوں گے۔ ہاں وہ پتھر کہاں ہے؟

مس پرکن۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔

مسز پرکن۔ (مسز پرکن سے مخاطب ہوتی ہے۔ تمہیں چاہیے تھا کہ باہر نکل کر انہیں پکڑ لیتے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ ———

مسٹر پرکن۔ یہ تو غضب ہے۔ کیا تم نے کسی کو دیکھا۔

مسز پرکن۔ ہاں! ایک سایہ سا دوڑا جا رہا تھا۔

مس پرکن۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ کہ شیشہ ٹوٹنے کے بعد میں نے کسی کے دبے پاؤں دوڑنے کی آواز سنی ہے۔

پرکن۔ یہ محض وہم ہے وہم۔ پالی۔ پردہ ڈال دو۔

مس پرکن۔ آپ ہی ڈال دیں۔

پرکن۔ میرا کہا مانو۔

مس پرکن۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔

مسز پرکن۔ ارے ——— ارے ——— مجھے دو

(وہ پردہ احتیاط سے لگا دیتی ہے۔ اور کوچے میں جھانکتی ہے)

مسز پرکن۔ آؤ "پتھر" تلاش کریں۔ جو شیشہ توڑنے کا باعث ہوا۔

مس پرکن۔ یہ ہے۔ (وہ اسے اٹھا لیتی ہے) مگر یہ تو ایک کانچ کا ٹکڑا ہے

پرکن۔ لاؤ تو دیکھیں۔

مسز پرکن۔ ہاں دکھاؤ نا۔

(وہ ہیرے کو روشنی کے نزدیک لے جاتی ہے) شاید یہ ہیرا ہو۔ دیکھو اس کی چمک دمک

پرکن۔ بکواس، محض احمقانہ خیال ———

مسز پرکن (آگے بڑھ کر) اسے چھپا لو۔

مس پرکن۔ اماں ——— اس سے کیا مطلب؟ تم یہ چاہتی ہو کہ ——— ———

مسٹر پرکن - ہاں! درست ہے۔

پرکن (آہستہ سے) یہ کیا ہے۔

مسز پرکن نہیں معلوم ہے ——

(وہ اسے اپنی ہتھیلی پر دیکھتی ہوئی) یہ تو وہی گمشدہ ہیرا معلوم ہوتا ہے

پرکن - تو پھر یہ خطرناک ہے۔

مسز پرکن - کوئی پرواہ نہیں۔

مس پرکن ہمیں کیا کرنا چاہئے —— اب ——

مسز پرکن - بس چپ رہو —— پالی ——

پرکن - میرا خیال ہے کہ ہم پولیس کو اطلاع کر دیں۔

مسز پرکن - نہیں۔

پرکن - اگر یہ ہیرا ہے اور وہی گم شدہ ہیرا تو ہماری شامت ——

مسز پرکن - مجھے اس کی قطعاً پرواہ نہیں۔

پرکن - مگر تم اسے کیا کرو گی۔

مسز پرکن لاؤ - اسے کلاک میں چھپا دیں - (وہ کلاک کا پچھلا حصہ کھول کر ہیرا اس میں چھپا دیتی ہے)

پرکن - اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔

مس پرکن - میں تو کہوں گی کہ اسے پھر گلی میں پھینک دو۔

مسز پرکن - نہیں! ہرگز نہیں۔

پرکن - تمہارا اب کیا خیال ہے۔

مسز پرکن - اس کا غیر متوقع طور پر مل جانا ہماری خوش قسمتی پر مبنی ہے - اور ہمارا فرض ہے کہ اس کی حتی الوسع حفاظت کریں۔

پرکن - لیکن ——

مس پرکن - اف —— اماں جان ——

مسز پرکن - وہ شاید مکان کا پتہ پھر لگا لیں - کوچے کے سب مکان ایک ہی طرز کے ہیں - اس واسطے یہ ٹوٹا ہوا شیشہ باہر پھینک دینا چاہئے - پھر اس مکان کا کبھی پتہ نہ چلیگا۔

(وہ کوچے میں جھانکتی ہے - اور پھر ٹوٹے ہوئے شیشے کے ریزوں کو اکٹھا کرتی ہے - - - اور اپنی انگلی چوستی ہے)

پرکن - انگلی زخمی کر لی ہے نا؟

مسز پرکن - اس کی کوئی پرواہ نہیں - پالی - فرش سے تمام چھوٹے ذرات احتیاط سے اٹھا لو - دیکھو نشان تک باقی نہ رہے۔

(وہ اپنی انگلی چوستی ہے اور مس پرکن حکم بجا لاتی ہے)

پرکن - یہ اب تم کیا کر رہی ہو - تمہارا مدعا کیا ہے؟

مس پرکن - معلوم نہیں! اماں جان کو کیا ہو گیا ہے

مسز پرکن - پالی! گھبراؤ نہیں - تمام ذرات چن لئے۔

مس پرکن - ہاں جتنے مجھے ملے ہیں - میں نے چن لئے ہیں۔

مسز پرکن اف ایک ٹکڑا باہر بھی گرا پڑا ہے - جاؤ اسے بھی اٹھا لاؤ - اچھا نہیں —— باہر مت جاؤ۔

پرکن - (گھبرا جاتا ہے) ادھر بات سنو - تمہارا اس سے مدعا کیا ہے؟

مسز پرکن - ادھر دو . . . .

(وہ تمام شیشے کے ٹکڑوں کو لے کر صوفے کے پیچھے چھپا دیتی ہے کھڑکی کے ساتھ کان لگا کر سنتی ہے اور پھر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

اب اگر کوئی آئے - تو یاد رکھو - ہمیں اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں

پرکن - یہ تو آنے والے پر منحصر ہے - کیوں یا نہیں؟

مسز پرکن - نہیں۔

پرکن - اگر پولیس آن دھمکے تو پھر!

مسز پرکن - تو پھر کیا - وہی "ہمیں کیا معلوم"

پرکن - مگر تم کیا کر رہی ہو - تمہارا مطلب کیا ہے؟

مسز پرکن - میرا مطلب؟ تم سادہ لوح ہو - یہ ہماری زندگی میں ایک سنہری موقع ہے - اسے میں جانے نہیں دونگی - سمجھے؟

پرکن - تم اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتی ہو؟

مسز پرکن - میں اسے تھوڑا تھوڑا کاٹ کر جنوبی امریکہ میں فروخت کرونگی۔

مس پرکن - اف اماں! تم کیسے فروخت کر سکتی ہو؟

مسٹر پرکن - حواس تو بجا ہیں کیا؟

مسز پرکن - ہاں! میں ان باتوں کو خوب سمجھتی ہوں - تم سے بہتر۔

پرکن - میں نے سنا تھا - کہ عورتیں مردوں کی طرح ایماندار نہیں ہوتیں - اور مجھے آج اس کا ثبوت مل گیا۔

مسز پرکن - مجھے کیسے معلوم ہو - کہ تم ایماندار ہو۔

پرکن۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی غیر کی چیز کو بری نگاہ سے کبھی نہیں دیکھا!

مسز پرکن۔ لیکن ہیں ـــــ میں یہ ہیرا کبھی نہیں دونگی کبھی نہیں چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے۔ میں نے اپنی زندگی مالی مشکلات میں گزاری ہے اور اب ـــ اب میں اس موقع کو ہاتھوں سے جانے دوں ـــ میں بیوقوف نہیں۔

مس پرکن۔ میرا خیال تھا۔ کہ آپ ایماندار ہیں۔

مسز پرکن۔ ایماندار! اس دنیا میں کوئی شخص ایماندار رہکر خوشی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ بس تم خاموش رہو۔

پرکن۔ اور اگر یہ سردار ناظم خاں کا ہو تو پھر ـــــ

مسز پرکن۔ اس نے کسی پر ظلم کیا ہوگا اور یہ چھینا ہوگا۔ اب یہ میرے پاس ہے۔ خدا نے دیا ہے۔

مس پرکن۔ مگر یہ تمہارے پاس تو نہ رہ سکیگا۔

پرکن۔ تمہاری والدہ نے مجھے سخت متعجب کر دیا ہے ـــ اف ـــ

مسز پرکن۔ کل صبح تمہارا پہلا کام یہ ہوگا۔ کہ جنوبی امریکہ کے جانیوالے تمام جہازوں کے نام معلوم کرکے لاؤ۔

پرکن۔ ہوش میں آؤ۔

مسز پرکن۔ اچھا ـــ میں اکیلی جاؤں گی ـــــ

پرکن۔ یہ خطرناک بات ہے ـــ اگر پولیس نے ـــــ

مسز پرکن۔ مجھے کسی کی پرواہ نہیں ـــ میں امریکہ جاؤں گی ـــ پیاری پالی! تمہارے لئے ہیرے۔ ریشمی لباس ـــ ہر قسم کا عیش مہیا ہوگا ـــ

پرکن۔ امریکہ ـــ اس شخص بلفور مشہور ڈاکو کی طرح۔

مس پرکن۔ اسے پولیس گرفتار کرکے واپس لائی تھی نا؟

مسز پرکن۔ میں کوئی بیوقوف نہیں۔ میں خاطر خواہ انتظام کروں گی۔ آہا۔ ہم سب عیش کی زندگی بسر کریں گے۔

پرکن۔ یہ سراسر بے ایمانی ہے۔ تم سراسر بک رہی ہو۔

مسز پرکن۔ نہیں ـــ ہم اسے ہر اتوار کو دیکھا کریں گے۔ اف اس وقت میرا دل کتنا شاد ہے۔

مس پرکن۔ یہ ہیرا اپنے پاس رکھ کر ہم کبھی بھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتے۔

مسز پرکن۔ میں ایسی محفوظ رہنے سے باز آئی۔ حیرانگی کی بات ہے۔ کہ اب تک کوئی نہیں آیا۔ یہ خداداد تحفہ ہے۔

پرکن۔ تو ـ یہ تحفہ ہمیں خراب کریگا۔ پولیس ہمارا پیچھا نہ چھوڑیگی۔

مسز پرکن۔ پولیس کو بیشک آنے دو۔ میں سب سے نپٹ لونگی

(گھنٹی بجتی ہے۔ اور وہ سب خاموش ہو جاتے ہیں)

مسز پرکن۔ سنو۔ جیسے میں کہوں۔ ویسے ہی کرنا ہوگا۔ بس خاموش اور یاد رکھو۔ "ہمیں اس کا کوئی علم نہیں"

[گھنٹی پھر بجتی ہے

پرکن۔ باہر کون جائے۔

مسز پرکن۔ میں جاتی ہوں۔ مگر یاد رکھو "ہمیں کوئی علم نہیں"

[وہ باہر جاتی ہے

پرکن۔ اف۔ خدا اسے غارت کرے

مس پرکن۔ کیا میں اسے کھڑکی سے باہر پھینک دوں۔

مسٹر پرکن۔ نہیں نہیں! تمہاری ماں خفا ہوگی۔ رہنے دو۔ شاید یہ صرف شیشے کا ٹکڑا ہی ہو۔ اسے ذرا خوش ہو لینے دو۔

مسز پرکن۔ (باہر سے) نہیں تم اندر نہیں جا سکتے۔

اجنبی۔ ذرا معاف رکھیئے گا۔

مسز پرکن۔ پالی کے ابا! یہ شخص بزور اندر گھسا چلا آتا ہے۔

[مسز پرکن اور بلند قامت۔ سیاہ فام اجنبی داخل ہوتے ہیں مسز پرکن اسے روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن وہ زور سے آگے بڑھتا آتا ہے۔ وہ فوراً نرمی کا طریقہ اختیار کر لیتی ہے۔]

مسز پرکن۔ مگر تمہارا اس طرح بغیر اجازت کے گھس آنے کا مطلب تم ہو کون؟ اور تمہارا یہاں کیا کام؟

اجنبی۔ معزز خاتون میں آپ سے اپنا مدعا عرض کر چکا ہوں۔

مسز پرکن۔ واقعی یہ ایک عجیب افسانہ ہے۔ تمہارا لڑکا اور اس کے کھیلنے کی کانچ کی گولی ـــ واہ خوب۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ کہ ہمیں اس کا کوئی علم نہیں۔ پالی کے ابا! کیا ہمیں اس کا کچھ پتہ ہے؟

[وہ اجنبی کی پشت کے پیچھے سے اسے مکا دکھاتی ہے]

پرکن (گھبراکر) ہاں! یہ کیا معاملہ ہے؟
مس پرکن- آہ-- اماں جان--
مسز پرکن- بکواس مت کرو- بات کرنے دو-
اجنبی- (پرکن سے مخاطب ہوتا ہے) میں بغیر اجازت آنے پر سخت نادم ہوں- لیکن میری ایک شے آپ کے کمرے میں گری ہے-
مسز پرکن- یہ محض جھوٹ ہے- تمہاری چیزیں اور ہمارے کمرے میں! جاؤ اپنا کام کرو-
پرکن- ہاں وہ کیا ہے۔
اجنبی- جناب میں عرض کر چکا ہوں- کہ میرے لڑکے نے بلوری گولی کو زور سے پھینکا اور اچانک وہ آپ کی کھڑکی کے شیشے میں لگی- مجھے واقعی افسوس ہے- میں شیشے کے دام ادا کرنے کو تیار ہوں- مگر وہ گولی مجھے ضرور چاہئے- برائے مہربانی جلدی کیجئے ——— میرے پاس وقت نہیں ———
پرکن- اور تمہارا لڑکا کہاں ہے؟
اجنبی- وہ گلی کی نکڑ پر کھڑا رو رہا ہے-
مسز پرکن- کیا تم امید کرتے ہو- کہ اس بناوٹی کہانی کو کوئی باور کر سکتا ہے-
اجنبی- لاؤ- جلدی مجھے دو- جلدی کرو جلدی! میں تمہارا بہت لحاظ کر چکا-
(وہ کمرے کے چاروں طرف غور سے دیکھتا ہے- اور کھڑکی کی طرف بڑھ کر پردے کو ہٹاتا ہے)
مسز پرکن- یہ کیا کر رہے ہو- تمہیں کسی چیز کو ہاتھ لگانے کا مجاز نہیں- باہر نکلو——— جلدی-
مسٹر پرکن [مسز پرکن کو ایک طرف ہوکر] یہ بات تمہارے شایان شان نہیں- باز آؤ-
اجنبی- یہ دیکھو- یہ شیشہ- شکستہ--
مسز پرکن- کیا شیشہ
اجنبی- کھڑکی کا شیشہ-- ہاں مجھے یقین تھا- کہ یہی مکان ہے-
مسز پرکن- واہ! یہ تو بات ہی----
مس پرکن- اماں-- بتاتی کیوں نہیں کہ----
مسز پرکن- ہاں میں اسے بتائے دیتی ہوں [لڑکی کی طرف غصے کی نگاہ سے دیکھتی ہے] یہ میری لڑکی کے کمرے کو ہوادار بنانے کے نئے طریقوں میں سے ایک ہے- یہ اس کی مرضی ہے- اسے ٹوٹے ہوئے آج پندرہ دن ہو چکے ہیں- نہیں نہیں آج جمعہ ہے-- تقریباً مہینہ ہونے والا ہے-
اجنبی- بس! زیادہ باتیں مت بناؤ- لاؤ وہ ہیرا کہاں ہے-
مسز پرکن- (چلاکر) ہیرا!!!
اجنبی- میں تم سب کو متنبہ کرتا ہوں- کہ تمہاری زندگی سخت خطرے میں ہے- تمہارے پاس سردار ناظم خاں کا ہیرا ہے- سُنا؟
پرکن- مگر وہ ہمارے پاس کہاں سے آگیا-؟
اجنبی- چور کا تعاقب کیا جا رہا تھا- اس نے اندر پھینک دیا-
پرکن- چور نے ہمارے کمرے میں خاص کر کیوں پھینکا؟
اجنبی- بیوقوفوں کی طرح باتیں مت بناؤ-
مسز پرکن- تم کون ہو؟
اجنبی- میں- میں- سردار ناظم خاں کا ملازم ہوں- جانتی ہو!
مسز پرکن- ثابت کرو-
اجنبی- بس کافی ہو چکی-
[اجنبی یکایک جیب سے پستول نکالتا ہے- لڑکی چیخ اٹھتی ہے مسٹر پرکن کرسی میں سکڑ کر بیٹھا رہتا ہے- مگر مسز پرکن اس طرح مستقل کھڑی رہتی ہے]
مسٹر پرکن- اف!
اجنبی- (پستول کو میز پر ٹھکراتے ہوئے) کہاں ہے- بولو! بتاؤ- جلدی
مسز پرکن- میں تمہیں بتائے دیتی ہوں-
اجنبی- ابھی ——— فوراً
مسز پرکن- میں نے اسے نگل لیا ہے--
اجنبی- نگل لیا ہے-- مجھ سے مذاق مت کرو- مجھے دیر ہو رہی ہے-
مسز پرکن- مجھے اس بات کا خیال ابھی اخبار پڑھتے ہوئے آیا تھا- کہاں ہے وہ اخبار! (مسٹر پرکن کی طرف مخاطب ہوکر)
"ایک لڑکا شلنگ نگل گیا" (اجنبی سے) کیا تم نے نہیں پڑھا-
اجنبی- (دوسروں سے) کیا یہ درست ہے؟

پرکن۔ بھائی میں تو سویا ہوا تھا۔

اجنبی۔ تو تمہارا یہ مطلب ہے کہ ــ ــ ــ ؟ نہیں جلدی ہیرا پیدا کرو۔

مسز پرکن۔ میں ابھی بتا چکی ہوں ــ ــ

اجنبی۔ تم حلفیہ کہہ رہی ہو ــ ؟

مسز پرکن۔ ہاں! کیا تمہیں ایک شریف خاتون کے الفاظ پر اعتبار نہیں آتا؟

اجنبی۔ خدا تمہیں غارت کرے! اب ہمیں تمہارا پیٹ چاک کرنا پڑیگا۔

مسز پرکن۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں! یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔؟

اجنبی۔ میری مراد آپریشن سے ہے۔

مسز پرکن۔ میں یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ تم جا کر کیوں نہیں کہہ دیتے۔ کہ ہیرا گم ہو گیا ہے

اجنبی۔ بدقسمت خاتون! کیا تمہیں معلوم نہیں۔ کہ تمہاری زندگی اس بیش بہا ہیرے کے مقابلے میں کیا وقعت رکھتی ہے ــ ــ ــ کچھ بھی نہیں ــ ــ تمہاری اب خیر نہیں۔ اگر تم نے واقعی کھا لیا ہے۔ تو میں تمہارا ابھی خاتمہ کرتا ہوں۔

(پستول کی نالی اس کی طرف سیدھی کرتا ہے)

مس پرکن۔ او ــ نہیں ــ نہیں ــ اماں ــ ــ

مسز پرکن۔ بیوقوف ــ کیوں! کیا ہے؟

مس پرکن۔ اف اماں!

پرکن۔ اب کیا کرنا چاہیے۔

مسز پرکن۔ بس اپنی زبانوں کو لگام دو۔ اور تم دونوں سے کیسی توقع؟

مس پرکن۔ اماں! دے دو۔ بس!

مسز پرکن۔ چپ اسے بہت جلدی ہے۔ یہ ضرور چور ہوگا۔

اجنبی۔ خدا کی لعنت ــ ــ ــ تم پر ــ میرا وقت ضائع ہو رہا ہے۔

[وہ کلاک کی طرف دیکھتا ہے۔ اور اپنی گھڑی نکالتا ہے]

تمہارا کلاک پیچھے ہے۔ یہ تو بند ہو گیا معلوم ہوتا ہے۔

مس پرکن۔ ضرور بتاؤ۔ برائے خدا ــ اماں ــ بتا دو ــ

پرکن۔ او ہوں!

اجنبی [دیکھتا ہے۔ کہ پرکن کا چہرہ سرخ ہو گیا ہے] کلاک بند کیوں ہو گیا۔

مس پرکن۔ وہ دے دو۔

مسز پرکن۔ پالی ــ تم بہت بے حیا ہو ــ بس خاموش رہو۔

[ایک آدمی کھڑکی سے باہر شیشے میں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن وہ اسے دیکھ نہیں سکتے۔]

اجنبی۔ کیا میرا ہیرا کلاک میں تو نہیں [وہ آگے بڑھتا ہے

مسز پرکن۔ بس بہت ہو چکی۔ میری چیزوں کو ہاتھ لگانے کا تمہیں مجاز نہیں سمجھے! ــ [وہ اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے]

اجنبی۔ [پستول کی نال اس طرف کرتے ہوئے] ایک طرف ہٹ جاؤ ورنہ ــــــــ

مسز پرکن۔ تم میرے مکان سے باہر نکلو۔

اجنبی۔ [جھجکتا ہے۔ اور پھر پستول لڑکی کی طرف کرتا ہے] کیا میرا اس میں ہے؟ جلدی جواب دو

[لڑکی چلا اٹھتی ہے۔ کوئی شخص پستول کی نالی ٹوٹے ہوئے شیشے سے اندر کرکے فائر کرتا ہے۔ اجنبی کے ہاتھ سے پستول گر جاتا ہے آدمی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر اندر آ جاتا ہے]

مس پرکن۔ آہ ــ البرٹ!

[اجنبی جلدی سے بتی بجھا دیتا ہے۔ اندھیرا چھا جاتا ہے اور ہل چل مچ جاتی ہے۔ بتیاں پھر جلائی جاتی ہیں۔ اجنبی اور کلاک غائب ہوتے ہیں۔ مسز پرکن کرسی پر متمکن ہے]

البرٹ۔ ہیرا کہاں ہے؟ پرکن۔ وہ تو کلاک میں تھا۔

البرٹ۔ کلاک میں! ہاں تو کلاک کہاں ہے؟

مس پرکن۔ آہ ــ البرٹ

پرکن۔ ہاں وہ کلاک لے کر بھاگ گیا ہے

مسز پرکن۔ نہیں۔ یہ میرے پاس ہے۔

[وہ اپنے غرغل کے نیچے سے کلاک نکالتی ہے۔ اسے کھول کر ہیرا ہاتھ میں لے لیتی ہے]

کیا وہ اجنبی پھر آئے گا۔ البرٹ۔ نہیں۔

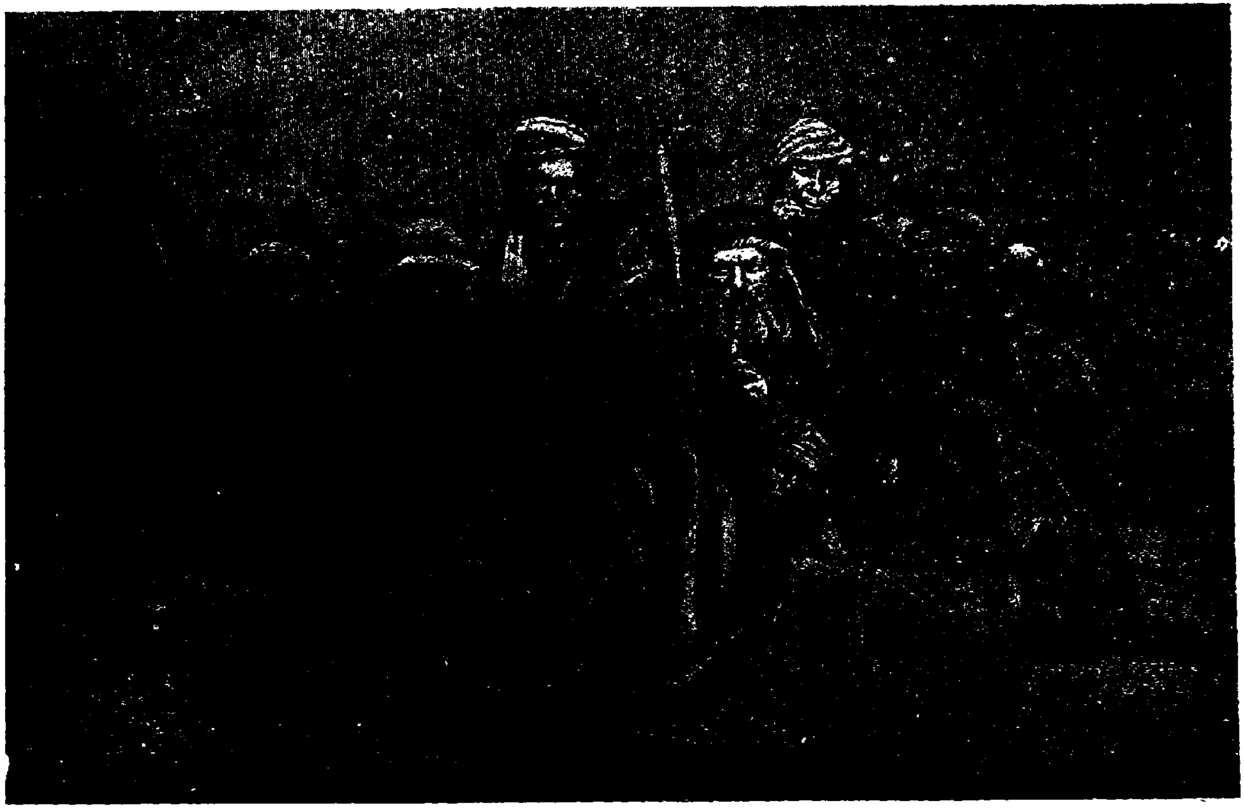
مسز پرکن۔ تمہیں کیسے معلوم ہے۔ البرٹ۔ مجھے یقین ہے۔

مسز پرکن۔ پالی! اس شیشے پر پردہ ڈال دو۔

مس پرکن۔ نہیں! ــ مجھے ڈر لگتا ہے۔

البرٹ - یہ ہیرا میرے حوالے کر دو - ہاں جلدی!
مسز پرکن - آہ - مگر تم یہاں کیسے آ گئے؟
البرٹ - جلدی دو - یہ میرے لئے بہت مفید ثابت ہوگا -
مسز پرکن - مجھے بھی نقصان نہیں دیگا لیکن مجھے یہاں ہیرا نہیں چاہئیے۔
مس پرکن - کیوں؟
مسز پرکن - پاتی! جلدی دوسرے کمرے میں جاؤ - میری بیگ میں میری ضروری اشیا بند دو؟
مس پرکن - مگر تم کر کیا رہی ہو — اماں۔
مسز پرکن - البرٹ اب باتیں کرنے کا وقت نہیں ہم — ب — —
البرٹ - ہاں واقعی - لیکن ادھر دیکھو نا؟ — — — — —
مسز پرکن - واقعی جنوبی امریکہ اس کام کے لئے نہایت مناسب جگہ ہے۔ یا ہم فرانس کو چلیں۔ آج آدھی رات کی گاڑی سے مجھے ضرور چلا جانا چاہئے - اس کمرے کی بتی بجھا دو - کیا سامنے کا دروازہ بند ہے؟
مسز پرکن ذرا ٹائم ٹیبل تو دیکھنا؟ ——
[وہ جانے کو اٹھتی ہے - البرٹ اس کے دامن کو پکڑ لیتا ہے]
البرٹ - مجھے ہیرا دیکر جاؤ -
مسز پرکن - ہرگز نہیں - نہیں دوں گی - ایسے جواہرات انہیں کا حصہ ہوتے ہیں - جو دلیری و ہمت سے کام لیں - ہاں یہ ہیرا میرا ہے دیکھو کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے - اگر لندن کی پولیس میرا تعاقب کرے - تب بھی میں اسے دینے کو تیار نہیں ہوں -
البرٹ - تمہیں شاید معلوم نہیں - کہ میں جاسوس ہوں -
مسز پرکن - کیا کیا —— جاسوس ——
مس پرکن - آہ البرٹ ——
البرٹ - کیا تمہیں علم نہ تھا - کیا تم اتنی بات بھی نہ سمجھ سکے - - تم نے مجھے کیا خیال کر رکھا تھا؟
مسز پرکن - تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ ——
البرٹ - میں اس ہیرے کو لے کر جا رہا تھا - اتنے میں بدمعاشوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا -
مس پرکن - ہائے! چوروں نے -
پرکن - تو وہ بدمعاش بھی انہیں میں سے ہوگا - لیکن اندر کیسے آگیا؟

البرٹ - میں نے پھینکا تھا -
پرکن - تم نے - - کیوں!
البرٹ - کیونکہ وہ میرے تعاقب میں تھے - میں مکان سے خوب واقف تھا - اسواسطے میں نے پھینک دیا -
مس پرکن - آہ - البرٹ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟
البرٹ - نہ بتانے کی وجوہات تھیں -
مسز پرکن - تو — تم ایک مشہور جاسوس ہو —! ؟
البرٹ - ہاں! مجھے ہیرا جلدی دو — دیر ہو رہی ہے -
مسز پرکن - دیکھو - یہ کیسا چمکتا ہے - اسے دیکھکر کون ایماندار رہ سکتا ہے -
مسٹر پرکن - یہ میرا "ہیرا" ہے -
مس پرکن - مجھے اماں کی باتوں سے شرم آ رہی ہے -
البرٹ - کیا تم مجھے خود دوگی یا میں — ——
مسز پرکن - تو کیا؟
البرٹ - [البرٹ ایک سیٹی جیب سے نکالتا ہے] میں تمہیں خود نہیں لگانا چاہتا -
مسز پرکن - یہ بات ہے -
البرٹ - ہاں یہی بات ہے -
مسز پرکن - تو پھر جس راستے سے یہ آیا ہے اسی راستے سے جائیے -
[وہ ہیرے کو زور سے پھینکتی ہے - ایک دوسرا شیشہ چکنا چور ہو کر گر پڑتا ہے] -
پرکن - لو ایک اور شیشہ!
مس پرکن [کھڑکی کے نزدیک جاتی ہے] ہاں اس نے تلاش کر لیا ہے - ایک سپاہی بھی اسکے ساتھ ہے میں حیران ہوں - کہ البرٹ کیا خیال کرتا ہوگا؟
مسز پرکن - چلو شکر ہے؟ وہ میرا منگیتر تو نہیں —— مجھے کیا فکر ——
پرکن - تم میں ایمانداری کا شمہ تک نہیں —— تم ——
مس پرکن - واقعی سخت شرم کی بات ہے -
مسز پرکن - اس کی کتنی قیمت ہوگی - - - پاتی پردے ڈال دو - ورنہ اچھی طرح سے - ٹوٹے ہوئے شیشوں سے سرد ہوا آ رہی ہے -
پردہ گرتا ہے -



علاقۂ شام کے بدوی مرد


ASGHAR ALI MOHAMMED ALI
Manufacturing Perfumers
AND BRANCHES
اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو
تار کا پتہ "حنا"
ٹیلیفون نمبر ۱۳۹

مناظرِ صبح

میرے عزیز دوست جناب نصرت آروی بے نظیر شاہ صاحب کے مفصل حالات معلوم کرنے کی تمنا رکھتے ہیں، اگر کوئی صاحب شاہ صاحب اور ان کے دیوان "کلامِ وارث" کے متعلق واقفیت رکھتے ہوں تو وہ بذریعہ رسالہ عالمگیر مطلع فرمائیں (مدیر)

پلا ساقیا وہ صبوحی مجھے
کروں غرغرہ آب کوثر سے آج
وہ مئے ہو ہیولیٰ جس کو سن کر اذاں
ہوئی صبح خنداں جو پرتو فگن
بیاضِ سحر میں جو پھولی شفق
سحر کا جو دمکا سمانے لگا
ستارے جو تھے زیبِ بزمِ فلک
وہ ایک ایک کر کے روانہ ہوئے
ستارے جو باقی رہے خال خال
جو تل کی طرح جا بجا پا گیا
جو نجمِ سحر بھی لجانے لگا
شفق میں ہے جو رنگِ صبحِ امید
کیا کارواں نے نہ شب کو مقام
ستارے جو تھے چرخ پر جلوہ گر
گری صورتِ اشک جو خاک پر
یہ سب مشتری ہو گئے جب نہاں
سحر کا عمل حسبِ مرضی ہوا
ضیا صبح کی پھیلی اطراف میں
شفق پھول کر رنگ لانے لگی
اڑا ہر طرف رنگِ صبحِ بہار
نمایاں ہوئے خوب آثارِ صبح
ہوا صبحِ صادق کا جس دم یقیں
کوئی شاخِ گل کی طرح جھومتا
اٹھا کوئی سرگرمِ حمد و سپاس
اٹھے شہر کے زاہد و حق پرست

کہ حاصل ہو تا قوتِ روحی مجھے
اٹھوں نشہ آلود بستر سے آج
برنگِ ہوائے سحر ہوں رواں
پریشاں ہوئی چرخ کی انجمن
ہوا رنگ تاروں کا اک بار فق
فلک پہ افشاں چھڑانے لگا
جھپکتی رہی جن کی آنکھ دم پلک
سحر ہوتے ہی سب فسانہ ہوئے
نہ ان کا رہا کچھ کسی کو خیال
انہیں جن کے مرغِ سحر کھا گیا
قمر اپنا بستر اٹھانے لگا
ہوا جاتا ہے چہرۂ مہ سفید
پسینے پسینے تھا اس سے تمام
پسینے کے قطرے تھے وہ سر بسر
وہ شبنم کے قطرے بنے سر بسر
بڑھائی قمر نے بھی اپنی دکاں
خطِ کہکشاں خطِ فرضی ہوا
شبِ ہجر جا کر چھپی قاف میں
نئی آگ دل میں لگانے لگی
فلک پر کھلا یک بیک لالہ زار
جہاں میں ہوا گرم بازارِ صبح
تو بستر سے اٹھنے لگے نازنیں
اٹھا کوئی ساغر کا منہ چومتا
کوئی نیند کی جھونک میں بدحواس
اٹھے رند میخانہ ساغر بدست

شبِ ہجر سے ڈرنیوالے اٹھے
اٹھے رہ نشینانِ کوئے بتاں
کسی کو کوئی گدگداتا اٹھا
گجر صبح کا غل مچانے لگا
سب اٹھے نہ جاگا یہ بختِ عدو
طیور آشیاں سے نکلنے لگے
یہ اٹکھیلیوں پر نسیمِ سحر
اڑی پھرتی ہے آج گل کی شمیم
کھلے پھول غنچے چٹکنے لگے
یہ شبنم سے تازہ ہیں رخسارِ گل
ہیں سبزے پہ قطرے بچھائے ہوئے
ہر اک شے پہ چھایا ہے جو رنگ و بو
سہانی سحر یہ سہانی فضا
کہیں نغمہ زن طوطیِ خوش مقال
اٹھی ہر طرف چہچہوں کی صدا
غرض اپنی اپنی زباں میں طیور
یہ دیکھا ہی تھا چشمِ ادراک نے
سنہری شعاعوں کے نیزے لئے
شفق کے پھریرے اڑے چرخ پر
ہوئی اشکِ شبنم سے تر گل زمیں
ہوا ختم چھڑکاؤ کا انتظام
یہ نہروں میں عکسِ شفق کا نشاں
شعاعوں کی پانی پہ چنگاریاں
کسی کے کوئی دیکھنے کے لئے

شبِ وصل پر مرنے والے اٹھے
اٹھے ساکنانِ درِ دلستاں
کوئی منہ چھپا کر لجاتا اٹھا
جو سوتے ہیں ان کو جگانے لگا
بنا جال کے سبزہ لبِ آبجو
سمن بر روِش پر ٹہلنے لگے
کہ آتے ہیں جھونکوں پہ جھونکے ادھر
کھلاتی ہے غنچوں کو موجِ نسیم
چمن کے چمن لو مہکنے لگے
کہ انجم ہوئے زیبِ دستارِ گل
کہ مخمل پہ موتی بچھائے ہوئے
ہے سکتے میں آئینۂ آبجو
یہ مرغانِ خوش نغمہ و خوشنوا
کہیں نالہ کش بلبلِ خستہ حال
فغانِ عنادل نے باندھی ہوا
ہیں سرگرمِ تسبیحِ ربِ غفور
پڑھی آیۂ فتحِ افلاک نے
ہراول بڑھا ہے لشکرِ صبح کے
شعاعوں نے گاڑی علمہائے زر
پھواریں بھی کھر کی گرنے لگیں
ہوا صاف مطلعِ سحر کا تمام
لگی آگ پانی میں اللہ کی شان
ہیں سطحِ بلوریں پہ گلکاریاں
وہ جھانکا دریچے سے افلاک کے

(بینظیر شاہ)

(مرسلہ نصرت آروی)

خمریاتِ ایران

از جناب مرزا عاشق علی بیگ صاحب خیال مرادآبادی۔

قدیم شعرائے عرب کی شاعری ان کی سادی زندگی، اور سیدھے سادھے جذبات وخیالات کا آئینہ ہے۔ وہ اپنے محسوسات کو حقیقت کے بہت قریب رہ کر بیان کرتے ہیں۔ تشبیہ واستعارہ کا رنگ اس میں اتنا ہی ہوتا ہے کہ جس سے کلام میں ملاحت ورنگینی پیدا ہوجائے ـــــ عرب کے جنگجو اگرچہ رزم کے سوا بزم کے مردِ میدان نہ تھے لیکن جب کشمکش حیات کی مصروفیتوں سے فرصت میسر آئی تھی تو کسی نخلستان یا آب وگیاہ قطعہ زمین پر بیٹھکر دادِ نوشانوش اور جوش وخروش دیا کرتے تھے ـــــ آغاز اسلام نے اگرچہ عرب کی شاعری کا ساز خاموش کردیا تھا۔ لیکن اس کے تاروں میں ابھی تک لرزش باقی تھی۔ اسلام کی بدولت جب عربوں کو شہنشاہیت کی ابتدا ہوئی . . . . ریگستان عرب کی خشکی کے بجائے ایران وشام اور مصر کی "نزہت وتازگی زا" شادابیاں میسر ہوئیں ـــــ تو عرب شاعری کے نغماتِ خوابیدہ پھر بیدار ہوگئے مگر اب یہ نغمات زیادہ رسیلے اور بلا کے اثر انگیز تھے۔ خیالات میں تنوع اور تشبیہ واستعارات میں وسعت اور قدرت پیدا ہوچلی تھی ـــــ سلطنت نے فراغت اور عیش کے مواقع بہم پہونچا دیئے تھے۔ شراب حرام ہوچکی تھی۔ لیکن "وصف خمر" باوجود اس کی حرمت کے محض شاعرانہ رسم کے طور پر شعرائے اسلام میں موجود تھا۔ اگرچہ شراب وساقی کی مدح سرائی زندگی کے ایک حقیقی جُز کی طرح بیان حقیقت کا مرتبہ نہیں رکھتی تھی۔ تاہم بزمیہ نظم کا ایک فنی شعبہ ضرور تھی ـــــ شعرائے عہد عباسیہ نے اس میں جو ترقی وکمال دکھایا وہ حقیقتاً "بن پیئے" کی مستی تھی ـــــ جاہلی عربوں میں سے عدی بن زید اور عبید بن الابرص تو پیتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے آپ بیتی سناتے تھے۔ لیکن اسلامی شعراء میں سے مسلم بن الولید وغیرہ نے بحیثیت "شعبۂ فن" اس صنف میں جو طبع آزمائی کی اگر ان کو یکجا فراہم کیا جائے تو اچھے خاصے ساقی نامے بن سکتے ہیں ـــــ اس فن میں متفقہ طور پر امامت کا درجہ ابونواس کو حاصل ہے۔ جس نے خمریات کو اپنا پیغام شاعری بنالیا تھا۔ اس نے اور ابن المعتز عباسی نے اپنے دیوانوں میں "خمریات" کے مستقل ابواب یادگار چھوڑے ہیں۔ جن میں سے دوسو پچیس نظمیں ابونواس اور سوا سو سے زائد نظمیں ابن المعتز کی موجود ہیں۔ وصف خمر، وصف ظروف خمر، وصف ساقی، وصف مجالس غنیاں، ذکر نغمہ وعود نائے . . . . قدرتی یا تخیئلی مناظر باغ وبہار، جن کے پاس میخواروں کے جمگھٹے ہیں ـــــ یہ وہ مضامین ہیں جو خمریات عرب میں خاص ہیں اور ان تنوع کو تلاش کرنا بیکار ہے ـــــ فارسی شاعری، عرب شاعری کا دودھ پی کر بڑھی پلی ہے۔ اسواسطے اس میں بھی خمریات کی صنف کا بہت قدیم سے پتہ چلتا ہے۔ منوچہری دامغانی غالبًا سب سے پہلا فارسی شاعر ہے جس نے اس سلسلہ میں بکثرت اشعار کہے ہیں۔ عرب شعراء کے تتبع میں اس نے خمریات کے باب میں پوری نظمیں لکھی ہیں۔ یہی نہیں کہ اس نے قصائد کی تشبیب میں خمریات کے طرز پر شعر کہے ہیں بلکہ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر مسمطات میں بھی ایسے شعر بہت سے نظم کئے ہیں ـــــ "مسمط صبوحیہ در طلب جام ومخاطبہ ساقی سیم اندام ومدح ممدوح" میں اس نے اس انداز سے شعر لکھے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے گویا ابونواس پھر زندہ ہوگیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ کیجئے ؎

بیک قطرہ بر کفم بر چکید — کف دست من گشت چوں کوثری
بہ تسنیم اور او زاں لبِ او — برآمد ز ہر موئے من عبہری
لب اغر لبِ خویش کردم فراز — مرا ہر بلے گشت چوں شکری

غرض اس قسم کے بہت سے اشعار دامغانی کے ہاں بھی آپ کو ملیں گے ——— مگر اصطلاح میں "ساقی نامہ" کا نام اس نظم کے ساتھ مخصوص ہے جو "مثنوی" کے طرز اور بحر متقارب میں ہو — ملا عبد النبی موعف میخانہ نے شعرائے فارس کے بہت سے ساقی نامے ترتیب دیکر میخانے سجائے ہیں۔ ہم نے ناظرین عالمگیر کی دلچسپی کی خاطر صرف چند مشہور اور صاحب طرز شاعروں کے ساقی ناموں سے بہترین اشعار انتخاب کر کے اسی فرصت میں ایک پیمانہ بھرا ہے۔ امید کہ علم و ادب کے خراباتیوں کے لئے لطف و سرور سے خالی نہ ہوگا۔

نظامی۔ خسرو۔ حافظ۔ پرتوی کے ساقی نامے چونکہ قدامت اور فنی حیثیت سے مقابلہ میں پرلطف ہیں اسواسطے انہی کے انتخابات پر ہم نے اکتفا کیا ہے۔ رہا ظہوری کا ساقی نامہ سو اس میں چونکہ حافظ کا انداز ہے اس لئے نظر انداز کر دیا ہے۔ بعض علماً کا خیال ہے کہ خواجہ اور خواجو کے ساقی ناموں میں ناپائیداری عالم اور بے ثباتی دنیا، شکایت ابنائے روزگار کے مضامین کا زور ہے۔ لیکن ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ نظامی اور خسرو سے لے کر تمام ساقی نامہ گو شعرا کا بالکل یہی رنگ ہے۔ حافظ و خواجہ ہی پر اس کا کچھ حصہ نہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ فارسی شاعری میں "یاس" کا رنگ غالب ہے۔

میخانۂ نظامی

"سکندر نامۂ نظامی" فارسی علم و ادب کی مشہور ترین کتاب ہے بظاہر اس رزمیہ نظم میں ہنگامہ ہائے کارزار کی خونچکانی کے سوا اور کچھ نہ ہونا چاہئے۔ لیکن نظامی نے رزم کے میدان میں بھی بزم آراستہ کی ہے چنانچہ جب وہ کسی واقعہ کے بیان کو ختم کرتے ہیں تو ساقی و مطرب کو مخاطب کر کے "یک نغمۂ دلفریب" "یک جرعۂ جاں بخش" طلب کر کے تکان اُتارتے ہیں ؎

مغنی دلم در گشت از شکیب — سماعے دہ امشب مرا دلفریب
ترجمہ:- مغنی میرا دل بیگانۂ شکیب صبر ہو چکا ہے خدارا آج کی رات تو دلفریب نغمہ نوازی سے مسرور کر دے!

بیا ساقی آں شربتِ جانفزا — بمن دہ کہ دارم غمِ جاں گزا
ترجمہ:- ساقی مجھے وہ شربت جانفزا (شراب) دے جو غم جاں گداز و روح فرسا کی دوا ہو سکے!

جب وہ گردش چرخ سفلہ پرور کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ جاتے ہیں تو پکار اُٹھتے ہیں ؎

چہ بندیم دل در جہاں سال و ماہ — کہ ہم دیو خانہ است و ہم غول راہ
ترجمہ:- سال و ماہ کے ایرپھیر کی دنیا سے دل لگانا عبث ہے کیونکہ دنیا آسیب زدہ مکان کی کا آسیب اور ویران راستوں کی چڑیل ہے

اور بے ثباتی جہان ناپائیدار بے اختیار ان سے کہلواتی ہے ؎

دریں باغِ رنگیں درختے نرست — کہ ماند از جفائے تبرزن درست
ترجمہ:- دنیا کے رنگیں باغ میں ایسا کوئی درخت نہیں جو بڑھئی کے دست ستم سے محفوظ رہا ہو۔ یعنی دنیا کا ہر فرد تختۂ مشق ستم و جور رہتا ہے

اس وقت نظامی غم و افکار کے دفتر کو "غرق مئے ناب" کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں ؎

بیا تا ز بنیاد شوئیم دست — کہ بے بادہ نتواں ز بنیاد رست
ترجمہ:- ساقی آ تاکہ ہم غم دنیا سے آزاد ہو جائیں۔ اور یہ بات بغیر شراب پیئے ممکن نہیں ہو گی - اس لئے "پی اور پلا ساقی"!

نظامی میخانوں کا طواف نہیں کرتے وہ خاکِ درِ میکدہ نہیں بنتے۔ انکا شراب خانہ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں میں نہیں ہے ——— بلکہ ان کی بزم نشاط، بہار کی رنگینیوں، سبزہ و گل کی لطافتوں

میں جمتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں صفت میکدہ کی بجائے دامن چمن زار کی جلوہ ریزیاں نمایاں ہیں ؎

بیا باغباں خرمی ساز کن　　گل آمد در باغ را باز کن
بہ پیرامن برکۂ آب گیر　　ز سوسن بیفگن بساطِ حریر

ترجمہ:- باغباں تیار ہو اور خوشیاں منا! موسم بہار آگیا ہے باغ کا دروازہ کھول دے۔ لبریز حوض کے کنارے پر گل سوسن کی پتیوں کا ایک حریری فرش بچھا دے۔

مغنی! بیار آں نوائے غریب　　نوآئین تر از نالۂ عندلیب
نشاطِ غنا در من اورا پدید　　فراغت دہم زانچہ نتواں شنید

ترجمہ:- مغنی! کوئی ایسی نرالی دُھن الاپ جو نغمۂ بلبل سے بھی زیادہ انوکھی اور دلکش ہو موسیقی کی پرسرور کیفیات کی روح میرے جسم میں پھونک دے؛ تاکہ میں غم و فکر کی ناشدنی و ناشنیدنی باتوں کے سننے سے کچھ دیر کے لئے آزاد ہو جاؤں۔

اس کے بعد ساقی کی پکار ہوتی ہے۔ شراب مانگی جاتی ہے۔ ایسی ویسی شراب نہیں بلکہ ؎

بیا ساقی آں رنگ دادہ عبیر　　کہ رنگش ز خوں داد دہقانِ پیر
بیا ساقی! آں خونِ رنگیں رز　　در افگن بمغزم چو آتش بخز
بیا ساقی! آں زرِ بگداختہ　　کہ گوگرد سرخ است ازو ساختہ

ترجمہ:- ساقی عبیری رنگ کی شراب پلا! جس کو تجربہ کار بوڑھے دہقان نے سالہا سال کے تجربہ سے خون کو پانی کرکے رنگین بنایا ہو۔ میں انگور کا وہ رنگین خون نوش کروں گا جو میرے دماغ پر اس طرح چھا جائے جیسے ریشم میں آگ دوڑ جاتی ہے ہاں! شراب ایسی سرخ ہو جیسے پگھلا ہوا سونا ہوتا ہے اور جس سے گوگرد سرخ بنائی جا سکے۔

اب بادۂ شوخ و شنگ کا ذرا پیمانہ ملاحظہ ہو ؎

بیا ساقی! آں جامِ آئینہ فام　　بمن دہ کہ بردست شد جائے جام
چو زاں جام کیخسرو آئین شوم　　بداں جام روشن جہاں بین شوم
بیا ساقی آں آبِ جوئی بہشت　　در افگن بدیں جام آتش سرشت
بیا ساقی آں آبِ آتش خیال　　در افگن بدیں کہربا گوں سفال

ترجمہ:- ساقی آ! اور مجھے بلوریں گلاس دے۔ کیونکہ اب میں جام بدست ہو کر بیٹھنے کی فرصت کا مالک ہو گیا ہوں۔ اس جام کی وجہ سے کیخسرویت مجھ میں بھی پیدا ہو جائے۔ اور اس روشن جام میں دنیا کو دیکھ سکوں۔ ساقی اس جامِ آتش سرشت میں بہشتی نہر کا پانی (شراب) بھر کر لا۔ آتشیں خیال کی روح (شراب) اس زرد رنگ جام سفال میں اُلٹ دے!

"شراب آتشیں خیال" "جام آئینہ فام" میں ڈھل چکی ہے۔ حلق سے اُترتے ہی اُسے کیا دکھانا چاہئے؟ اس کی کیف بخشی و شور انگنی کیسی ہو؟ نظامی ہی کی زبان سنئے ؎

بیا ساقی آں مے کہ ناز آورد　　جوانی دہد عمر باز آورد
مگر نو کند عمر پیرِ مردہ را　　بجوش آرد ایں خونِ افسردہ را
بدہ تا جوانی در آید بچنگ　　دہد رنگِ آتش مرا آب و رنگ
مئے کو ست حلوائے ہر غم کشی　　ندیدہ بجز آفتاب آتشی
بیا ساقی آں ارغوانی شراب　　بمن دہ کہ تا مست گردم خراب
بیا ساقی آں آتشِ توبہ سوز　　با آتشکدہ مغزِ من بر فروز
بمجلس فروزی دلم خوش بود　　کہ چوں شمع بر فرقم آتش بود

ترجمہ:- ساقی وہ نزاکت آفریں شراب پلا جو شباب شور انگیز اور عمر رفتہ کو واپس لا سکے۔ پیرانہ سالی کے عہد کو تازہ و شاداب بنا دے۔ اور سرد خون کو رگوں میں کھولا دے۔ ہاں! پلا تاکہ جوانی قبضہ میں آجائے اور میرے رنگ و روغن میں شعلۂ آتش کا سا رنگ پیدا ہو جائے۔ ساقی وہ شراب پلا جو ہر غم کی تلخی کو فرو کرنے کے لئے پر حلاوت شیرینی ہے۔ اور جس کو آفتاب کی آتشیں حرارت نے تیار کیا ہے۔ گلابی شربت مجھے دے تاکہ آج مست و خراب ہو جاؤں۔ ساقی میرے شعلہ زار دماغ میں شراب سے نور پیدا کر جس کی تجلی خرمنِ توبہ میں آگ لگا دے مجھے خوشدلی اور مسرت سے بزم افروزی میں اس وقت مزا آئے گا۔ جب شمع کی طرح میری پیشانی پر شعلہ گذرتا ہو گا۔

ساقی چابکدست مصروفِ مے نوازی ہے، گلبانگ قلقل سے چمنستان کی فضا گونج رہی ہے "صہباپری" کی جلوہ ریزیاں ہو رہی ہیں۔ نظامی کا کام ودہن شادکام ہے۔ دور کشاکش نوشانوش ہے۔ کیف و بےخودی کے عالم میں نعرۂ مستانہ لگاتے ہیں کہ زہدِ اتقا، متانت اور رکھ رکھاؤ کی دھجیاں اُڑجاتی ہیں ؎

بیا ساقی آں بکر پوشیدہ روئے ‏ ‏ بن وہ گرش ہست پروائے شوئے
کنم دست شوئی بہ پاک از پلید ‏ ‏ زبکرایں چنیں دست باید کشید

ترجمہ:- ساقی مستورِ حجاب باکرہ (اچھوتی شراب) میرے سامنے لا اگر اُسے کسی خاوند (کہنہ مشق خراباتی) کی ضرورت ہے۔ مجھے اس نجس (شراب) کی خاطر تقویٰ طہارت سے دست برداری منظور ہے۔ اور ایسی دوشیزہ سے دست و گریباں ہونا پرکیف و خمار ہوگا۔

لیکن دیکھنا مغالطہ میں نہ پڑنا۔ یہ شیخ گرامی حضرت نظامی ہیں، جن کے تورع و تزہد کی تاریخیں گواہ ہیں۔ کہ ان کی "مے پرستی، بادہ پیمائی" سخن گسترانہ شوخیاں ہیں۔ جب شعلہ بیانی سے مجلس گرما چکتے ہیں اور رندی و خراباتیت کے بیان کو اس جوش سے بیان کر چکتے ہیں کہ تعبیر مجاز، حقیقت میں گم ہوا چاہتی ہے۔ تو کس معصومانہ انداز میں ارشاد ہوتا ہے ؎

تو پنداری اے خضر فرخندہ پے ‏ ‏ کہ از مے مرا ہست مقصود مے
مرا ساقی از وعدۂ ایزدی ست ‏ ‏ صبوح از خرابی می از بیخودی ست
نہ آں مے کہ آید بمذہب حرام ‏ ‏ مئے کو اصل مذہب بدر شد تمام
وگرنہ بایزد کہ تا بودہ ام ‏ ‏ بہ دامن لب نیالودہ ام

ترجمہ:- مبارک قدم خضر کیا تیرا خیال ہے کہ شراب سے میری مراد شراب ہی ہے ہرگز نہیں بلکہ میں "بیخودی" کو "شراب" خدا کی محبت میں سرشاری کو "مستی" اور میدانِ حشر میں "ستر منور" کی جلوہ نمائی کرکے وعدہ کو "ساقی" کہہ کر پکارتا ہوں۔ حاشا! شراب سے میری مراد وہ شراب نہیں ہے جو مذہب نے حرام کر دی ہے بلکہ وہ خدا کی محبت کی شراب ہے جس سے حقیقی مذہب کی تکمیل ہوتی ہے۔ ورنہ خدا کی قسم جب سے میں پیدا ہوا ہوں شراب سے میرے لب آلودہ نہیں ہوئے ہیں۔

شرابِ حقیقت کا یہ نوشش اپنی عصمت کی کافی صفائی پیش کر چکا ہے۔ اگر بایں ہمہ اب بھی کسی کافر کو اس کے دامن اتقا پر شرابِ مجاز کا دھبہ نظر آئے تو یہ شعر تمام حجت کے لئے کافی ہے ؎

گر از مئے شدم ہرگز آلودہ کام ‏ ‏ حلال خدا باد برمن حرام

ترجمہ:- اگر میں نے کبھی بھی اس کا فرکو منہ لگایا ہو تو خدا کرے کہ میرے اوپر خدا کی تمام حلال چیزیں حرام ہو جائیں۔

خراباتِ خسرو

فردوسی کے شاہنامہ نے ایرانی تمدن و تہذیب اور کیانی شوکت و سطوت کو پائندگی بخشی ـــــ نظامی نے سکندر کو شہرت عام اور بقائے جاوید کا خلعت پہنایا۔ خسرو نے آئینہ سکندری میں وہ مشاطگیٔ سخن کی کہ اس آئینہ میں سکندر کے رخ کے خط و خال اور بھی نمایاں ہو گئے۔

مثنوی کے اجزائے ترکیبی میں "ساقی نامہ" کی ایجاد کا سہرا اگر نظامی کے سر پر سجتا ہے، تو خسرو نے بھی اس خصوصیت کو قائم رکھا ہے۔ اس طرح کہ ساقی و مطرب سے دو دو باتیں کرکے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی، نیرنگی، فراوانیٔ غم، نایابیٔ مسرت، کی تلخ حقیقت سے ہر حساس ذہنیت اپنے کام و دہن کو زہر آلود محسوس کرنے پر مجبور رہے۔ کائنات مادی کے اس سلبی پہلو کو، ایجابِ مسرت سے تابناک بنانے کے لئے آغاز آفرینش سے تمدن و تہذیب کی مساعی ہمیشہ برسرِ عمل رہے ہیں۔ فلسفہ کی موشگافیاں، صنعت و حرفت کی فلک نمائیاں برابر اس درد کی دوا تلاش کر رہی ہیں دنیا کی ایک بڑی اکثریت نے "مذہب" کو زہرِ غم کا تریاق قرار دیا ـــــ لیکن ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

شاعر جو کائنات کے روشن پہلو کا پرستار ہے، شاعر جس کو ہر نیرنگیٔ دنیا میں موسیقی کے زیر و بم کی مانند تولیدِ نغمات کا احساس ہے ــــ وہ سموم غم، ذہنیت انسانی کو اپنی ساحرانہ ترنم ریزی سے حیات کی شیرینی سے شاد کام کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ خسرو بھی

خوش باش دمے کہ زندگانی این ست

کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اور غمِ فردا و دی کو محو کر دینے کا مشورہ پیش فرماتے ہیں ؎

یک امروز در خوشدلی رو نہیم — غمِ دی و فردا بہ یک سو نہیم
بہ عمرے کہ نقدست از غم تہی ست — غمِ عمر نسیہ خودی ابلہی ست
چو خواہی غم و شادمانی گذاشت — جہاں خوش گذار ارتوانی گذاشت

ترجمہ:- آج تو خوشی میں خوش وقتی کی داد دے لینا چاہئے۔ ماضی اور مستقبل کے افکار کو بھول جانا بہتر ہے۔ زندگی کے جو لمحات قبضہ میں ہیں اور خوش قسمتی سے غم سے فراغت بھی میسر ہے۔ ایسے وقت میں فکرِ فردا کرنا حماقت ہے۔ اگر دنیا کے سراب نما غم و شادی سے بے نیازی چاہتے ہو، اگر ہو سکے، تو دنیا میں مزے کرو۔

نظامی کی طرح خسرو بھی تاریخی بیان کی تکان کو تازگی سے مبدل کرنے کے لئے، ساقی و مطرب سے دل بہلاتے ہیں اثنائے راہ میں اپنے بہار آفریں قلم سے وہ چمن زار کھلاتے ہیں کہ وہ خود اور ان کے رفقائے راہ ان نظر فریب رنگینیوں میں ذرا سی دیر کے لئے سستا لیتے ہیں چنانچہ خسرو کی بہار آفریں تخیئل کی رنگینی دیکھئے اور دل کھول کر داد دیجئے! ؎

زبادِ بہاری ہوا مشکبوست — عروسِ چمن زابِ گل شستہ روست
شدہ جلوہ گر نازنینانِ باغ — رخ آراستہ ہر یکے چوں چراغ
لبِ گل از سبزہ گلشن شدہ — چراغِ گل از بادہ روشن شدہ
کشادہ گل لالہ جلباب نور — نظارہ کناں چشمِ نرگس ز دور
بہر شاخ مرغ ارغنوں ساختہ — بہر نغمہ گلبن سر انداختہ
ازاں نغمہ کو غارتِ ہوش کرد — مغنی ترنم فراموش کرد
بدہ! تا دمے خرقہ بازی کنیم — بمی دلقِ خود را نمازی کنیم

ترجمہ:- مشکبو بادِ بہار چل رہی ہے۔ عروسِ چمن نے اپنے چہرے سے گرد و غبار دور کر دیا ہے۔ نازنینانِ باغ جلوہ گری کر رہی ہیں اور ہر ایک چہرہ بجلی کے قمقمہ کی طرح جگمگا رہا ہے۔ سطحِ زمین اُگ آنے کی وجہ سے گلشن بن گئی ہے۔ اور نسیم نے پھولوں کے چراغ روشن کر دئے ہیں۔ لالہ نے نور کی چادر تان دی ہے چشمِ نرگس دور سے اس منظر کو دیکھ رہی ہے۔ ہر ٹہنی پہ پرندے ارگن باجا بجا رہے ہیں اور ہر نغمہ پر شاخیں جھوم رہی ہیں۔ اور یہ نغمہ کچھ ایسا غارت گرِ ہوش ہے کہ مغنی بھی اپنا ترنم فراموش کر چکا ہے۔ ساقی شراب پلا تاکہ فرقۂ زہد کی کمبختی لگائیں اور اپنی گدڑی کو شراب سے دھوکر پاک کریں۔

خسرو جب مرضِ غم یا غمِ ہستی کے اسباب و علامات کا خوب ذکر کر چکتے ہیں۔ تو بے خودی، مے پرستی اور راگ و رنگ کی دعوت دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک انسان کا خوگرِ رنج و غم ہو جانا۔ روح کی بدترین پستی ہے ــــ عیشِ غم زدہ کی سعی اور رنجِ گلوگیر کا ایک دوسرے کے مقابلہ میں مستقل ہستی کا دعویدار ہونا فی الحقیقت زندگی کی دو مستقل سرخیاں ہیں اسلئے ؎

چو غم را کرانہ پدیدار نیست — بہ از شاد بودن دگر کار نیست

ترجمہ:- چونکہ غم بحرِ محیط کی طرح غیر محدود معلوم ہوتا ہے اس لئے خوش رہنے سے بہتر اور کوئی طریقۂ عمل ہی نہیں۔

نظامی کے مقابلہ میں خسرو کی یہ خصوصیت کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ موخر الذکر ایک مجاہد کی طرح اپنے رفقائے حیات کو "غم" کے خلاف آمادۂ جہاد کرتے نظر آتے ہیں ؎

مشو ابلہ اے مردِ عشرت پسند — ز عشرت دمے چند شو بہرہ مند
گر آسائشے داری از روزگار — جمالِ عزیزاں غنیمت شمار
بمی تازہ گرداں دلِ ریش را — رہا کن حسابِ کم و بیش را

ترجمہ:- اے طلبگارِ راحت بیوقوف نہ بن عیش کی چند گھڑیاں ہیں انہیں کامیاب بنا لے۔ اگر زمانہ نے کچھ فراغت دیدی ہے تو

احباب کے جلسوں اور صحبتوں کو غنیمت خیال کر۔ دل غمزدہ کو شراب پیکر مسرور بنا اور دنیا کے سود و زیاں پہ خاک ڈال!۔

موسم بہار کی سحرکاریاں انسان تو انسان، حیوانات اور جمادات تک میں رعنائی، جوش اور ولولہ کی بجلیاں دوڑا دیتی ہیں۔

اس موسم زہد شکن و "ورع سوز" میں "نہ پینا" "پینے" کے مقابلہ میں زیادہ صبر آزما ہے" ایسی بہار میں تو نہ پینا حرام ہے"۔ لیکن فراق کی تباہ کن اضمحلالات میں اندوہ کشی۔ غم ربائی "کس طرح ممکن ہے"! خسرو نے اس امکان کو اس طرح پیش کیا ہے ؎

خوشا! خرگہ گرم در ماہ دے ہم از تاب آتش ہم از آب مئے
کباب و نقل و ہم خوابہ کہ جانے ستانند بہا لبسہ

ترجمہ:۔ دسمبر کی زمہریری خنکی میں آتشدان کی آگ اور شعلہ ساماں شراب سے گرما گرم کمرہ نعمت غیر مترقبہ ہے۔ کباب، نقل اور ایک نازنین بھی اگر شریک عیش ہو تو واہ واہ اور سبحان اللہ ــــ

کیا ایسی گرمی بزم و آغوش کے بعد بھی خزاں کی برودت سے ضمحلال دماغی کا خطرہ باقی رہ سکتا ہے؟

اب ذرا خسروئے اقلیم سخن کی، بزم نشاط میں جمشیدیت ملاحظہ ہو ؎

بیا ساقی آن جام شادی فزا کہ بنیاد غم را در آرد ز پا
بیا ساقی آن چشمۂ زندگی کہ یابد از و عمر پایندگی
بیا ساقی آں شربت خوشگوار کز و بزم گردد چو خرم بہار
بہ کف گیر جام درخشندہ را درو ریز یاقوت رخشندہ را

ترجمہ:۔ ساقی وہ مسرت فزا جام پلا، جو بنیاد غم کو مسمار کر ڈالے۔ وہ حیات بخش شراب پلا جو طول خاکی زندگی کو ابدیت عطا کر سکے۔ وہ شربت خوشگوار چکھا جو محفل کو بہارستان بنا دے۔ آفتاب نما جام ہاتھ میں لے۔ اور اس میں یاقوت رنگ شراب اونڈیل۔

نظامی نے ساقی نامہ میں اپنے دامن کو شراب ظاہری کی آلودگی سے یوں بچایا تھا کہ ؎

گرا نہ مئے شدم ہرگز آلودہ جام حلال خدا باد بر من حرام

یہ غالباً اس لئے کہ ان کے نزدیک شراب کی پرجوش مدح سرائی "تنہا" کے دائرہ سے نکل کر حجابات حقیقت میں گم ہوا چاہتی تھی ــــ لیکن خسرو ایسا نہیں کرتے، ان کے خرابات کی حقیقت تو یہ ہے ؎

بیا ساقی آں ساغر دل کشا کہ صورت نماست و معنی فزا
بدہ تا چو منزل بجا کم کند زآلائش خاک پاکم کند
بیا ساقی آں جام دریا دردل کز و گوہر مردم آید بردل
مئے کو بعشق آشنائے دہد ز تشویش خویشم رہائی دہد
بیا ساقی آں بادۂ بے خمار فرد شوئے از یں جان خاکی غبار
بیا ساقی آں مئے کہ کام منست بمن دہ کہ درخورد جام منست

ترجمہ:۔ ساقی! صورت نما اور معانی فزا، دلکش جام کا دور چلے۔ جب اس کی عربدہ زائی بھی خاک نشیں کر دے تو ممکن مجھے .... خاکی آلودگیوں سے پاک کر سکے۔
ساقی! وہ بحر تمثال جام پلا جو انسانیت کے اصلی جوہر کو نمایاں کر دے۔ ہاں وہی شراب جو محبت سے روشناس کرتی ہے اور افکار ہستی سے بے فکر کر دیتی ہے۔ وہ شراب پلا! جس کے نشہ میں خمار نہیں ہوتا۔ جو گرفتار مادیت روح کو سکے گرد دھبا۔ کو دھو ڈالتی ہے ساقی ایسی شراب ہی میرا مقصود و تقاضا ہے، مجھے ہی دے کیونکہ ایسی شراب میرے جام تمنا کے لائق ہے۔
خسرو کے درخور جام وہی بادۂ بے خمار ہو سکتی ہے جس کو شراب حقیقت، بادۂ معنی وغیرہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

خمخانۂ حافظ

حافظ کے ہاں خمریات کا عنوان وسیع ہے اور اسقدر وسیع کہ اگر ان کے کلام میں سے تمام وہ اشعار جو شراب و ساقی وغیرہ کے متعلق ہیں جمع کئے جائیں تو اسقدر بڑا میخانہ بنے کہ نظامی و خسرو کے میکدے اس کے ایک گوشہ میں غائب ہو جائیں۔

حافظ اگر ایک حیثیت سے، اپنی مستانہ شاعری، شراب، وساقی کی مداحی، زاہد و واعظ، محتسب سے ہنگامہ آرائی کی تہمت کی وجہ سے رند خراب حال نظر آتے ہیں —— تو دوسری طرف ان کی متصوفانہ حقیقت پژوہی، طریقت نوازی، ان کو لسان الغیب کے لقب سے عزت و افتخار بخشتی ہے۔ غرض حافظ صاحب بھی عجب چیز ہیں۔ رندوں کے پیر و مرشد ہونے میں تو کلام نہیں۔ زاہد و واعظ کی بھی آنکھ کی پتلی بنے بیٹھے ہیں —— موخر الذکر ان کی جلی کٹی سنتے ہیں اور ہنس کر ٹال دیتے ہیں یا بہت ہوا تو کہہ دیتے ہیں بیان مجاز سے حقیقت کی پردہ کشائی حافظ کا خاص انداز ہے "سر دلبراں" در حدیث دیگراں" کے بغیر ممکن نہیں ——

غرض کچھ بھی ہو حافظ کی یہ خصوصیت ان کی تمام خصوصیات سے ممتاز ہے۔ صوفی، صافی، رند خراباتی، دونوں ان کا کلمہ پڑھتے ہیں اور یہ وہ بات ہے کہ فارسی شعرا میں آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔

نظامی اور خسرو کا عام طرز یہ ہے کہ وہ اپنے ساقی ناموں میں ایک دو شعر شراب و ساقی کے لئے کہتے ہیں اور پھر ایک یا دو شعروں میں مطرب و مغنی کو مخاطب کرکے "مسلسل بیان" کو ختم یا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن حافظ ایسا نہیں کرتے، انہوں نے بے ثباتی دنیا کے متعلق چند شعر لکھے ہیں، پھر ساقی کو مخاطب کرکے برابر مدح شراب و متعلقات شراب کرتے چلے آئے ہیں اور بعد ازاں مغنی کو مخاطب کیا ہے۔ حتیٰ کہ ساقی نامہ ختم ہو جاتا ہے۔ غم دنیا اور بے ثباتی روزگار کو حافظ نے جس بلندی اور شوخی، بلاغت سے بیان کیا ہے، اس کے لئے چند شعر نمونتہً ملاحظہ فرمائیے ؎

فریب جہاں قصۂ روشن ست — بہ بین تا چہ زاید شب آبستن ست
ہمے بینم از دور گردوں شگفت — ولے نیست بر دوے مجال گرفت
درین خونفشاں عرصۂ رستخیز — تو خون صراحی بساغر بریز
کہ از دور گردوں بجاں آمدم — رواں سوئے دیر مغاں آمدم
ہماں مرحلہ ست ایں بیابان دور — کہ گم شد درو لشکر سلم و تور
ہماں منزل ست ایں جہان خراب — کہ دیدہ ست ایوان افراسیاب

دلا دل منہ بر جہاں زینہار — کہ کس بر سر پل نگیرد قرار

ترجمہ:۔ زمانہ کی مکاری محتاج بیان نہیں، دیکھئے پردۂ شب سے کل کیا ظہور میں آتا ہے۔ گردش زمانہ جو نیرنگیاں دکھاتی ہے اس پر کسی کو دسترس یا گرفت کی طاقت نہیں۔ دنیا خونی عرصۂ کارزار ہے۔ اس لئے ساقی تو بھی صراحی کے خون (شراب) سے ساغر کو لبریز کر۔ کیونکہ اوقات (زمانہ نے) کے میں دم کر دیا ہے اور میں جان بچا کر "دیر مغاں" میں پناہ کی خاطر آیا ہوں۔ زمانہ اسی کڑی منزل کا وسیع بیابان ہے جس میں سلم و تور کے بے حساب لشکر گم ہو چکے ہیں۔ اور یہ وہی منزل ہے جس نے افراسیاب کی سطوت و شوکت کے فلک فرسا ایوان دیکھے ہیں۔ میرے دل دنیا سے ہرگز دل نہ لگانا کیونکہ کوئی عقلمند پُل پر گھر نہیں بناتا۔ یعنی پل کی طرح صرف ایک رہ گذر ہے جائے قیام نہیں۔

حافظ کے نزدیک بھی شراب "سم روزگار" کے لئے تریاق جان بخش کا حکم رکھتی ہے ؎

بیا ساقی آں آب آتش خواص — بمن دہ مگر یابم از غم خلاص!
بمن دہ کہ از غم خلاصم دہد — نشان رہ بزم خاصم دہد

ترجمہ: ساقی مجھے شربت آتش خواص پلا دے۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے غموں سے رہائی پا سکوں۔ پہلے مجھے ہی دے کہ غم سے رہائی ملے اور یہ شراب بزم قدس کی طرف میری رہنما بنے۔

اس کے بعد جس آتشہ کی طلب ہے اس کی جلوہ ریزیاں اور مشک بیزیاں ملاحظہ ہوں ؎

بیا ساقی آں جام یاقوت رنگ — کز آئینۂ دل برد نقش زنگ
بیا ساقی آں مے کہ تیزی کند — بہ باغ دلم مشک بیزی کند
بیا ساقی آں جام چوں مہر و ماہ — بدہ تا زنم بر فلک بارگاہ

ترجمہ:۔ ساقی وہ جام یاقوت رنگ دے جو دل کے آئینہ سے غم کی

کدورت کو دور کر دے۔ ساقی ایسی تیز شراب دینا جو دل کے باغ میں مشک افشانی کر سکے۔ ساقی چاند و سورج کی طرح چمکتا ہوا ساغر پلا تاکہ میں آسمان پر خیمہ زن ہو سکوں

حافظ نے وصف ساقی، وصفِ ظروفِ خمر، بزم، بہار وغیرہ سے اعتنا نہیں کیا ہے۔ لیکن وصف خمر کو بڑے جوش سے بیان کیا ہے۔ شراب پینے سے ان کی غرض شبانہ روز کی بے خودی نہیں ہے بلکہ وہ اس مستی و بے ہوشی میں جو کچھ چاہتے ہیں، انہی کی زبان سے سنیئے ؎

بیا ساقی آں آبِ اندیشہ سوز　　　که گر شیر نوشد شود بیشہ سوز
بدہ کز جہاں خیمہ بیروں زنم　　　سراپردہ بالائے گردوں زنم
چو شد باغِ روحانیاں مسکنم　　　درانجا چرا تختہ بند تنم
من آنم کہ چوں جام گیرم بدست　　　بہ بینم دراں آئنہ ہر چہ ہست
شرابم دہ و روئے دولت ببیں　　　خرابم کن و گنجِ حکمت بہ بیں

ترجمہ:۔ ساقی وہ شرابِ اندیشہ سوز دے جس کو اگر شیر بھی پی لے تو جنگل میں آگ لگا دے۔ ساقی مجھے جلدی سے پلا تاکہ اس خاکدانِ ہستی کو چھوڑ کر آسمان پر اپنے ڈیرے ڈالوں۔ جب فردوس بریں میرا اصل مقام ہے تو پھر کس لئے میں دنیا کے آب و گل میں اسیر ہوں۔ میں ایسا میخوار ہوں اگر جام کو ہاتھ میں لوں تو اس جام آئینہ رنگ میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں ساقی مجھے شراب دے اور دولتِ معانی کا نظارہ کر۔ مجھے بدمست بنا اور حکمت و معرفت کے خزائن کا تماشہ کر

حافظ کی مستی، مجہول بے خودی نہیں ہے بلکہ اس بے خودی سے وہ ایک ایسی خودی کی تعمیر چاہتے ہیں جو ان کو نظامِ کائنات پر حاوی کر سکے وہ جہانِ شش جہت سے بہت ماورا پہونچنا چاہتے ہیں ـــ وہ جام شراب میں ماضی و استقبال کا مطالعہ کرکے اس گنج حکمت کو لٹانا چاہتے ہیں جس کی ایک دنیا دیوانی ہے ؎

بیا ساقی آں جام صافی حقیقت　　　کہ بر جاں کشاید درِ معرفت
بہ مستی تواں دُرِّ اسرار سفت　　　کہ در بیخودی راز نتواں نہفت

ترجمہ:۔ ساقی مجھے وہ روشن جام دے جو روح کے لئے معرفت کا دروازہ کھول دے۔ مستی کی حالت میں اسرارِ معرفت بیان کئے جا سکتے ہیں کیونکہ راز چھپانا مشکل ہوتے ہیں۔

انسان کائنات کا رازِ سربستہ معلوم کرنے کے لئے ہمیشہ سے بے تاب ہے اور رہے گا ـــ انسانیت کی تمام ہنگامہ آرائیاں اسی گنج معرفت کی خاطر ہیں۔

قانون کی غرض و غایت انسانی اجتماع کی ذہنیت کو ترقی دینا ہے، اس لئے قانون کی عمر ہمیشہ تھوڑی ہوتی ہے، اس کے حلقۂ نفاذ میں اس کی کلیت اور اس کے دوام کا ادعا کرنا حماقت ہے۔ قوانین مذہب بھی اس نظریہ کے ماتحت ترمیم و تنسیخ کے شکار رہے ہیں۔ اور جو لوگ تنگ نظری کی وجہ سے مذہب کی تعزیرات کا نفاذ قدرتی حدود سے بھی دو چار قدم آگے چاہتے ہیں وہ حقیقت میں نفس قانون کی غرض و غایت سے بیگانہ ہیں۔ قانونِ مذہب کے علمبرداروں نے جب کبھی بھی استبداد و شخصیت کے نشہ میں چور ہو کر دست تعدی دراز کیا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زاہد خشک اور رند میخوار کی ہمیشہ چل گئی ہے ـــ کمزور کی زبان چلی ہے اور زبردست کا ہاتھ . . . . دیکھ لو کہ شریعت کی دار پر منصور آج تک لٹک رہا ہے۔ شعرائے اس مضمون پر خوب خوب طبع آزمائیاں کی ہیں۔ اور تعریض ابتداً ایک مستقل چیز بن چکی ہے، جس میں زہد کی اچھی طرح خبر لی گئی ہے اور رندیت کو سراہا گیا ہے۔ چنانچہ حافظ نے بھی اپنے ساقی نامہ میں تعریض کا پہلو اختیار کیا ہے اگر اس نوع میں اس کا آغاز ہے۔ لیکن بنیاد کچھ ایسی سعید ساعت میں رکھی گئی ہے کہ مستقبل میں اس پر وہ قلعہ تعمیر ہوگا کہ زعمائے شریعت کی توپیں اس پر گرج گرج کر ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ نمونہ دیکھئے ؎

بیا ساقی آں بادۂ لعل صاف　　　بدہ تا کے از زہد و تزویر لاف
بیا ساقی از گنج دیر مغاں　　　مشو دور کاں نجاست گنج رواں

ز تزویر خرقہ ملولم تمام — بہ رہن کن ہر دو را والسلام
خذ الجام لا تخش فیہ الجناح — کہ در باغ جنت بود مے مباح
درت شیخ گوید "مرو سوئے دیر" — جوابش چنیں گو "شامت بخیر"
بیا ساقی آں آب آتش نہاد — کہ خاک خرد زو بر آید بہ باد
بیا ساقی آں بکر مستور مست — کہ اندر خرابات دارد نشست
بمن دہ کہ بدنام خواہم شدن — خرید مے و جام خواہم شدن
بمن دہ کہ در کیش رندانِ مست — چہ آتش پرست و چہ دنیا پرست
بیا ساقی از بادہ پر کن بطے — مغنی کجائی بزن بربطے

ترجمہ: ساقی پاکیزہ گُل رنگ شراب لا۔ زہد کی جھوٹی شیخیاں کب تک مارے گا؟ اے ساقی! خرابات مغاں سے دور نہ ہونا کیونکہ گنج رواں (شراب) تو وہیں ہے اور بس۔ میں فریب کاری اور خرقہ پوشی سے تنگ آگیا ہوں اب تو ان دونوں کو رہن کرکے شراب خرید لے، کہ جھگڑا ختم ہو۔ ساقی جام ہاتھ میں لے اور اس سے نڈر کہ گناہ ہوگا۔ جنت کے باغ میں تو شراب حلال ہوگی۔ یعنی شراب جو جنت میں حلال ہے۔ دنیا میں اسکی حرمت صرف کوتہ نظروں کے لئے ہے نہ کہ ہم جیسوں کے لئے۔ ساقی اگر شیخ تجھے دیر مغاں کی طرف جانے سے روکے، تو تو اس کے جواب میں "خدا حافظ"، "شب بخیر" کہہ کر چلدینا۔ ساقی وہ شراب آتشین پلا! جو عقل و خرد کی مٹی خراب کردے۔ ساقی مجھے وہ پردہ نشین اور مست دختِ رز لادے جس کا مقام خرابات میں ہے یعنی شراب ناب —— وہی مجھے لاکردے کہ میرا جی بدنام ہونے کو چاہتا ہے۔ میں تو اب جام شراب کا مرید بنوں گا۔ ساقی پلا! کہ رندانِ مست کے مذہب میں آتش پرست اور دنیا پرست دونوں ذلیل ہیں، احمق ہیں۔ ساقیا! صراحی کو شراب سے لبریز کر۔ مغنی! تو کدھر ہے؟ ذرا بربط کے تاروں کو چھیڑ۔

شراب خانہ پرتوی[1]

عزیب پرتوی قصر شہرت کے دروازے پر "بقائے دوام" حاصل کرنے کے لئے زمرۂ شعرائیں سے آگے بڑھا —— اس کی قبائے معرفت اور ردائے تصوف، ابتک جوانی کی قلندرانہ مے پرستیوں اور رندانہ سرمستیوں میں داغدار تھی۔ لیکن اب اس عاشق مجاز کا دل نور حقیقت سے معمور تھا۔ توبہ کی کامرانیاں اس کے چہرہ سے ضوفگن تھیں —— استقبال کرنے والوں نے استحقاقِ داخلہ کی شرط سنائی —— چار ہزار اشعار کا دیوان چونکہ گرد ہیٔ شباب کا رفریدہ تھا، پیش نہ کرسکا۔ ایک مثنوی جو "حدیقۂ سنائی" کے جواب میں لکھی تھی پیش کردی —— اور کہا "ساقی نامہ" پر مجھے خود بھی ناز ہے! اور اہل نظر اسی سے میری استحقاق

[1] حکیم پرتوی (ولادت ۸۶۳ھ) (وفات ۹۴۱ھ) شاہ طہماسپ صفوی کے عہد حکومت کا آغاز تھا کہ حکیم پرتوی لاہجان گیلان میں پیدا ہوا۔ شہیدی قمی، مُلّا اہلی شیرازی اسکے معاصر تھے ابھی عنفوانِ شباب ہی تھا کہ لاہجان سے ترک وطن کرکے شیراز آیا۔ مُلّا جلال الدین محمد دوانی کی شاگردی اختیار کی۔ باکمال استاد کے فیض صحبت سے تمام علوم و فنون مروجہ میں کمال دستگاہ حاصل کی۔ تصوف و علم شریعت میں وسیع نظر رکھتا تھا۔
پرتوی جوانی میں، عاشق مزاج، مے خوار اور رندانہ زندگی گزارتا تھا۔ لیکن اس کا یہ حال بھی درویشی و صوفیت کے رنگ سے خالی نہ تھا —— آخر عمر میں تمام منکرات سے توجہ کی اور زاہدانہ زندگی گذارنا شروع کی۔
پرتوی نے کئی بار عزیمت حجاز کا سفر کیا (مخزن اخبار) ۹۲۱ھ میں اکہتر سال کی عمر میں تھا کہ بغداد میں وفات پائی۔ اور وہیں دفن ہوا
پرتوی کا دیوان چار ہزار بیت پر مشتمل ہے اور مشہور ہے۔ اس نے توبہ کے بعد حدیقہ کے طرز پر ایک مثنوی نظم کی تھی جو مشہور نہ ہوسکی۔
مشہور ساقی نامہ گو شعراء میں، پرتوی کا ساقی نامہ مشہور ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس نے متقدمین کی خصوصیات کو باقی رکھتے ہوئے بعض ایسی جدتیں دکھائی ہیں کہ ان کی مثال اور جگہ نہیں ملتی۔ فن ساقی نامہ میں بعد کے شعراء کو اسی بناء پر اس کا متبع کہنا بجا ہے۔ نظامی کا زور بیان، جدت تشبیہ حافظ کی تصوف آمیزی و جوش، پرتوی کے ہاں موجود ہوتے ہوئے ساقی نامہ کے اشعار کی کثرت ایک ممتاز خصوصیت ہے۔ یوں تو سرخوش کو ظہوری کا ساقی نامہ پسند ہے۔ اور خوشگو نے نوعی خبوشانی کے ساقی نامہ کی تعریف کی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ حافظ کے بعد فن ساقی نامہ کی خصوصیات کو معراج تکمیل تک پہونچانیکا فخر پرتوی سے کسی طرح چھینا نہیں جاسکتا۔
نوعی خبوشانی کا ساقی نامہ تو اسقدر پھیکا ہے کہ خوشگو کی خوش مذاقی پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ رہا ظہوری تو اس کے ساقی نامہ کے تو ساڑھے چار ہزار اشعار کے طومار کا کسی پر کیا اثر؟ کیونکہ ادبیت کے فخر کو تتبع کی فلک پیمائیاں کسی طرح حاصل نہیں کرسکتی ہیں۔

اجازۂ قصرِ شہرت کو ملحوظ رکھ سکتے ہیں۔

فی الحقیقت ساقی نامہ کی معنی پروری، زورِ بیان۔ لطافت، شیرینی، حیرت انگیز اور پرتوی کے لئے سرمایۂ نازش تھی ——— مگر لوگ کہنے لگے کہ یہ تو دانائے طوس فردوسی کا ساقی نامہ ہے۔ کیونکہ فردوسی کا پہلا تخلص پرتوی تھا۔ اس پر قیل و قال شروع ہوئی۔ پرتوی کی نزاکت طبع اس کو برداشت نہ کرسکی اور وہ یہ اشعار پڑھ کر گمنامی کی تاریکی میں گھس کر کہیں غائب ہوگیا ؎

زبیداد چرخ مرقع لباس — علم دارد ادم بگردن پلاس
دریں خاکدانِ پریشاں نہاد — کہ گلبرگ دانش ہمہ مردہ باد
نہ بینی برے بر درختانِ دیر — بجز میوۂ جہل آلودہ ثمر

ہمارے گمنام شاعر نے سب سے پہلے تشکایت ایام، جی کھول کر کی ہے اور اس ضمن میں صرف دو شعر اس کی دنیاوی بیزاری کے سلسلہ میں پیش کرنا کافی ہونگے ؎

عجب روزگارے گراں محنت ست — کہ بر مردہ ہا زندہ را حسرت ست
حلاوت نماندست در شہد عمر — ہمہ طفلِ جہلند در مہد عمر

ترجمہ:- یہ زمانہ عجیب پُرکلفت ہے کہ زندہ آدمی مُردوں کی راحت و سکون پر حسرت کرتے ہیں۔ زندگی کے شہد میں حلاوت باقی نہیں رہی ہے۔ دنیا کے ہنگوڑے میں تمام جہالت مآب بچے پرورش پا رہے ہیں۔

اہلِ کمال کو ہمیشہ ابنائے زمانہ کی ناقدری کا شکوہ رہا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ باکمال مخترع و موجد اور مفکر جس قوم میں پیدا ہوتے ہیں، اس قوم کی ذہنیت سے ان کے تصورات و خیالات ہمیشہ بہت بلند اور نامانوس واقع ہوتے ہیں جس کی داد اس قوم کے افراد کما حقہ نہیں دے سکتے ——— مگر جب ان کے اختراعات فائقہ کی رہنمائی سے دنیا والوں کی ذہنیت میں اہتزاز و ارتقاء کی شانیں جلوہ گر ہوتی ہیں تو وہ ماضی کے ان باکمالوں کی قدردانی کئے بغیر نہیں رہ سکتے ———

بہرحال شکوہ ناگزیر ہوتا ہے۔ اور اس زخمِ ناقدری کے اندمال کے لئے پرتوی نے جو مرہم تجویز کیا ہے وہ ضرور کارگر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب عالمِ ہوش میں سکون نہیں ملتا تو مست و بیخود ہوجانا ہی بہتر ہے۔ اس کی نظم میں گریز کے طور پر یہ شعر بہت ہی پُرلطف ہوگیا ہے ؎

چو در عالمِ ہوش نبود سکوں — من و عالمِ بیخودی و جنوں

ترجمہ:- چونکہ عقل و فرزانگی میں سکونِ خاطر محال تھا۔ اس لئے اب عالمِ بیخودی و جنون ہے اور میں ہوں۔ پھر کہتا ہے ؎

دہم ہمچو چشم سیہ مست یار — سر و کارِ خود را بمستی قرار
بمستی زدنیا و دیں دار ہم — کہ ایں ہر دو کوہند سدِ رہم
مئے از نقشِ ہستی کند سادہ ام — رہاند ز زنگ ریا بادہ ام
شراب ریا سوز ہستی گداز — گدا را ازحشمِ شاہاں کند بے نیاز

ترجمہ:- میں محبوب کے چشم سیہ مست کی طرح اپنی زندگی کا مقصد مستی و مدہوشی قرار دیتا ہوں۔ دنیا و دیں کے افکار و مکروہات سے مستی ہی مجھے رہائی دیگی کیونکہ میری زندگی کے راستہ میں یہ دونوں باتیں رکاوٹ بن چکی ہیں۔ شراب میری روح کی مادی زندگی کے جنجال سے چھڑا دے گی۔ اور شراب ہی مجھے مکروریا کی آلودگی سے پاک کرسکیگی۔ ریا سوز اور ہستی گداز شراب فقیر کو بادشاہوں سے بے نیاز کردیتی ہے۔

پرتوی کے ساقی نامہ کی یہ خصوصیت فراموش نہیں کی جاسکتی کہ متانت آغازِ کلام کے ساتھ، اس کا جوشِ بیان بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور اسی زورِ بیان کی بناء پر بعض لوگوں کو یہ ساقی نامہ فردوسی کا معلوم ہوتا ہے۔ نمونہ دیکھئے ؎

بدہ مئے کہ در مذہب کیش و دل — چہ کعبہ چہ بتخانہ در پیش دل
بزن شیشۂ کفر و ایماں بسنگ — بہ خشت خم بر سر صلح و جنگ
مشو پائے بندِ گلِ کفر و دیں — بمستی فشاں دست بر آن و ایں

ہمارے گمنام شاعر نے شبابیات کی تمام مادی لذائذ لوٹے، لیکن گمراہی اور حسنِ مجاز کی پرستش نے اس کے ذوقِ حسن و تجسس

وحقیقت کی برابر تربیت کی ـــــ لیکن جب اسکی زندگی دنیا کی تلخیوں سے زہرناک ہوگئی اور طلسم مجاز کی حقیقت عریاں نظر آنے لگی تو اسوقت روحانی صلاحتیں برانگیختہ ہوئے بغیر رہ سکیں۔ چنانچہ شاعر ایک رہنما کی حیثیت سے جب دنیا کی بے ثباتی اور تلخی کو آشکار کرچکتا ہے تو مستی و بے خودی کو اس کا واحد علاج قرار دیتا ہے۔

پرتوی کے یہ اشعار اس موقع پر نقل کئے بغیر نہیں رہا جاتا ؎

بکن ناخوش دہر بر خویش خوش   بمستی از و انتقامی بکش

ترجمہ :- زمانہ کی تلخیاں اپنے لئے اس طرح خوشگوار بناؤ کہ مست ہو جاؤ اور اس اپنی بے حسی سے اس کو ستاؤ۔ کیونکہ زمانہ جب اپنے ظلموں کو تم پر اثر انداز ہوتا نہ دیکھ لیگا تو اس کو متوقع خوشی کی بجائے رنج ہوگا۔ اور تمہارا یہ بہترین انتقام ہوگا جو تم اس سے لے سکتے ہو۔

بزن عندلیبانہ زیں گلستاں   صفیرے بمرغان قدس آشیاں

مشو رہن در ایں چمن ہمچو آب   چو باد صبا کن برفتن شتاب

ترجمہ :- اس غمکدۂ ہستی میں بیٹھکر مستانہ وار بلبل کی طرح ایک نغمہ مرغان قدس آشیاں کو سنا، تاکہ زمانہ کو تیری بے فکری سے اور بھی دکھ پہونچے۔ لیکن اس کے ساتھ اتنی بات یاد رہے کہ اس دنیا کے چمن میں پانی کی طرح پاؤں پسارنا نہیں چاہئیں بلکہ باد صبا کی طرح یہاں سے چلنے کی کرو۔

پرتوی حافظ کی طرح مستی و بے خودی کو صرف غم روزگار کا تریاق ہی نہیں بتاتا بلکہ اس کو روحانی ترقی کا ایک ذریعہ بھی فرض کرتا ہے وہ ساقی سے ایسی شراب کا تقاضا کرتا ہے جس کے نشہ میں کیفیت انجام بھی ہو۔ اس کو اس آب آتش مزاج کی طلب ہے جس سے مادی افسردگی کا علاج اور روح کی لاہوت سیری کا امکان ممکن ہوسکے ؎

درِ خلوتِ دل بہ بندم ز غیر   شوم عرش پرواز لاہوت سیر

ترجمہ :- مستی میں غیر اللہ سے اپنے خلوت کدۂ دل کو خالی کرلوں گا اور عرش پروازی اور لاہوت سیری اختیار کروں گا۔

پرتوی نے صفت جس دھوم دھام سے کی، فردوسی کے شکوۂ بیان میں شریک نظر آتا ہے ؎

بدہ ساقی آں بادۂ بت شکن   فرو ریز در جام آں در دِ دن

کہ بر کوہ اگر زاں مئے بے خمار   بریزی بریزد ز ہم چوں غبار

بذرات اگر بر رسد زیں شراب   کند ذرہ کار صد آفتاب

بیم گر کشد بحر ازیں دُرد و درد   برآید بہ چرخ از تہ بحر گرد

انا الحق زنامے رسد تا بماہ   ز خورد و بزرگ و سفید و سیاہ

ترجمہ :- ساقی! معرفت کی اس بادۂ بُت شکن کی تلچھٹ سے میرے ساغر امید کو لبریز کردے۔ کہ اگر اس شراب بے خمار کو پہاڑ پر چھڑکا جائے تو وہ پہاڑ بن کر اُڑ جائے! اگر اس شراب کا ایک قطرہ ذروں پر پڑ جائے تو ہر ذرہ سو آفتابوں کی طرح درخشاں نظر آئے۔ اگر سمندر تک اس دردِ محبت کی شراب کی ذرا سی بھی پہونچ جائے تو سمندر خشک ہو جائے اور اس کی تہ کی گرد آسمان تک پہونچ جائے۔ اس شراب کو پی کر کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز انا الحق کا ایسا نعرہ مارے جو فلک الافلاک سے لے کر تحت الثریٰ تک پہونچ جائے۔

اب ذرا پرتوی کی شراب کی مستی و شیر افگنی ملاحظہ ہو، وہی شاہنامہ کا سا طرز بیان اور جوش و خروش ہے ؎

بدہ ساقی آں آب نیرو بخش   کہ تازم عبیداں افلاک رخش

ازیں خاکداں دامن افشاں شوم   بہ ترچرخ دست و گریباں شوم

کنم سرنگوں حقہ مکر و آز   زسر گرد چشم دلق ایں حقہ باز

کنم ناخن ماہ نو را ز بُن   ز سر پنجۂ ایں پلنگ کہن

ترجمہ :- ساقی وہ قوت بخش شراب دے جس کی مستی میں آسمانوں کی وسعتوں میں گھوڑا دوڑا سکوں۔ میں اس خاکدانِ خاکی کو چھوڑ دوں اور آسمانوں سے دست و گریباں ہوسکوں۔ میں مست ہوکر مکر و فریب کے طلسموں کو توڑنا اور زمانہ کے بازیگر کا بھانڈا پھوڑنا چاہتا ہوں۔ میں اس پُرانے چیتے (زمانہ) کے پنجے سے ماہ نو کا ناخن اکھیڑ لوں گا تاکہ چاند کے عروج و

زوال کو دکھا کر انسانوں کے ستانے کے قابل نہ رہے۔

پھر کہتا ہے ؎

زہے شیر مردے کہ شد شیر گیر ‏ زند شیر را ہم چو روباہ پیر
وگر تر کند شیر ازیں بادہ کام ‏ زند بر زمیں گاوِ گردوں خرام
زمیں را اگر بر خراشد ز کیں ‏ کشد تسمہ از پشتِ گاوِ زمیں
وگر پشہ گردد ازیں بادہ مست ‏ کند پیل را در تہِ پائے پست
وریں بشنود مور شکستہ کمر ‏ کند پنجہ در پنجۂ شیر نر

ترجمہ:۔ جو بہادر آدمی شراب پی کر شیر کا شکار بن جاتا ہے وہ شیر کو لومڑی کی طرح ہلاک کر سکتا ہے۔ اگر ہماری اس شراب سے شیر شادکام ہو جائے تو وہ آسمان کے بیل گائے کو زمین پر پٹک سکتا ہے۔ اور اگر وہ غصہ سے زمین کو اپنے پنجوں سے کھرچنا شروع کرے تو گاوِ زمیں کی پشت کی کھال تک ادھیڑ سکتا ہے۔ ایک شکستہ کمر چیونٹی بھی اس شراب کو پی کر شیر ببر کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

پرتوی نے چونکہ زندگی کا ایک بڑا حصہ رندی اور غفلت میں گذارا تھا اور علم و عرفان کی می نوشیوں کو اس مستیوں سے ناآشنا رہا تھا، اسواسطے اپنی محرومی پر متاسف ہے ؎

دریغا کہ ایام فرصت گذشت ‏ ہمہ عمر در خواب غفلت گذشت
ندارم کنوں غیر شرمندگی ‏ ز پیرِ مغاں آہ ازیں زندگی

ترجمہ:۔ افسوس کہ فرصت کے دن گذر گئے۔ اور تمام عمر خواب غفلت کی نذر ہو گئی۔ اب پیر مغاں سے سخت شرمسار ہوں ایسی زندگی پر ہزار حیف ہے

لیکن وہ اس تضیع اوقات سے ناامید نہیں ہے۔ در میخانہ پر دبیرامی کے باوجود وہ کہتا ہے ؎

مگر لطف ساقی کند کار خویش ‏ سر خجلتم را بر آرد ز پیش

ترجمہ:۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ساقی کا الطاف کرم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہی میرے سر خجلت کو اُٹھا کر بامراد کریگا۔

پرتوی کے ساقی نامہ کا ہر شعر پڑھنے اور داد دینے کے قابل ہے۔ لیکن اس مضمون میں پورے ساقی نامہ کا نقل کرنا مشکل ہے۔ اسواسطے بعض عنوانوں کے ماتحت جو اشعار مجھے پسند ہیں پیش کرتا ہوں۔ ترغیب مے پرستی کا انداز دیکھئے اور نظامی، خسرو، حافظ سے مقابلہ کیجئے ؎

گر از دست برد اجل واقفی ‏ منہ جام از دست اگر عارفی
دگر چوں صراحی ست چشمت لبسر ‏ دمے برنگیر از پیالہ نظر
مرید مئے جام باش و سبو ‏ گہے دست ایں بوس و گہ پائے او
جز اینہا مرا نیست فریاد رس ‏ بہ میخوارگی ایں سہ یار ست و بس

ترجمہ:۔ اگر موت کی دست برد سے واقف ہو تو شرط معرفت یہی ہے کہ جام شراب ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اگر صراحی کی طرح تمہارے پاس بھی دیدۂ بیدار ہے تو ایک لحظہ کے لئے بھی پیالہ سے نظر نہ اُٹھاؤ۔ بس جام و سبو اور شراب کے مرید بن جاؤ۔ کبھی اس کا ہاتھ اور اس کے پاؤں چومو۔ ان کے سوا میرا رفیق و مددگار کوئی نہیں ہے۔ میخواری کے وقت یہ تینوں میرے دمسانہ ہیں۔

صفت شراب میں یہ تین شعر لاجواب ہیں ؎

بدہ ساقی آں بادۂ لالہ گوں ‏ کہ آرد بجوش از دل سنگ خوں
مئے کز کدورت بود بے نشاں ‏ بخارش بود ابر گوہر فشاں
بدہ ساقی آں جامِ عنبر سرشت ‏ کہ دارد شرف بر رحیق بہشت

ترجمہ:۔ وہ بادۂ گل رنگ پلا، جو پتھر کے دل سے بھی خون کے فوارے اُچھال دے۔ وہ شراب پلا جو کدورت سے بالکل پاک ہو اور اس کی بھاپ ابر کی طرح گوہر فشاں ہو۔ ساقی وہ جام عنبر دو عطا کر جو شراب بہشت سے بھی بہتر و برتر ہو۔

شراب، مادہ کی آلائشوں سے پاک کر دیتی ہے ؎

غلامم کنند آں مئے سرمدی — ز زنگِ خودی بخشدم بے خودی
سر کبر بیخود بہ پائے صنم — بہ از طاعتِ راہبان در حرم
سگ درگہ بت پرستان مست — بہ فتوائے پاکاں بہ از خود پرست

ترجمہ:- شراب معرفت مجھے خودی کی آلودگی سے پاک کر دیگی۔ اور بیخودی جاوید بخشیگی۔ غرور کا سر اگر مستی کی حالت میں صنم کے قدموں پر پڑا ہو تو پیروانِ مذہب کی اس بندگی سے بہتر ہے جو حرم میں ادا کی جاتی ہے برگزیدہ لوگوں کے فتوی کے مطابق بت پرستانِ مست کے دربار کا کتا ہونا خود پرستی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

سزا اور جزا، ترغیب و ترہیب کا قانون، ان لوگوں کے لئے ہے جو بیگانۂ محبت ہیں۔ لیکن وہ ہستیاں جو عشق و محبت کی سرمستیوں میں غرق ہیں ان حدود اور پابندیوں سے آزاد اور بالا تر ہیں۔ ان کے افعال و اعمال اس میزان میں نہیں تولے جائیں گے، جس میں کہ عوام کے کردار وزن کئے جائیں گے۔ پرتوی نے اس نکتہ کو کس خوبصورتی سے بیان کیا ہے ؎

بدہ مئے کہ در محشر کوہِ گناہ — بہ میزان عشقست کمتر ز کاہ
ز دوزخ چرا کس ہراساں شود — کہ دوزخ بستاں گلستاں شود
من ار آہِ گرمے ز دل بر کشم — گریزاں شود دوزخ آتشم
ز اشک ندامت بروزِ جزا — دہم دوزخ خود بسیلِ فنا
چو گریاں شوم مست و خانہ خراب — برد صد ہزار آتشِ دوزخ آب

ترجمہ: ساقی شراب پلا کیونکہ میدانِ حشر میں کوہ گناہ جب عشق و محبت کی میزان میں تلیگا تو گھاس کے تنکے سے بھی زیادہ ہلکا ہوگا۔ کوئی دوزخ سے کیوں ڈرے! کیونکہ سرمستانِ محبت کے واسطے دوزخ گلزارِ ابراہیم بن جائے گی۔ میں وہ سوختۂ محبت ہوں اگر ایک آہ گرم میرے دل سے نکلے تو یقین ہے کہ آتشِ دوزخ کو بھی اس کے سامنے سے بھاگتے ہی بنے گی۔ میں قیامت کے دن اشک ندامت بہاکر اپنی دوزخ کو سیلاب فنا میں غرق کر دوں گا اگر اس مستی و بے ہوشی کی حالت میں رونا شروع کر دوں تو ہزاراں ہزار آتش دوزخ میرے آنسوؤں سے بجھ کر سرد ہو جائیں گی۔

پرتوی کی یہ خصوصیت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے اس نے ساقی نامہ میں تصوف کی رنگ آمیزی جس خاص انداز سے کی ہے اس کی مثال قدما کے دوسرے ساقی ناموں میں تلاش کرنا بیکار ہے۔ نمونہ دیکھئے ؎

بدہ ساقی آں طرفہ پیمانہ ام — بہ بر رست ازیں کہنہ ویرانہ ام
چناں ساز لا یعقل و بے خودم — کہ یابم وجود دو عالم عدم
گر از تفرقہ دل بہ یابد حضور — شود نور ظلمات و ظلمات نور
حریفاں کہ سرِ نگو گفتہ اند — بالماس مئے ایں گہر سفتہ اند
سخن چند در پردہ گفتن تواں — کجا مہر تاباں نہفتن تواں

ترجمہ: ساقی مجھے وہ طرفہ جام شراب دے جس کو پی کر اس خرابات ہستی سے مستی کی حالت میں گذر جاؤں۔ مجھے ایسا لایعقل و بے خود بنا دے کہ دو عالم کی ہستی میری نظر میں عدم ہو کر رہ جائے ایک نرالی تجلی سے میرے اشتیاق دیدار کو برانگیختہ کر، کہ دو عالم کے تشتت کی صلاحیت مجھ سے زائل ہو جائے۔ جن ہم مشربوں نے "راز نگفتی" کو فاش کیا ہے۔ انہوں نے شراب کے ہیرے سے اس درِ اسرار کو پرو دیا ہے۔ رازہائے حقیقت تشبیہ و استعارات کے پردہ میں ظاہر کرنا مشکل ہیں۔ فی الحقیقت سینہ میں حقائق کے آفتاب درخشاں کو چھپانا دشوار ہے۔

پرتوی مسلمان ہے اسکا عقیدہ ہے کہ میدان حشر ہی وہ ایک جگہ ہے جہاں اس دنیا کی مستتر حقائق، عریاں و بے پردہ نظر آسکیں گی۔ زاہدانِ خشک و رندانِ مست ایک جگہ جمع ہوں گے —— زاہد کو اپنی تمام عمر کے زہد و ریاضت پر ناز ہوگا —— تو رندوں کو بھی ساری عمر کی بدحالی و سرمستی پر فخر ہوگا۔ لیکن اول الذکر اور مؤخر الذکر میں وہاں جو امتیاز ہوگا وہ ذیل کے اشعار سے واضح ہے ؎

کفن چاک و تر دامن و خشک لب — در آیم بہ محشر بہ شکلے عجب

نہ بیمم ز دوزخ نہ ذوق بہشت　　　نہ میلم بہ خوب نہ پروائے زشت
نہ بینت کنم جانب دوزخ مقام　　　کہ ایں ہر دو آمد بمستاں حرام
ز شیرم تمناست نے انگبیں　　　دہاں را نہ آلایم از آں و ایں
نظر بستن اولیٰ ز غلمان و حور　　　کہ اینہاست در بت پرستی قصور

ترجمہ:۔ میں میدانِ حشر میں اس طرح داخل ہونگا کہ کفن کی دھجیاں لٹکتی ہوں گی۔ دامن گناہ کی آلودگی سے داغدار۔ اور ہونٹ سوکھے ہونگے مجھے نہ دوزخ کا ڈر ہوگا نہ بہشت کی خواہش ہوگی غرض میں اچھے برے کے امتیاز سے بے نیاز ہونگا۔ میں نہ دوزخ کی طرف رخ کروں گا نہ جنت کو نظر بھر کے دیکھونگا کیونکہ سرمستانِ محبت کے لئے یہ دونوں مقام حرام ہیں۔ مجھے جنت کے شہد و شیر کی تمنا نہیں ہے۔ میں ان چیزوں سے آلودہ دہن نہیں ہوں گا۔ حور و غلماں سے صرف نظر کرنا بہتر ہے کیونکہ ان پر نظر ڈالنا۔ بت پرستی کے عقیدہ کے خلاف ہے۔

مضمون خلاف توقع طویل ہوگیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایڈیٹر صاحب عالمگیر سے معذرت خواہی کروں یا ناظرین سے بہرحال ؎

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!

(خیال مراد آبادی)

جرعاتِ تازہ

یہ مدد کی آہ نے، یہ نالۂ شبگیر نے　　　قبر تک پہنچا دیا کوتاہیٔ تاثیر نے
کہہ چکا کہنا تھا جو کچھ مجھ کو فرطِ شوق میں　　　سُن لیا سننا تھا جو کچھ آپ کی تصویر نے
اب زمانہ اس کو دہرایا کرے گا مدتوں　　　ختم کر دی داستانِ عشق تیرے تیر نے
لذّتِ آوارگی زنداں میں بھولے ہیں اسیر　　　سحر سا کچھ کر دیا ہے نغمۂ زنجیر نے
شکوہ ہائے تلخکامی سے سمجھ کر باز آ　　　جرم گردانا ہے اسکو مالکِ تقدیر نے
سیر کے قابل ہے مقتل کی زمین لالہ زار　　　گل کھلائے ہیں ہوائے دامنِ شمشیر نے
سُست پڑتی جا رہی ہے قوتِ سعیِ عمل　　　اعترافِ عجز شاید کر لیا تدبیر نے
زندگی کھو کر ملا کچھ اصل جلوے کا سراغ　　　کسقدر دھوکا دیا مجھ کو مری تقدیر نے
عفو سے کیوں تم نے جرمِ عشق کی توہین کی　　　جان دیدی اک حریصِ لذتِ تعزیر نے
دل کے چھالوں کی شکایت سننے والا کون ہے　　　ایک مدت ہوگئی پوچھا نہ تیرے تیر نے

میری آنکھیں کھل گئیں ٹوٹا جو دل کا آبلہ
جو کیا اچھا کیا بسمل اس کے تیر نے

(جناب بسمل سمندری)

خیالاتِ پریشاں!

از جناب شائق گورکھپوری

اکتوبر ۱۹۳۰ء

بھائی احمد!

خوش قسمتی اگر اطمینان قلبی کا نام ہے تو یقیناً مجھ سے زیادہ بدقسمت کوئی نہ ہوگا۔

آہ! وہ بھی کیا زمانہ تھا جب میرا سینہ "اطمینان قلبی" کا مرکز اور آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ دنیا اور دنیا کی تمام چیزیں سیلاب مسرت میں ڈوبی ہوئی تھیں طبیعت میں جوش تھا اور دل میں امنگوں کا تلاطم خیز طوفان، وہ تھے اور میری کائنات مسرت مجھے نہ دنیا کی خبر تھی نہ عقبیٰ کی فکر کیونکہ میری دنیا تو ان کے ملکوتی تبسم میں سمٹ آئی تھی۔

ممکن ہے رنج یا الم کی کوئی پنکھڑی ٹوٹ کر گرتی رہی ہو لیکن قوت احساس چونکہ بہتات مسرت میں جذب ہو چکی تھی اس لئے میں اس لذت سے اس وقت تک محروم رہا جب تک اُن کی آغوش میرے لئے "جنت عشق و وفا" نہ ہوئی تھی مگر بھائی احمد نہ پوچھو ؎

"اب وہی دل ہے کہ رو دیتا ہے اِک اِک بات پر"
مدتوں جس نے دیا درسِ شکیبائی مجھے

میری دنیا بدل گئی ہے۔ جیتا ہوں مگر مرنے کی تمنا میں، رتا ہوں لیکن رویا نہیں جاتا، آنسو نکلتے ہیں لیکن دکھائی نہیں دیتے۔ یہ تغیر، یہ انقلاب کیوں ہوا؟ آہ! سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آتا۔ چین کی زندگی، اطمینان کے سانس آہ! بھائی احمد اب کہاں۔

وہ ملتے ہیں اور اب بھی ملتے ہیں لیکن بھائی احمد! آہ! اب کائنات حسن کا ذرہ ذرہ بدلا ہوا ہے اور انداز تکلم میں وہ مسیحائی نہیں ہے۔ آہ!

"نہ وہ اگلی سی اُلفت ہے نہ وہ اندازِ استغنا"

دنیا میری نظروں میں اُجاڑ، سنسان اور ویران ہے۔ دلکشی اب میرے لئے ایک بھولے ہوئے خواب سے زیادہ وقیع نہیں۔ میں سمجھتا ہوں "اُنہیں" مجھ سے محبت نہیں ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟

ممکن ہے ان کے دل میں میری محبت کے اولیں نقش اب بھی گدگدی پیدا کرتے ہوں۔ اور وہ کبھی کبھی رات کی خاموشیوں میں چونک پڑتے ہوں لیکن مجھے اس کا یقین نہیں۔

میرا دل جو کبھی ذوق و مسرت کا "دربار عام" تھا اور ان کی ملاحت آمیز ستم رانیوں کا نشانہ گاہ بنا ہوا تھا۔ اب "آثار قدیمہ" کی ایک دھندلی سی تصویر ہے اور حسرت و یاس کی ایک بے جان سی صورت۔ مگر ان سے اور اُن کے خیال سے غافل۔ بے خبر اور بے ہوش نہیں ہے کیونکہ اب بھی جب میں اپنے بستر پر دن بھر کے تھکے ہارے مسافر کی طرح آ کر لیٹتا ہوں تو ایک حسین پیکر اور حسن کا مجسمہ میرے خوابیدہ جذبات میں طوفان اور ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور میں محبت کی کھوئی ہوئی دولت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے بے چین ہو جاتا ہوں۔ کائنات بیدار ہو جاتی ہے۔ کانوں کے پردے بجنے لگتے ہیں اور فضا اس آواز سے گونج اٹھتی ہے ؎

اعجاز دیکھنا یہ مری چشم شوق کا
تو ہر حجاب میں تری صورت نظر میں ہے

میں تھوڑی دیر کے لئے سیلاب مسرت میں بہنے لگتا ہوں میری کھوئی ہوئی دولت مل جاتی ہے۔ میں کامیاب اور خوش نصیب انسانوں کی طرح کروٹیں لے کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ چاندنی کمرے کے فرش پر لوٹتی ہوتی ہے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے اور وہ یاد آجاتے ہیں۔ کیا ان کو مجھ سے محبت نہیں ہے؟

شائق گورکھپوری



مدینہ منورہ کے سامنے حجاج کے خیموں کا منظر

دوست

(ترجمہ از لڈونگ ٹیک)

از جناب اے یوحناں ٹخہ بی-اے

حسین بہار کی دلفریب صبح تھی۔ فدا ایک بیمار دوست کی عیادت کے لئے ایک گاؤں کی جانب جو چند میل کے فاصلہ پر تھا چل کھڑا ہوا۔ اسے اطلاع ملی تھی کہ اس کا دوست سخت بیمار ہے اور ایک دفعہ پھر اس سے گفتگو کرنے کا خواہاں ہے۔

سہانی دھوپ اردگرد کی جھاڑیوں میں درخشاں تھی۔ خوشنوا طیور لہلہاتی ہوئی شاخوں پر پھدک پھدک کر ترنم ریز تھے۔ چنڈول بادلوں کی سفید چادر میں چھپ کر نیلگوں فضا میں اپنے سیال نغمے بہا رہی تھی۔ سبزہ زاروں کی بھینی بھینی مہک مشامِ جاں کو تروتازہ کر رہی تھی۔ دیو نما درخت رنگ برنگ کے پھولوں کا لباس پہنے محوِ تماشا تھے۔

فدا کی نگاہیں کیف سے سرشار ہو ہو کر ہر شئے کو تک رہی تھیں اس کی روح کشادہ ہوتی جاتی تھی۔ لیکن بیمار دوست کی یاد نے اسے جلد ہی پژمردہ کر دیا اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ فطرت کی آرائش اس کے لئے بیجا تھی جبکہ بیمار دوست کا تصور اس کا ہمسفر تھا۔

"ہر شاخ سے نغمہ کی صدا آ رہی ہے" اس نے کہا "طیور کے نغمے پتوں کی سرسراہٹ سے ہم آہنگ ہو رہے ہیں۔ لیکن اس رقص و سرود کی محفل سے دور اک بیمار کی درد و کرب سے لبریز آہیں فضا میں بلند ہو رہی ہیں"

پاس کے گاؤں سے دہقانی لڑکیوں کا گروہ رنگین لباس پہنے نکلا۔ سب نے اسے سلام کیا اور بتایا کہ دن کا کام کاج ختم ہو چکا ہے اور اب وہ ایک رسم شادی میں شریک ہونے کے لئے جا رہی ہیں۔ وہ انکی کہانی سنتا رہا۔ ان کے سیمیں قہقہوں کی آوازیں ابھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ان کے دلکش نغموں کی تانیں اب بھی دھیمی دھیمی اسے سنائی دے رہی تھیں۔ مگر وہ رنجیدہ تھا۔ جنگل میں جھکے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گیا۔ بار ہا پڑھا ہوا خط جیب سے نکالا اور ایک دفعہ پھر مطالعہ کرنا شروع کیا۔

میرے عزیز ترین دوست۔ معلوم نہیں مجھ غریب کو تم نے کیوں فراموش کر دیا ہے۔ دنیا کے اکثر انسانوں سے مجھے واسطہ پڑا ہے جو میرا ساتھ چھوڑ کر فرار ہو گئے مگر یہ معلوم کر کے میرے قلب پر اک کاری ضرب آئی ہے تم بھی اس بیوفاؤں کے گروہ میں شامل ہو گئے ہو۔ میں سخت بیمار ہوں۔ بخار میں گھل رہا ہوں اگر تم نے مجھ تک پہنچنے میں دیر لگا دی تو اغلب ہے کہ مجھے زندہ نہ پاؤ گے۔ تمام دنیا تروتازہ اور شاداں ہے مگر مجھ بدنصیب کی حالت بدتر ہوئی جا رہی ہے بخار کی شدت مجھے زندہ نہ چھوڑے گی۔ کھیتوں کی جھومنے والی ہریاول میری نظروں سے اوجھل ہے صرف ایک سرسبز درخت میری کھڑکی کے سامنے ہے اور مجھے فنا کے نغمے سنا رہا ہے۔ میرے سینہ میں درد ہے۔ سانس پھول رہا ہے۔ اکثر مجھے خیال ہوتا ہے کہ کمرے کی دیواریں آپس میں مل جائینگی۔ اور مجھے کچل ڈالیں گی۔ تم لوگ زندگی کی بہاریں لوٹ رہے ہو۔ لیکن مجھ بدنصیب کی پھوٹی قسمت میں بیماری اور بیچارگی لکھی ہے۔ اگر ایک دفعہ تمہارا

دوست نواز چہرہ نظر آجائے تو مجھے دنیا کی ہزار بہاروں کی بھی پرواہ نہ ہوگی۔ تم تندرست و توانا ہو۔ تم بھلا کیا جانو بیماری کیا چیز ہے۔ آہ! تمہیں اس کا احساس نہیں کہ بیچارگی کی حالت میں دوست کی ملاقات کتنی امید افزا ہوتی ہے۔ تمہیں ان ڈھارس بندھا دینے والے لمحوں کی کوئی قدر نہیں کیونکہ تمام دنیا تمہیں اپنی دوستی کی آغوش میں لے لینے کو تیار ہے۔ اگر تمہیں معلوم ہوتا کہ موت کتنی بھیانک ہے اور بیماری کتنی تکلیف دہ ہے، تو فدا تم کس تیزی سے اس مشتِ خاک کو جسے اب تک تم دوست رکھتے ہو، دیکھنے بھاگتے۔ اگر میں تندرست ہوتا تو خود تمہیں ملتا۔ شاید تم خود بھی نصیب اعدا تندرست نہیں۔ یا شاید کوئی اور امر ملاقات میں مانع ہو جائے اس لئے اگر میری اشک آلود آنکھیں تمہیں نہ دیکھ سکیں

تو خدا حافظ۔۔۔۔ الوداع۔ فقط تمہارا دوست

بیماری کے تصور نے فدا کے حساس دل پر بے حد اثر کیا۔ مسرور و منور فطرت اس کے سامنے تھی۔ لیکن اس کا دل بھر آیا اور موٹے موٹے آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلکنے لگے۔ سر کو ہاتھ کا سہارا دیکر کہنے لگا۔ جنگل کے مطرب گائے جاؤ کیونکہ فریاد سے تم ناواقف ہو تم شاعرانہ زندگی بسر کرتے ہو۔ اسی لئے خدا تعالے نے تمہیں اڑنے کے لئے بازو عنایت کئے ہیں۔ آہ! تم کتنے مسرور ہو۔ آہ فکرِ فلاں کی عزودتوں سے بے نیاز ہو۔ بہار کے سنہرے ایام تمہیں بلا رہے ہیں۔ تم ان کی روشنی میں رقص کرتے ہو۔ اور جب برفباری کے دن قریب آتے ہیں تو تم کوئی اور شاداب ملک تلاش کر لیتے ہو۔ اور رفعتوں پر اڑنے والے مسرور پرندو! مجھے تمہاری زندگی پر رشک آتا ہے۔ حیف انسان کا دل کیوں رنج و الم کے گراں بوجھ تلے دبا ہوا ہے؟ وہ محبت کو اپنی آہوں اور اپنی خوشی کو رنج و محن کے عوض خریدنے کے بغیر کیوں محبت نہیں کر سکتا؟ زندگی ایک اچھلتی ہوئی پہاڑی ندی کی طرح اس کے قدموں میں بہے جاتی ہے۔ لیکن وہ اپنی پیاس بجھانے پر قادر نہیں۔ اپنی بیقرار آرزوؤں کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتا۔“

وہ خیالات میں محو ہوتا گیا۔ آخرکار وہاں سے اٹھ کر رستہ پر ہولیا۔ کاشکہ میں اس کی کوئی امداد کر سکتا۔ کاشکہ فطرت مجھے اس کو موت کے مضبوط چنگل سے بچا لینے کی کوئی ترکیب سمجھا دیتی اپنی بیچارگی کے احساس کے سوا میرے پاس خاک بھی نہیں۔ بچپن میں مجھے جادو اور غیر انسانی امداد پر اعتقاد تھا۔ کاشکہ اب بھی میں اسی خوشی اور جوش سے ان پر اعتبار کر سکتا؟

اس نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔ غیر ارادی طور پر بچپن کی یاد اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ اس نے وہی حسن کی فضا دیر متحرک دیکھیں جن کو فراموش کئے اک زمانہ گذر چکا تھا۔ خیالات کی بھول بھلیوں میں فدا اسقدر محو ہوگیا کہ اپنے گرد و نواح کی چیزوں پر نظر تک ڈالنا بھول گیا۔ وہ بھول گیا تھا کہ بہار کا موسم ہے اور اس کا دوست بیمار ہے۔ پیارے نغموں کی تانیں دور کسی ساحل سے ہوا کے دوش پر سوار اس کے کانوں میں آرہی تھیں۔ عجیب و غریب اشیا معمولی چیزوں سے گھل مل گئی تھیں۔ اس کی روح اڑ رہی تھی۔ ذہن کے سیاہ خزانوں سے، ماضی کی خوفناک گہرائیوں سے وہ تمام شکلیں جنہوں نے کبھی اسے مسرور کیا تھا یا تکلیف دی تھی اس کے سامنے آ گئیں۔ وہی ناقابل شناخت سائے جو کبھی اس کے سر پر پھڑپھڑایا کرتے تھے اس کے سر پر بھنبھناتے ہوئے چکر کاٹ رہے تھے۔ تتلیاں اور جنات اس کے سامنے محو رقص تھے۔ اور اسکی نظر کے سامنے اس طرح تار باندھ رکھا تھا کہ سبز میدان میں ایک بھی پھول نظر نہ آتا تھا۔ اس کے پہلے تعشق کی یاد نے صبح کے دھندلکے کی طرح اس کو گھیر لیا اور اپنی قوس و قزح چراگاہ پر پھیلا دی۔ اس کے گذشتہ رنج و الم سلسلہ وار سامنے آئے اور گذر گئے۔ لیکن سفر کے اختتام پر اسکا ویسا ہی استقبال کرنے کی دھمکی بھی دیتے گئے۔ فدا نے ان بھاگتے ہوئے خیالات کو پکڑنے کی کوشش کی۔ خود کو اس جادو کے جال سے باہر نکالنے کی سعی کی لیکن سب بے سود۔ اس کے خیالات معموں کے نقوش کی طرح ناقابل فہم اور حیران کن تھے۔

جنگل ختم ہوگیا۔ فراخ میدان کے ایک گوشہ میں کچھ کھنڈرات کھڑے تھے۔ فدا اپنے خیالات میں محو اتنی جلدی یہاں پہنچ جانے پر متعجب ہوا۔ جنگل کی گھنی چھاؤں سے چھٹکارا پاتے ہی اس نے اُداسی سے بھی نجات حاصل کرلی کیونکہ اکثر ہمارے دل میں بیرونی اشیاء کی تصاویر منقوش ہوتی ہیں۔ اب اس کے دل پر اس کی شعریت کے کیف کی یاد صبح کے خورشید کی طرح چمکنے لگی۔ موسیقی کی لافانی ہم آہنگی کے مزے جن سے کئی بدنصیب انسانوں کے کان آج تک ممنونِ احسان نہیں ہوئے۔ پھر عود کر آئے۔

"کس حیرت انگیز طریقہ سے وہ نغمے جو میلوں کی مسافت اور عمیق گہرائیوں سے جدا معلوم ہوتے تھے ایک دوسرے میں مل جاتے تھے" اس نے کہا: "میرے مبہم سے خیالات عملی جامہ پہن لیتے اور اک خاص صورت اور ہزاروں ماتحت اشکال میں مجھے نظر آجاتے جن کے نظارہ سے پہلے میری آنکھیں محروم تھیں۔ اس طرح میرا دائرۂ واقفیت وسیع ہوتا گیا اور ان اشیاء سے روشناس ہوگیا جن سے ہمکلام ہونے کی مجھے آرزو تھی۔ زمین نے اپنے بہترین خزانے جن کی تلاش میں میرا بیقرار دل مدت سے حیران تھا میرے قدموں پر نثار کر ڈالے اے خیال اور شعریت کی قوی طاقتو! میں تمہارا سپاس گذار ہوں۔ تم نے میرے لئے شاہراہ زندگی کی کٹھن منزلیں جو مجھے ناہموار اور حیران کن نظر آتی تھیں صاف اور نرم کردیں۔ تم نے مجھے مسرت اور سرور حاصل کرنے کے نئے ذرائع بتا دیئے۔ اب میری نظر میں کوئی صحرا بھی خشک نہیں۔ میرے ارضی دل کے گرد شیریں آسمانی جذبات کی ندیاں رواں ہیں۔ آسمانی مکینوں سے بھی ہمکلام ہوچکا ہوں۔ میں کیف سے سرشار ہوگیا ہوں"۔

سورج افق میں پنہاں ہونے لگا۔ اسقدر جلد شام ہوجانے پر فدا حیران تھا۔ اسے تھکان کا احساس نہ تھا لیکن وہ اپنی منزل مقصود سے جہاں وہ شب کی تاریکی سے پہلے پہنچنا چاہتا تھا کافی دور تھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا رہا اور حیران تھا کہ شفق نے کس طرح بادلوں کے کناروں کو عنابی کردیا ہے اور جبکہ بلبل ابھی جھاڑیوں میں نالہ و فریاد کررہی ہے ہر شئے کا سایہ کیوں اتنا لمبا ہوگیا ہے۔ اس نے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی۔ کھنڈرات دور کھڑے شفق کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اسے یقین ہوگیا کہ وہ صحیح راستہ بھول گیا ہے۔

اب اسے بچپن کی دیکھی ہوئی ایک شکل یاد آگئی۔ یہ ایک حسین عورت کی صورت تھی جو سنسان کھیتوں سے سایہ کی طرح گذر جاتی اور پیچھے مڑ کر کبھی نہ دیکھتی تھی۔ وہ اس کا تعاقب کرنے اور عجیب و غریب نامحرم منظر دیکھنے پر مجبور ہوجاتا۔ اس پر اسرار کشش کی زد سے دور رہنا اس کے لئے غیر ممکن تھا۔ اس نے خوف سے جھرجھری لی۔ اس عورت کے صحیح خط و خال اس کے ذہن سے کوسوں دور تھے۔ اس نے ان تمام حسیات کو علیحدہ علیحدہ کرکے ملاحظہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اتفاقاً اس کی نظر ایسی جگہ پر جا پڑی جو اس نے پہلے کبھی مشاہدہ نہ کی تھی۔

"کیا میں کسی جادو کے زیر اثر ہوں" اس نے کہا: "یا میرے خواب اور میرے خیالات میرا دماغ پھرا دینے کا باعث ہیں۔ یا تنہائی کا حیرت انگیز اثر ہے کہ میں خود کو پہچاننے سے قاصر ہوں۔ یا ارواح خبیثہ اور جنات میرے ہوش و حواس کو لے کر اُڑ گئے ہیں۔ اگر واقعی میں خود کو ان اثرات سے آزادی نہیں دلا سکتا تو میرے لئے اُس بچپن کے ہر اک کنج تنہائی میں جھلک دکھانے والی جمیل عورت کا انتظار ناگزیر ہے۔

فدا ان بیہودہ خیالات سے نجات حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کرنے لگا تاکہ اپنے ذہن کی جد و جہد سے صحیح راستہ پر پہنچ جائے مگر اس کی یادگتھیوں میں اُلجھ کر رہ گئی۔ پھول فقط میں بڑھ گئے۔ شام کی سرخی زیادہ چمک اُٹھی۔ عجیب و غریب شکل کے بادل زمین پر جھک پڑے۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ کوئی پر اسرار منظر بادلوں کے پردے کے اٹھنے کا منتظر ہے۔ لہلہاتے ہوئے گھاس میں سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ پودے جھک جھک کے سرگوشیاں کرنے لگے۔ اور بہار کی ہلکی پھوہاراں پر گرنے لگی۔ تاکہ ہر اک پھول ہر اک جھاڑی اور ہر اک جنگل میں تمام خوابیدہ ہم آہنگیاں بیدار ہوجائیں۔ اب ہر شئے راگ سے معمور تھی۔ ہزاروں شیریں آوازیں ترنم ریز تھیں۔ تان سے تان مل گئی۔ نغمہ سے نغمہ لپٹ گیا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی زریں شعاعوں میں بے شمار نیلگوں تیتریاں

مصروف پرواز تھیں۔ اور شام کی سہانی دھوپ ان کے لہراتے ہوئے بازوؤں پہ درخشاں تھی۔ فدا کو خواب کا سا سماں نظر آنے لگا عنابی بادل یکدم پھٹ گئے اور ناقابل پیمائش دوری پر پرستان کا اک منظر نمودار ہو گیا۔ اک وسیع میدان ہرے بھرے درختوں شبنم آلود سبزہ سمیت دھوپ میں جگمگا رہا تھا۔ اس کے وسط میں ایک رنگین محل تھا جو زرد جواہرات اور ہزاروں ناہموار دھنکوں کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ شفاف ندی اس کے ہزاروں رنگوں کو منعکس کر رہی تھی۔ اور ایک بلکی آتشیں ہوا جادو کی طرح اس محل کو گھیرے ہوئے تھی۔ خوش الحان طیور جو اس نے کبھی نہ دیکھے تھے، کھیل میں اپنے سرخ و سبز بازو کو بجاتے اڑ رہے تھے اور ان کے نغموں کی روانی ان کی پرواز سے بھی تیز تھی۔ بڑی بڑی بلبلیں دلنشیں نغمے گا رہی تھیں اور ان کی صدائے بازگشت فضائیں ہر طرف گونج رہی تھی۔ پھڑپھڑاتے ہوئے شعلے سرسبز گھاس سے اُٹھ رہے تھے اور سانپ کی طرح محل کے اردگرد لہرا رہے تھے۔ فدا نزدیک چلا گیا اور اس نے ہزاروں سہمیں آوازیں مندرجہ ذیل الفاظ دوہراتی سنیں:۔

"نچلی زمین کے بسنے والے مسافر! آگے مت بڑھو۔
ہمارے محل کی جادو کی روشنی میں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہ۔
اگر تیرے بیقرار دل کو مسرت کی دور افتادہ صبح کا انتظار
رہا ہے تو رنج و الم کو دور پھینک دے
اور اس محل میں جس کی ہر شخص کو آرزو ہے آجا۔"

بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فدا محل کی چمکتی ہوئی دہلیز تک چلا گیا اور اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔

"اس طرف۔ اس طرف۔" محل کے اندرونی حصہ سے صدا آئی۔ دھڑکتے ہوئے دل کو تھامے ہوئے اس نے اس آواز کا تعاقب شروع کیا۔ تمام گذشتہ تفکرات اور دیرینہ آلام اس کے ذہن سے حرف غلط کی طرح مٹ چکے تھے۔ اس کا باطن نغموں سے جو اس کے ظاہر کو گھیرے ہوئے گونج رہا تھا۔ ہر اک غم فنا کے گھاٹ اتر چکا تھا اس کی ہر اک ظاہر و پنہاں آرزو بار آور ہو چکی تھی۔ اس کو بلانے والی آواز اتنی بلند ہو گئی کہ محل کا کونہ کونہ گونج اُٹھا۔ دیر سے وہ محل کے وسطی کمرہ میں کھڑا تھا لیکن وہ اس آواز کے منبع کا سراغ نہ لگا سکا۔

آخرش ایک سرخ گالوں والا لڑکا آگے بڑھا اور اجنبی مہمان کو سلام کیا۔ وہ ایسے رفیع الشان کمروں سے ہوتا ہوا اسے باغ میں لے گیا جہاں اس کے قول کے مطابق فدا کا انتظار کیا جا رہا تھا کیف سے سرشار وہ رہبر کے پیچھے تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔ ہوا ہزارہا پھولوں کی مست خوشبو سے مہک رہی تھی۔ فراخ سایہ دار روشیں اس کے استقبال کے لئے سامنے کھڑی تھیں۔ اس کی خیرہ نظر سر بفلک درختوں کی چوٹیوں تک بمشکل پہنچ سکتی تھی۔ نیچے سایہ میں بیٹھے ستار بجا رہے تھے اور پرندوں سے سر ملا کر میٹھی میٹھی تانیں اڑا رہے تھے۔ فواروں کے دھندلا پانی پر صبح کی سرخی جھلک رہی تھی پھول زمین سے جھاڑیوں کے برابر اُٹھ آئے تھے اور راہگذر کے راستہ سے خود بخود اک طرف ہٹ جاتے تھے کہ پامال نہ ہو جائیں۔ اس کا جسم شیریں جذبات و حسیات کا گہوارہ تھا۔ ان خالص آسمانی مسرتوں سے وہ پہلے کبھی لطف اندوز نہ ہوا تھا۔ وہ مسرور تھا . . . . . بے حد مسرور۔

درختوں میں سیمیں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ان کی چوٹیاں زمین بوس ہو گئیں۔ پرندے اور سازندے خاموش ہو گئے۔ گلاب کی کلیاں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔ رہبر اجنبی کو ایک دلفریب محفل میں لے گیا۔

پرحشمت و حسین خواتین سبزہ نورستہ پر بیٹھی مصروف گفتگو تھیں۔ وہ نسل انسانی کے اوسط قد سے قدرے بلند تھیں۔ ان کے غیر فانی حسن نے فدا کے دل میں جذبات خوف و احترام پیدا کر دیئے اور اسے ان کی گفتگو میں مخل ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ ہومر کے گیت کی دیویوں کے حضور میں کھڑا ہے جہاں ہر اک خیال کا اخراج جو انسانی گفتگو کا موضوع بن سکتا ہے ازبس لازمی ہے۔ عجیب الخلقت ننھی پریاں ان کے گرد حلقہ کئے تھیں اور گوش برآواز حکم کی منتظر تھیں کہ فوراً حالت سکون کو چھوڑ کر تعمیل ارشاد کریں۔ پریوں نے اپنی نظریں اجنبی کے چہرہ پر

گھڑیں اور ایک دوسرے کو بامعنی نظروں سے دیکھ کر مسخرانہ انداز میں مسکرانے لگیں آخر حسین خواتین کا مکالمہ ختم ہوگیا۔ فدا کو اشارہ سے نزدیک بلایا گیا۔ وہ ڈرتا ڈرتا قریب چلا گیا۔

"ڈرو مت" حسین ترین خاتون نے کہا" ہم سب تمہیں خوش آمدید کہتی ہیں۔ مدت سے ہم تمہاری منتظر تھیں۔ عرصہ دراز سے تمہاری بھی اس محل تک رسائی حاصل کرنے کی خواہش رہی ہے۔ کیا اب تم مطمئن ہو؟"

فدا نے جواب دیا۔ خوشی کا اظہار میرے لئے ناممکن ہے میرے محبوب ترین خواب پورے اُتر چکے ہیں۔ میری تمام گستاخ آرزوئیں پوری ہو چکی ہیں۔ ہاں میں بالکل مطمئن ہوں۔ میں اپنی امیدوں کے لہلہاتے ہوئے گلستاں میں کھڑا ہوں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میں یہاں کیسے پہنچ گیا۔ مگر میرے لئے اتنا ہی بس ہے کہ میں یہاں ہوں۔ اس معمہ کی بدولت اک نئی تکلیف کیوں ایجاد کرلوں جبکہ میرے آنسو ابھی بمشکل خشک ہوئے ہیں"

"کیا یہ زندگی تمہاری گذشتہ زندگی سے کچھ بہت مختلف ہے؟" خاتون نے دریافت کیا۔

"گذشتہ زندگی کا ایک لمحہ بھی مجھے یاد نہیں۔ لیکن کیا واقعی یہ روپہلی زندگی میرے مقسوم میں آچکی ہے۔ یہ حسین زندگی جو میرے جسم کے ہر ذرہ ذرہ کا نصب العین تھی، یہ سنہرے ایام جن کے تعاقب میں میری ہر آرزو سرگرداں تھی، یہ عافیت کے دن جن کی دھندلی سی تصویر میرے دل کی انتہاہ گہرائیوں میں منقوش تھی، کیا یہ سب کچھ مجھے بخش دیا گیا ہے؟ جس نئے دور کی آغوش میں اب ہوں کیا میں ہمیشہ یہیں رہوں گا؟ آہ! مجھے معاف کیجئے گا۔ مسرت کے نشے میں خدا معلوم میں کیا کچھ کہہ گیا ہوں۔ ایسی رفیع المرتبت محفل میں بولنے سے پہلے اپنے الفاظ کو تولنا میرے لئے لازم تھا"

خاتون نے آہ بھری اور چشم زدن میں ہر شے میں حرکت نمودار ہوگئی۔ درختوں میں سرسراہٹ پیدا ہوگئی۔ ہر طرف خدام دوڑ دھوپ کرنے لگے اور بعجلت تمام فدا کے سامنے خوشبودار شرابیں اور لذیذ میوے سجا دئے گئے۔ فدا بیٹھ گیا۔ نغمے ایک دفعہ پھر فضا میں لہرے لینے لگے حسین لڑکوں اور لڑکیوں کی قطاریں اس کے اردگرد مصروف رقص ہوگئیں۔ ان کی بے نظیر چابکدستیاں سینکڑوں قہقہوں کا موجب بنیں۔ فدا ہر آواز اور ہر حرکت پر غور کرتا رہا۔ اس مسرت آمیز زندگی میں حصہ لیتے ہی اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کی پیدائش از سر نو ہوئی ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ ہماری ان موہوم امیدوں اور ان شیریں خوابوں کا جو ہماری امیدوں سے پیشتر ہی درست ثابت ہو جاتے ہیں، کیوں اتنی بیدردی سے مضحکہ اڑایا جاتا ہے؟۔ سچائی اور غلطی کے درمیان وہ حدِ فاصل کہاں ہے جس کے اظہار میں فانی انسانی کو لطف آتا ہے؟ - میں گذشتہ زندگی میں اکثر راہ راست سے بھٹک جاتا رہا ہوں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں قبل از وقت اس مسرورکن انتقال کے لائق ہوگیا ہوں۔

ناچ ختم ہوگیا۔ سورج محراب مغرب میں جھک چکا تھا۔ خواتین کے اٹھنے پر فدا بھی ان کے ہمراہ باغ کی سیر کے لئے روانہ ہوگیا۔ بلبلیں دھیمی دھیمی آواز میں مصروف فغاں تھیں۔ چاند آہستہ آہستہ افق سے ہویدا ہوا۔ کلیاں اس کی سیمیں کرنوں میں مسکرانے لگیں۔ ہر برگ و گیاہ جگمگا اٹھا۔ درختوں کے جھنڈ روشن ہوگئے۔ اور ان کے سائے زمین پر تھرانے لگے۔ خاکی ابر کے ٹکڑے سبزہ پر خوابیدہ تھے۔ فوارے خالص سونے میں تبدیل ہوگئے۔ اور بلند تر ہو کر فضا میں چھٹنے لگے۔

"اب تمہارا دل آرام کا متمنی ہوگا"، حسین ترین خاتون نے کہا۔ اور فدا کو ایک گنجان جھنڈ میں ہری ہری گھاس کا بچھونا دکھا دیا۔

فدا درختوں کی بل کھائی ہوئی شاخوں میں سے جادو بھری شفق کو دیکھنے لگا اور یوں گویا ہوا۔ "کتنا حیرت فزا منظر ہے۔ شاید اس وقت میں سو رہا ہوں اور میں خواب میں خود کو دوبارہ نیند کے ہم آغوش پاؤں اور شاید خواب میں مجھے اک اور خواب نظر آئے۔ ممکن ہے یہ سلسلہ تا ابد جاری رہے۔ اس صورت میں کوئی انسانی قوت مجھے نیند سے بیدار نہ کر سکے گی۔ توبہ! میرا یقین بھی کس درجہ متزلزل ہو رہا ہے۔ یہ ایک دلفزا حقیقت ہے جو اس وقت میرے گرد حلقہ کئے ہے۔ اور میری گذشتہ حالت شاید ایک المناک

خواب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی" وہ لیٹ گیا۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اس کے گرد کھیلنے لگے۔ ہوا کی دست درازیوں سے خوشبو باغ میں پریشان ہو گئی۔ ننھے پرندوں نے لوریاں گانی شروع کیں اور نیند نے فدا کی پلکوں کو بوجھل بنا دیا۔ خواب میں اس نے دیکھا کہ تمام باغ تباہ ہو چکا ہے۔ دیو نما درخت خشک ہو گئے ہیں۔ سنہری چاند افق سے گر گیا ہے اور ایک نفرت انگیز سیاہ داغ چاند کی جگہ آسمان پر باقی رہ گیا ہے۔ فواروں سے پانی کی بجائے پست قد جنات نکل رہے ہیں اور عجیب عجیب رقص اٹھتیا دکر کے فضا میں ناچ رہے ہیں۔ نغمے کی حلاوت کی جگہ نمکین اشکوں نے لے لی ہے۔ اور اس مسرت زا محل کے آثار قطعاً ناپید ہو چکے ہیں۔ فدا خوفزدہ ہو کر اٹھ بیٹھا اور اس وقت تک فانی دنیا کے مکینوں کی سنت کے مطابق مشکوک خیالات کا حامل ہونے کے لئے خود کو ملامت کرنے لگا۔

غیر فانی مناظر کو ایک دفعہ پھر دلفریب صبح نے آشکارہ کر دیا۔ اور خواتین نے آ کر اس کی خیریت دریافت کی۔ وہ ان سے گرمجوشی سے گفتگو کرتا رہا۔ آج اسکی طبعیت کا زیادہ رجحان خوشی کی طرف تھا۔ کیونکہ اردگرد کے مناظر میں اس کو حیران کرنے کی طاقت اب کچھ کم تھی۔ وہ باغ کی سیر اور غیر فانی دنیا کے عجائبات کی دیکھ بھال میں دن گزارنے لگا۔ اس طرح کئی دن اس نے ہنسی خوشی بسر کئے۔ اسے یقین تھا کہ اس سے زیادہ تن آسانی اور آرام اسے کہیں نصیب نہیں ہو سکتا۔

کبھی کبھی مرغ کی اذان اس کے کانوں تک پہنچتی اور اسوقت تمام ایوان میں زلزلہ آ جاتا۔ محل بنیادوں سے ہلنے لگتا اور اس کے ہمنشینوں کے چہرے ماند پڑ جاتے۔ یہ واقعات شام کے وقت ظہور پذیر ہوتے اور اس کے بعد فوراً سب مکیں آرام کرنے کے لئے چلے جاتے۔ بستر پر لیٹ کر فانی دنیا کا کوئی خیال فدا کے ذہن میں چکر لگایا کرتا۔ وہ دعا کرتا کہ یہ غائب ہو جانے والے خیالات چند لمحے قیام کریں۔ وہ آرزو کرتا کہ فانی دنیا کی شاہراہ کا کوئی منظر اسے نظر آ جائے کیونکہ اس کے خیال کے مطابق سڑک کہیں نزدیک ہی ہونی چاہئے تھی۔ ایک روز دن ڈھلے کھلی کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر کہنے لگا۔ گذشتہ دنیا کی صاف اور روشن تصویر مجھے کیوں نظر نہیں آتی؟ اسیطرح زمانہ ماضی میں مجھے اس شاعرانہ زندگی کا نقشہ صاف نظر نہ آتا تھا" یکایک دور سے تانگے کی گھنٹی کی آواز اور پہیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی فدا اچھل پڑا۔ کس حیرت انگیز طریقے سے ایک معمولی سی روشنی ایک معمولی سی گذشتہ زندگی کی یادگار میری خوشی پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ اور مجھے مایوس و مغموم بنا رہی ہے۔ کیا مجھے کسی چیز کی کمی ہے؟ کیا میری حسرت یہاں بھی مکمل نہیں"

حسین خواتین نے آ کر پوچھا "تمہیں کس بات کی آرزو ہے؟ تم کیوں اداس نظر آتے ہو؟"

"تم میرا مضحکہ اڑاؤگی" فدا نے کہا۔ لیکن خدارا میری ایک بات قبول کرو۔ اس دوسری زندگی میں میرا ایک دوست تھا جس کی اب صرف اک دھندلی سی یاد باقی ہے۔ وہ بیمار ہے اپنی کرامت سے اسے تندرست کر دو"

انہوں نے کہا۔ تمہاری آرزو پوری ہو چکی ہے"

"لیکن" فدا نے کہا۔ وعدہ کرو تم میرے دو سوالوں کا درست جواب دو گی"

"بولو۔"

کیا اس نرالی دنیا پر محبت کی کوئی کرن نہیں پڑتی؟۔ کیا اس محل میں دوستی کی حکومت نہیں؟ میرا خیال تھا کہ محبت کی بہار کی صبح کا ملگجا یہاں ابدی ہو گا۔ میری گذشتہ دنیا میں تو محبت چند دنوں کی مہمان ہوتی تھی اور انسان اس کے متعلق گفتگو کرتے وقت اسے ایک کہانی سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ سچ پوچھئے تو مجھے ان حسیات سے دوچار ہونے کی ناقابل بیان آرزو ہے

"تم زمین پر واپس جانا چاہتے ہو"

"ہرگز نہیں" فدا چلایا۔ کیونکہ اس سرد دنیا میں دوستی اور محبت کے لئے آہیں بھرا کرتا تھا اور وہ میرے نزدیک تک

نہ چٹکتی تھیں سان کی آرزو ہی ان چیزوں کی جگہ میرے دل میں رہا کرتی تھی۔ اسی وجہ سے میں نے اپنے خیالات کو اس دنیا کی طرف مبذول کیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہاں ہر شے حسین ہم آہنگی میں نظر آئے گی۔"

"بیوقوف" خاتون نے کہا۔ "زمین پر رہنے کے باوجود تم زمین کے لئے آہیں بھرتے رہے ہو۔ تمہیں معلوم نہ تھا کہ یہاں آنے کی خواہش کرکے تم کیا کر رہے ہو۔ تم اپنی آرزوؤں سے بہت آگے بڑھ گئے۔ تمہارا دل فانی انسانوں کے حسیات کی بجائے تصوروں سے بھرا پڑا تھا۔"

"تم کون ہو؟" فدا نے حیران ہوکر پوچھا۔

"ہم پریاں ہیں"۔ اس نے کہا۔ "جن کے متعلق کچھ نہ کچھ تم پہلے سن ہو چکے ہو گے۔ اگر تمہاری خواہش زمین پر ہی بسنے کی ہے تو تم وہاں جا سکتے ہو۔ جس وقت فانی انسان رات کو نیند میں مدہوش ہوتے ہیں ہم دنیا پر حکمران ہوتی ہیں۔ ان کا دن ہماری رات ہے۔ مدتوں سے ہماری حکومت چلی آ رہی ہے۔ اور صدیوں اسی طرح قائم رہے گی۔ ہماری پوشیدہ قوت انسانوں کے دلوں پر حکومت کرتی ہے۔ صرف تمہاری آنکھوں نے ہی اس کا نظارہ دیکھا ہے۔" فدا کو معاً یاد آگیا کہ یہ وہی صورت ہے۔ جس کا وہ آنکھیں بند کئے بچپن سے تعاقب کر رہا تھا۔ فدا یہ کتنا ہوا اس کے پیچھے بھاگا۔ "نہیں۔ نہیں۔ میں زمین پر واپس نہ جاؤں گا۔ میں یہیں رہوں گا۔" پھر خود سے کہنے لگا۔ "اس مقبول صورت کو میں بچپن سے دیکھ رہا ہوں۔ کئی معمہ کا حل جس کی تلاش میں مدتوں خاک چھانی ہے۔ اپنے من کے اندر ہی مل سکتا تھا۔"

وہ بھاگتا بھاگتا بہت دور نکل گیا۔ پریوں کا باغ پیچھے رہ گیا۔ وہ ایک پہاڑی پر چڑھ گیا۔ جہاں عشق پیچاں کی بیلیں عجیب بے ترتیبی سے چٹانوں سے لپٹی ہوئی تھیں۔ چٹان پر چٹان دھری تھی اور خوف و ہیبت فضا میں مستولی تھے۔ وہاں ایک اجنبی مسافر آیا اور ملائمت اور مہربانی سے یوں گویا ہوا۔ "تمہیں دوبارہ مل کر مجھے بے حد مسرت ہوئی ہے۔"

"میں تمہیں نہیں جانتا" فدا نے کہا۔

شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن ایک وقت تمہیں یہ خیال تھا کہ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ میں تمہارا پیارا دوست ہوں۔"

"ناممکن! میرے لئے تم بالکل اجنبی ہو۔"

"صرف اس لئے" اجنبی نے کہا۔ "کہ تم آج پہلی مرتبہ مجھے اصلی صورت میں دیکھ رہے ہو۔ اس وقت تک تمہیں صرف اپنے دل کے خیالات کا عکس نظر آتا رہا ہے۔ تمہارا یہاں رہنا بھی درست ہے۔ کیونکہ یہاں نہ محبت ہے نہ دوستی۔ اس جگہ ..... میرا مطلب ہے۔ جہاں تمام غیر حقیقی خیالات کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔"

فدا بیٹھ کر رونے لگا۔

اجنبی نے پوچھا۔ "بھلا رنجیدہ کیوں ہو رہے ہو؟"

"اپنے بچپن کے دوست کی خاطر۔ آؤ میرے ساتھ آؤ! چلو پیاری زمین پر چل کر رہیں۔ زمین پر۔ جہاں ہم ایک دوسرے کو غیر حقیقی صورتوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ جہاں دوستی اور محبت کا وہم ہمارے دلوں پر حکمران رہتا ہے۔ میرا جی یہاں رہنے سے اکتا گیا ہے۔"

"تمہارا وہاں جانا بے فائدہ ہوگا۔ تم پھر یہاں واپس آنے کی خواہش کروگے۔ زمین تمہارے سے کچھ روشن نہ ہوگی۔ پھول تمہیں ننھے ننھے نظر آئیں اور تمہیں کوئی مسرت نہ دے سکیں گے۔ کیونکہ جلد ہی فنا ہو جاتے ہیں۔ رنگ اتنی شوخی سے بہار نہ دکھا سکیگا۔ ننھے پرندوں کو ہر وقت موت کا خیال دامنگیر رہتا ہے۔ اس لئے وہ اعتدال سے گاتے ہیں۔ نغمہ خوف سے رکا ہوا ہوگا۔ لیکن یہاں ہر شے شایان شان ہے۔"

"آہ! میں قناعت سیکھ لوں گا" فدا نے کہا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔ "خدارا! مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ ایک دفعہ پھر میرے دوست بن جاؤ۔ چلو اس صحرا کو چھوڑ دیں۔ ان رنگین آلام کو خیرباد کہہ دیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول لیں۔ کیونکہ کوئی اسے زور زور سے جھنجھوڑ رہا تھا۔ اس کے دوست کا چہرہ اس کے سامنے تھا۔

فدا نے کہا۔ "کیا تم مر چکے ہو؟"

"ارے سونے والے۔ خدا تجھے عقل دے۔ میں تندرست ہو گیا ہوں۔ اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔ گاڑی ہماری منتظر ہے۔ جلدی کرو۔ طوفان رعد و باراں آ رہا ہے۔"

فدا اٹھ بیٹھا۔ نیند میں وہ درخت کے تنے سے ڈھلک گیا تھا۔ بیمار دوست کا خط پاس پڑا ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ "تو کیا میں واقعی زمین پر آگیا ہوں۔" اس نے خوشی سے کہا۔ "کیا یہ کوئی نیا خواب تو نہیں؟"۔

"تم زمین کی مضبوط گرفت سے ہرگز نہیں بچ سکتے۔" اس کے دوست

نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور دونوں ایک دوسرے کے مضبوط بازوؤں میں تھے۔

"آہ! میں کتنا خوش ہوں" فدا نے کہا۔ "تم تندرست ہو۔ ایک دفعہ پھر میرے پاس ہو اور پھر وہی سماں ہے۔ اب لطف بہار ہے"

اس کے دوست نے جواب دیا "تمہاری میں بیمار ہوگیا اور اچانک ہی تندرست بھی ہوگیا۔ اس لئے میں تمہیں ملنے کے لئے گھر سے روانہ ہوگیا تاکہ میرے خط نے جو پریشانی پیدا کی ہو اس کو مٹا دوں۔ اور یہاں نصف رستہ میں تم مجھے سوئے ہوئے نظر آگئے"

"میں تمہاری محبت کے قابل نہیں" فدا نے کہا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ ابھی ابھی مجھے تمہاری دوستی پر شبہ تھا"

"لیکن نیند میں!"

"تو کیا ہوا۔ کیا سچ مچ دنیا میں کوئی ہستیاں ایسی ہیں جنہیں پریاں کہا جاتا ہے"

پریاں یقینی طور پر دنیا میں موجود ہیں۔ مگر یہ غلط ہے کہ ان کا مقصد حیات صرف انسانوں کو خوش کرنا ہے۔ وہ ہمارے دلوں میں ایسی آرزوئیں پیدا کر دیتی ہیں جن سے ہم خود بھی ناواقف ہوتے ہیں مثلاً غیرانسانی زندگی کے لئے غیرانسانی لالچ۔ اور اس طرح ان کے جادو کے زیراثر اس دنیا اور اس کے شاندار مظہرات سے ہمیں نفرت ہوجاتی ہے"

فدا نے اس کا جواب صرف ہاتھ کے دباؤ سے دیا۔

(اے یوخاں ٹکہ بی اے)

جذبات ٹیگور

(جناب شاطر غزنوی)

تم وہاں خواہ مخواہ کیوں بیٹھی ہو۔ اور کھیل کے طور پر فضول اپنے کڑے کیوں بجا رہی ہو؟

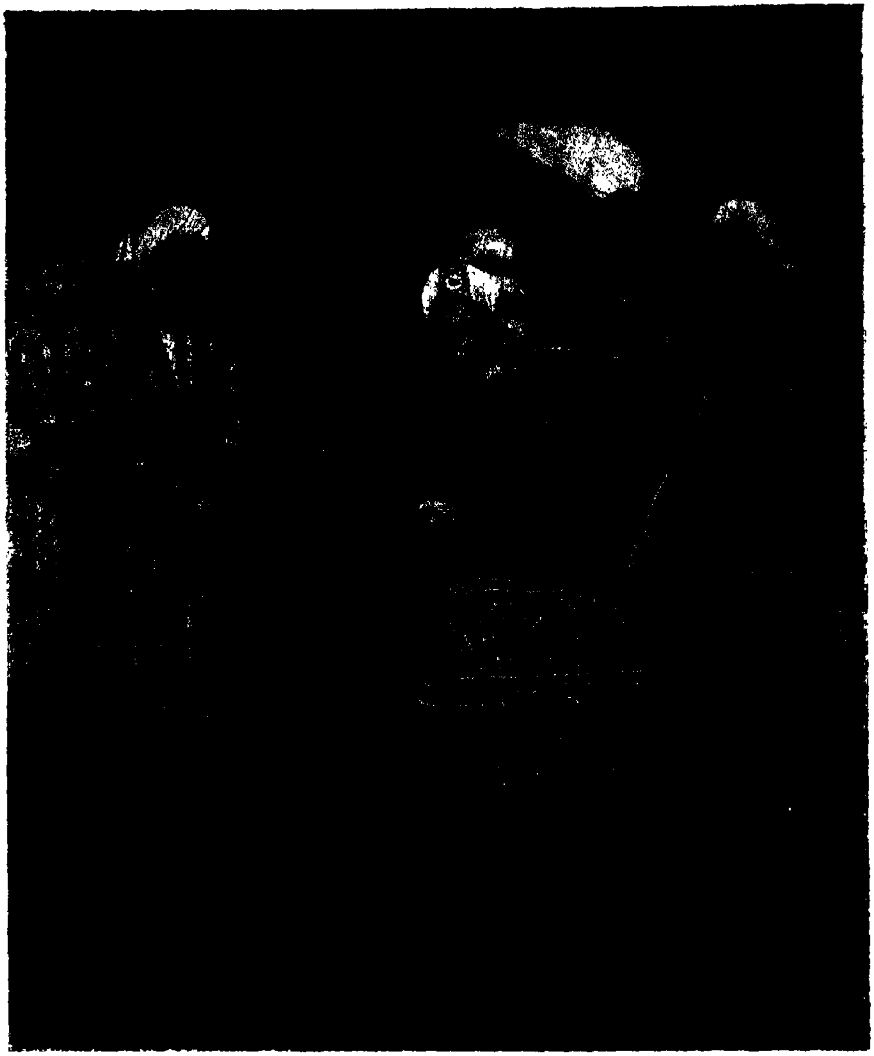
اپنی گاگر بھرو ـــــ یہ وقت گھر جانے کا ہے۔

تم بیکار کھیل کے طور پر اپنے نازک ہاتھوں سے پانی کیوں اچھال رہی ہو؟ کسی کے انتظار میں رہ رہ کر سڑک کی جانب کیوں اٹھتی ہیں ـ؟

اپنی گاگر بھرو ـــــ گھر جانے کا وقت ہوگیا ہے۔

لمحات صبح گذرتے چلے جارہے ہیں۔ پانی بہہ رہا ہے۔ لہریں فضول ہنس رہی ہیں۔ اور باہم سرگوشیوں میں معروف ہیں سحاب آوارہ کے ٹکڑے سامنے بلند زمین پر افق آسمان میں جمع ہو رہے ہیں۔ فضول کھیل کے طور پر وہ ٹھہر جاتے ہیں اور تمہارے رخ پرنور کے نظارے میں محو ہو جاتے ہیں۔

اپنی گاگر بھرو ـــــ گھر جاؤ۔



ہمایوں

نمائش

از حضرت ملا رموزی

اس نمائش سے وہ نمائش مقصود نہیں جسمیں نہایت حسین اور خوبصورت بازاروں کے لئے شہر اور قصبات کے دکانداروں کی "سرکاری شامت" آجاتی ہے اور نمائش کے منتظم لوگ کسی دکاندار سے یوں مخاطب نظر آتے ہیں کہ

ابے تیرے باوا کو دکان لیجانا پڑے گا نمائش میں،

اور یہ جو حکم آیا ہے کلکٹری سے تو اسکی تعمیل تو کریگا یا ہم؟

تو کہہ تو رہے ہیں گنوار تجھ سے کہ ہاں صرفہ بھی ملیگا صرفہ،

اچھا تو بس سمجھ گئے ہم کہ تو بغیر جوتے کے نہ جائے گا،

ارے بھی مر اکیوں جاتا ہے بس ایک ہفتہ کی بات ہے

اور دیکھ وہ ملا رموزی صاحب تک کی دکان موجود ہے وہاں پھر کیا انہیں صرفہ نہ ملا ہوگا

ابے اُلو وہاں صاحب ملاحظہ فرمائینگے تیری دکان کو اور انعام دینگے،

پھر وہی بک رہا ہے،

لاحول ولا،

اماں ہیڈ صاحب ایک طمانچہ تو مارو اس مردود کے منہ پر،

ابے کہہ رہے ہیں کہ اب ملا رموزی صاحب کا زمانہ گیا، اب ہمارا انتظام ہے وہاں،

بس تو ٹھیک دو بجے دفتر سے گاڑیاں آجائیں گی،

جتیا سامان لادو دینا، دام دلانے کا ذمہ ہمارا،

اور نہ اس نمائش سے وہ علی گڈھ کی نمائش مقصود ہے جس میں شرکت کے لئے تو بھی چل میں بھی چل یہ بھی چل وہ بھی چل، طلبہ بھی حسینوں کا لباس پہنکر چل، چپڑاسی بھی چل اور تو اور وہ پروفیسر لوگ بھی ٹینس کا بلا ہاتھ میں لئے کھیل سے سیدھے اس نمائش میں "چل ہو جاتے ہیں" پھر خریداری کا یہ عالم کہ یہ بھی خرید وہ بھی خرید لے سے بھی خرید اور بس چلے تو ایک چھوڑ دس ملا رموزیوں تک کو خرید لیں

اور نہ وہ نمائش مقصود ہے جس میں زائرین و شائقین اور مسافروں کو جلد پہونچانے کیلئے تانگے والے اور لاری والے مارے "گھوڑ دوڑ" اور تیز رفتار مقابلے کے سڑک پر گذرنا محال کر دیتے ہیں اور بعض ملا رموزی قسم کے تانگے والے اس گھوڑ دوڑ میں ایک ہاتھ سے گھوڑے کو رسی گھما گھما کر مارتے بھی جاتے ہیں اور چلا چلا کر یوں گاتے بھی جاتے ہیں ع مرے مولا بلالے مدینے مجھے،

بلکہ اس نمائش سے مقصد ہے اس نمائش کے چند نمونے پیش کرنا جو انسان کی دانستہ حرکات سے پیدا ہوتی ہے اور جسے "بناوٹ" "دکھاوا" اور "صنعت" بھی کہتے ہیں،

لہذا واضح ہو کہ نمائش کا دوسرا نام "نام و نمود" اور مولویوں کی بولی میں اسکا نام "ریاکاری" بھی ہے، جس کے اختیار کر لینے سے مسلمان قیامت کے دن قبر سے اندھا اٹھ کھڑا اور ٹھکرایا" پھر سے گر کر دوزخ میں جل کر خاک ہو جائیگا" اب یہ معلوم کیجیے کہ گو انسان میں یہ جذبہ قدرتی اور طبعی ہے مگر اسکا اظہار اکثر موقع پر اپنے آس پاس کے حالات اور مؤثرات کے تابع ہے مثلاً آپ اپنے بنگلے سے "نہایت فدوی" "نہایت کمترین" "نہایت خاکسار" "نہایت ہیچمدان" "نہایت دعاگو" "نہایت فرماں بردار" "نہایت تابعدار" "نہایت نمکخوار" "نہایت خادم" "نہایت احقر" "نہایت نیازمند" "نہایت نیاز کیش" "نہایت نیاز آگین" اور "نہایت بندۂ بے دام" ہو کر نکلے اور جہاں آپ سے کسی نے کہا کہ

کہئے پروفیسر صاحب کہاں؟

کہ بس آپ نے ٹوپی اتار کر سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا، اور جھک کر دیکھا کہ جوتے پر زیادہ گرد تو نہیں چڑھ گئی تو سمجھ لیجیے کہ یہ "پروفیسرانہ نمائش" شروع ہو گئی، اب آپ کالج اور یونیورسٹی سے جتنا قریب ہوتے جائینگے آپکی یہ سمجھ موٹی ہوتی جائے گی" کہ میں پروفیسر ہوں" نتیجہ یہ نکلیگا کہ آپ اب دن بھر کرسی پر بیٹھکر پڑھانے کے عوض گھوم گھام کر پڑھاتے رہیں گے، اور چہرہ کو جتنا ہو سکیگا کھسیانہ بنانیکی کوشش کریں گے اور اگر مونچھیں بچ گئی ہیں تو انہیں بل دیجئے گا اور ترچھی نظر سے طلبہ کو دیکھتے جائیے گا کہ وہ دیکھ بھی رہے ہیں یا نہیں، یا پھر آپ ملا رموزی کے ساتھ

چلا چلا کر مذاق فرماتے ہوئے جارہے ہیں اور ہاتھ میں ہاتھ دیئے جھومتے ہوئے جارہے ہیں کہ جس سامنے سے طلبا نے نظر آئے کہ آپنے ملا رموزی سے کہا کہ

ذرا بھی خموش رہنا کالج کے دنڈے آرہے ہیں، پھر جب یہ طلبہ برابر گزرے اور سلام کیا تو آپنے نہایت موٹا چہرہ بناکر ہاتھ کے اشارہ سے جواب دیدیا، تو یہ بھی نمائش سمجھا جائے گا، "کبھی جائیگی اور اصول تعلیم میں یہ تمام نمائشیں حرام ہیں" کیونکہ عقلمند لڑکے ان حرکتوں سے بجائے رعب قبول کرنے کے تاڑ جاتے ہیں یا پھر مذاق اڑاتے ہیں۔

اگر آپ ہاکی کھیل رہے ہیں اور تماشائیوں کا مجمع بھی خاصا ہے اسلئے اب اگر سر کے بالوں کو اسطرح حرکت دینگے کہ وہ آپکی آنکھوں پر آجائیں اور پھر آپ انہیں نہایت نفاست سے سر ہلا کر یا گھڑی بندھے ہوئے ہاتھ سے پھر سیدھا کریں یا پسینہ صاف کرنیکے عذر سے ایک رنگین ریشمی رومال نصف پاجامے کی جیب میں اس طرح رکھیں کہ اسکا ایک حصہ تماشائیوں کو نظر آتا رہے یا اپنے ریشمی بنائین کو آپ باربار کھینچکر اپنے نصف پاجامے کے اوپر لائیں، یا بالوں کے بکھر جانے کے حیلے سے آپ اپنی سفید پیشانی پر ایک شوخ رنگ کا ریشمی رومال باندھ لیں، یا بغیر سورج کے سامنے آئے آپ ہاکی میں انگریزی سائبان والی ٹوپی اوڑھ کر ہاکی کھیلیں تو آپ کی یہ تمام حرکات ہاکیانہ نمائش مانی جائینگی، اور یہ سب اسلئے ناجائز ہیں کہ انہیں دیکھ کر تماشائی آپکا "لونڈاپن" اور "بے حیائی" قرار دیتے ہیں، اور یہ تو نہایت بھونڈی نمائش ہے کہ آپ ہر جلسے میں سب کے بعد تشریف لائیں تاکہ جلسہ کے زیادہ حاضرین آپکی تعظیم کیلئے بھی کھڑے ہوں اور تالیاں بھی بجائیں اور یہ تو حد سے سوا بھونڈی نمائش ہے کہ آپ غزل پڑھنے وطن سے چلکر مشاعرہ میں آئیں اور عین وقت پر کہیں کہ آج تمام دن میرے سر میں درد رہا اسلئے پڑھنے سے مجبور ہوں *یا یہ کہ غزل ابھی ناتمام ہے اور اصلاح طلب، یا تمام مشاعرہ والوں کو چھوڑ کر یہ کہیں کہ حضرت ملا صاحب ذرا یہ شعر ملاحظہ ہو، یا کھانس کھانس کر مجمع کو چور نظروں سے دیکھتے جائیں یا درمیان میں بغیر روزہ رکھے پینے کیلئے پانی طلب کریں، یا اپنے شاگردوں کی طرف اس مقصد سے غور کے ساتھ دیکھیں کہ داد کیلئے تم زور سے چلاؤ تو دوسرے بھی داد دیں، اور یہ تو ذلیل ترین نمائش ہے کہ آپ مرد ہوکر اسکول جائیں تو اس نزاکت سے گویا منی جان الہ آباد والی ملا رموزی صاحب کی شادی میں گانے اور ناچنے جارہی ہیں یعنی چست پاجامہ پر ریشم کی قمیص اسطرح پہن کر اوپر کا بٹن کھلا ہوا ہوتا کہ ماسٹر صاحب اور دوسرے لڑکے دیکھیں کہ قمیص کے اندر کتنی قیمتی بنائین ہے کہ جواب نہیں یا یہ سوچیں کہ آپکا گلا کتنا سفید اور نازک ہے کہ افوہ، یا آپ گرمی کے عذر سے اپنے ماسٹر صاحب کے سامنے ٹوپی اتار کر بار بار سر کے بال سنبھالتے جائیں اور دوسری لڑکوں کی طرف دیکھتے جائیں،

اور یہ نمائش کہاں کی قابل تعریف نمائش ہے کہ آپ روزانہ گلابی رنگ کی ساری پہنکر چشمہ لگاکر اور موٹر پر سوار ہوکر ٹھنڈی سڑک کے اسی حصے سے گذریں جدھر مرد زیادہ ہوں، البتہ اسے نمائش نہ کہیں گے کہ آپ اسی انداز کے ساتھ چاوڑی بازار دہلی کے کسی برآمدہ پر بیٹھی ہوئی ملا رموزی صاحب کے اشعار گنگنا رہی ہوں، ہاں یہ نمائش ضرور ہے کہ آپ نہایت نفیس کپڑے پہنے کمپنی باغ میں ٹہل رہی ہوں اور بار بار مردوں کی طرف دیکھتی جاتی ہوں، یہ بھی نمائش ہے کہ آپ غلام ہندوستانی ہوکر جب اپنے بنگلے پر آرام کرسی سے سر لگائے "پانیر اخبار" پڑھ رہے ہوں اور آپ کا کوئی ماتحت آپ کی خوشامد کے لئے حاضر ہو تو آپ اپنے قحط زدہ چہرے کو زیادہ رعب والا بنائیں، پیشانی پر بل ڈالیں اور اس بدنصیب قومی ماتحت سے نہایت خشک گفتگو فرماکر یہ کہیں کہ اچھا معاف فرمائیے اب میں تو ذرا غسل کیلئے اندر جاتا ہوں، پھر آئیے گا مجھے آپکا خیال ہے، یہ بھی نمائش ہے کہ آپ چندے پر گزارہ کرنیوالے لیڈر ہوکر ملا رموزی کے خط کا جواب خود نہ لکھیں بلکہ کسی دوسرے دوست سے لکھواکر آخر میں اپنے دستخط کردیں تاکہ ملا رموزی سمجھے کہ افوہ کتنے مصروف لیڈر صاحب ہیں کہ خط لکھنے کی بھی فرصت نہیں، یہ بھی نمائش ہے اور نہایت بھونڈی نمائش ہے کہ شام کے وقت آپ اپنے باغ میں یا صحن میں دس بارہ کرسیوں کے بیچ میں ایک آرام کرسی پر لیٹ کر بڑے نخرے سے حقہ پیتے جائیں، اور جو ملنے والے آئیں انہیں کھڑی کرسی پر جگہ دیں اور پھر بھی خود کو لکھا پڑھا مشرقی آدمی سمجھیں،

نیچری قسم کی نمائش یہ ہے کہ آپ ہندوستانی کارخانے کے بنے ہوئے ہوکر بھی انگریز بھائیوں کا سوٹ پہن کر ریلوے اسٹیشن پر جائیں اور ٹکٹ صرف انٹر کلاس ہی کا ہو مگر پلیٹ فارم پر دیسی مسافروں سے ایک طرف سیٹی بجا بجاکر یوں سگریٹ پیتے ہوئے ٹہلتے رہیں گویا آپکی ولایت لارڈ کرزن ہے، پھر یہ بھی نمائش ہے کہ انٹر کلاس میں آپ سوٹ پہنے ہوئے بیٹ کر اخبار "ٹائمس" خواہ مخواہ پڑھنے جائیں مگر پاس بیٹھے ہوئے ہندوستانی ملا رموزیوں سے یہ دریافت نہ کریں کہ

السلام علیکم ملا صاحب،

کہیے مزاج تو اچھا ہے،

آج کہاں تشریف لے جارہے ہیں آپ ؟

اگر ضرورت ہو تو میں اپنا بستر پیش کروں ؟

لیجیے یہ ناشتہ حاضر ہے،

اچھا تو یہ سگریٹ تو ملاحظہ فرمائیے،

جناب کا وطن ؟

* ہم ہر غزل نہایت محنت اور غور و فکر سے لکھتے ہیں اور مشاعرہ والوں سے کہتے ہیں

تو پھر علی گڑھ سے کب واپس ہوں گے آپ؟

یہ بھی نمائش ہے کہ آپ اپنے وطن میں تو ہوں فقط رام پرشاد اور ریل میں بیٹھے ہوئے مسافر کے دریافت کرنے پر آپ کہیں کہ میں دہلی جا رہا ہوں،

لکھنؤ میں میرے چچا جان بہت بڑے رئیس اور تعلقہ دار ہیں، دہلی میں بھی ہماری کوٹھیاں ہیں،

جی ہاں ملا رموزی صاحب میری خالہ زاد بھائی ہوتے ہیں، میں سنہ ۱۹۲۲ء میں لندن میں تھا تو یہ ہوا تھا اور سنہ ۱۹۲۶ء میں جب میں امریکہ گیا تو وہ ہوا،

جی الحمدللہ میں ملازم تو کسی کا نہیں کچھ تجارتی کاروبار کا سلسلہ ہے اور یورپ میں بھی میری ایجنسیاں ہیں، والد صاحب قبلہ آجکل بھی ولایت گئے ہوئے ہیں، مجھے ذرا طاعون کی شکایت ہو گئی ہے اس لئے بغرض علاج دہلی جا رہا ہوں،

بس سیسل ہوٹل میں ٹھیرونگا کیونکہ میری کوٹھی نئی دہلی سے بھی ذرا آگے ہے،

بس آپ سیسل ہوٹل کمرہ نمبر ۹ میں آر، پی، ڈبلیو، کہہ کر دریافت فرما لیجئے گا میں مل جاؤنگا،

یہ بھی نیچری نمائش ہے کہ آپ ہندوستانی ہو کر بھی اپنے بڑے مولوی صاحب قسم کے لوگوں سے مصافحہ کرتے وقت اُن کے ہاتھ کو اس زور سے جھٹکا دیں کہ مولوی صاحب دو تک آپ کو بڑبڑاتے ہوئے دیکھتے رہیں، اور آخر میں آپ یہ بھی کہتے جائیں کہ

"تھینک یو ویری مچ"

یہ بھی نمائش ہے کہ آپ ملا رموزی کے متعدد خطوط کے جواب میں ایک نفیس سے لفافہ کے اندر نہایت باریک قلم سے ڈیڑھ سطر میں لکھدیں کہ جی ہاں یہ ہوا اور وہ ہوا اور ملا صاحب معاف کیجئے کام میں آجکل بیحد مصروف ہوں،

یہ اتنی نمائشیں حاضر ہیں جنمیں سے بعض اسدرجہ نازک اور مہین ہیں کہ انہیں خواص انسانی کے ماہر نفسیات سے واقف حضرات ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن اب ان سے بھی سوا نازک اور ناقابل فہم نمائش ملاحظہ ہو جو ایک ہی وقت میں ہزاروں نمائشوں کا مجموعہ بن جاتی ہے، اور یہ نمائش ہے ہندوستان کی "عورت ذات" مگر اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ وہ کتاب عورت ذات ہے جو ملا رموزی صاحب نے بقیمت تین روپیہ فی جلد حال ہی میں لکھی ہے اور ملا رموزی صاحب بھوپال کے پتہ سے مل سکتی ہے تو یہ ہندوستان کی عورت ذات گویا فطری طور پر علی گڈھ کی نمائش سے اونچی نمائش ہے مگر اسکی نمائشوں کا تھوڑا سمجھ لینا یا اس کے ذی ہوش شوہر کا کام ہے یا پھر ملا رموزی صاحب کا کام مثلاً اس سے زیادہ عورت کی مہین نمائش کیا ہوگی کہ یہ خود کو جتنا بیگانۂ نمائش بنائے سمجھ لیجئے کہ اتنی ہی زنانے کی نمائش میں مصروف ہے، پھر جب یہ عورت کے بعد بیوی ہو جائے تو اسکی نمائش کے دو موقع نہایت خاص ہوتے ہیں، پہلا موقع یہ کہ اس کے ہاں آپ کی بیوی صاحبہ مہمان ہو جائیں دوسرا موقع وہ کہ یہ ملا رموزی صاحب صاحب کی تقریب شادی میں جائے، بس جہاں اسکے گھر میں کوئی عورت مہمان ہو کر آئی اور اب اسکی رگ رگ سے نمائش کا اظہار شروع ہوا چنانچہ اب وہ جو حرکت کرے گی نمائش سے ہو گی، پھر اگر یہ ذرا "صاحب اولاد" اور ذرا "دولتمند" بھی ہے تب تو اسکی نمائشوں کا عالم ہی نرالا ہوگا،

جہاں آپ اسکے ہاں گئیں اور اس نے اپنے گھر خاصکر اپنے یا اپنے شوہر کے کمرہ کی آرائش عین اسوقت شروع کی جب آپ اس سے مخاطب ہو کر بات کرنا چاہتی ہیں (مرد ناظرین اسوقت معاف فرمائیں) بس یہ آپ سے بات کرتے کرتے یکایک بیچ میں سے یہ کہہ کر اٹھ جائیگی کہ بہن ذرا ٹھہرنا میں ابھی آتی ہوں ذرا اُن کیلئے پانی گرم کردوں کیونکہ وہ دفتر سے آتے ہی گرم پانی سے غسل کرتے ہیں،

بہن ذرا ٹھہرنا میں آتی ہوں ذرا اُن کیلئے چائے تیار کردوں کیونکہ وہ دفتر سے آتے ہی چائے مانگتے ہیں،

بہن ذرا ٹھہرنا میں اُن کیلئے ٹینس کے کپڑے نکال رکھوں کیونکہ وہ ٹھیک چار بجے ٹینس کھیلنے جاتے ہیں،

بہن ذرا ٹھہرنا میں آتی ہوں ذرا دیکھ لوں کہ نوکر نے انکے جوتوں پر پالش کیا یا نہیں کیونکہ وہ صبح مجھ سے کہہ گئے تھے کہ میں دفتر سے آؤں تو میرے کالے پمپ پر پالش ہو جائے،

بہن ذرا ٹھہرنا میں آتی ہوں انکے شکار کے کپڑے نکال دوں کیونکہ آج شام کو وہ شکار کو جا رہے ہیں،

شوہر سے متعلق اتنی نمائشوں کے بعد وہ اب اولاد کو شوہر کیساتھ ملا کر یوں نمائش کریگی کہ بہن کیا کہوں میں تم سے کہ وہ اس تمہاری جمیلہ سے کتنی محبت کرتے ہیں؟ بس جہاں اس کے رونے کی آواز سنی اُنہوں نے اور وہ میرے اوپر غصہ ہوئے اور ان کا ہر وقت یہی کہنا ہے کہ دیکھو جی تم یوں تو جو تمہارا جی چاہے وہ کرو مگر کبھی میری جمیلہ بیٹی کو کوئی تکلیف نہ ہو، اور یہ تو دیکھئے انہوں نے اس شریر کیلئے کتنے کھلونے جمع کئے ہیں، اوہ یہ گاڑی وہ دلی سے لائے تھے اس کیلئے، اور یہ دیکھنا بہن یہ کتنی خوبصورت گڑیا اس کیلئے لائے ہیں وہ مگر یہ ہے اسکو ہاتھ تک نہیں لگاتی بس یہ گاڑی لئے پھرتی ہے دن بھر ادھر سے اُدھر،

یہی حال اسکی دادی اماں کا ہے کہ وہ کسی وقت بھی اسے اپنی گود سے علیحدہ نہیں کرتی ہیں بس بہن گھر بھر کا کھلونا ہے یہ آپ کی جمیلہ بیگم،

ہاں بہن میری بھی یہی دعا ہے کہ بس خدا انہیں نیک کرے کیونکہ اپنے باپ کی

بڑی ہی لاڈلی بیٹی ہیں اور اولاد کی اس نمائش کے بعد پھر یہ اپنی نمائش میں ہر کو یوں لا لیتی ہیں کہ "اور یہ دیکھئے یہ میرے لئے بھی وہ دہلی کا جوتا لائے تھے حالانکہ میرے پاس ایک جوڑ تین جوتے نئے موجود ہیں جنہیں میں نے ایک وقت بھی نہیں پہنا ہے مگر اُن کا یہی کہنا ہے بہن کہ تم کسی چیز کو استعمال کرو یا نہ کرو مگر مجھے جو چیز بازار میں پسند آ گئی ہے میں تمہارے لئے ضرور لاؤں گا' اور میں کہتی ہوں کہ جب مجھے ایک چیز کا شوق ہی نہیں تو پھر کیوں آپ پیسہ برباد کرتے ہیں مگر اُنہیں محبت ہی اب کیا کہوں بہن تم سے کہ کسقدر محبت ہے بس انکا تو یہ کہنا ہے کہ تمہارے پاس ہر چیز موجود رہے اور کسی وقت تمہیں کسی چیز کی تکلیف نہ ہو یہی حال انکا کھانے کے معاملہ میں ہے توبہ کیا مجال بہن جو بغیر میرے وہ لقمہ تو اٹھا لیں، جب تک میں اُن کے ساتھ دسترخوان پر نہ بیٹھونگی وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے، اور بیوی خدا بچائے ایک ہمارے پڑوس میں ملا رموزی صاحب اور انکی بیوی بھی ہیں کہ میں کیا کہوں بہن تم سے ان کا حال، بس اللہ پاک کی قسم کہ ایک دوسرا ایک دوسرے کی صورت سے بیزار ہے ائے بہن کہنے کی بات نہیں بس قصہ اصل یہ ہے کہ ملا صاحب ہیں اُن بیچاری سے ناراض،

کیوں کیسے ؟

بس ناراض اس پر ہیں کہ وہ غریب بے انکی پڑھی ہے اور صورت کی بھی ذرا بھدی ہے تو اب بیوی خدا کے بنائے ہوئے سبھی ہیں اب بھی نخرہ نہ کرنا چاہئے مردوں کو، کیونکہ صورت میں دیکھو تو ایسی میں کہاں کی پری ہوں، مگر خدا کا شکر ہے تمہارے بھائی تو اب میں کیا کہوں تم کچھ دن رہ کر دیکھو تو معلوم ہو کہ مجھ پر کس طرح فدا ہیں' اور کہنے کو ملا صاحب ملا صاحب مشہور ہیں مگر بیوی توبہ ایسے بھی کیا ملا صاحب کہ اللہ کی اس بیگنا • بندی کی زندگی برباد کر رہے ہیں' اور کہتے گا نہیں کسی سے میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ اُن دونوں میں بات چیت بھی بند ہے' بس شام کو ملا صاحب گھر میں آتے ہیں وہ اُنکی ملازمہ ہی اُنہیں کھانا دیدیتی ہے بس کھانا کھایا اور جو ملا صاحب گھر سے نکلے تو پھر ٹھیک " بجے رات کو آتے ہیں' اور یہ اُسی کا نتیجہ ہے کہ ملا رموزی صاحب نے حسین بیوی کی تلاش میں نکلے کہ اشتہار دنیں بھی چھاپ دیا تھا" مگر کوئی حسین بیٹی دیتا تو میاں کو کس بات پر' تنخواہ دیکھو تو میاں کی کچھ بھی نہیں اور اوپر سے خرچ اخراجات" وہ کہا ہاں وہ دیکھو بہن کہ خالو میاں نے اپنی بچی کو جو آج تک بٹھا رکھا ہے تو اُن کا بھی یہی خیال ہے کہ دوں گا تو کسی ایسے ہی کو جو کھاتا پیتا ہو اور گھر سے خوشحال ہو، اگرچہ لڑکی کی عمر اب کوئی پچیس سال کے لگ بھگ ہے مگر خالو میاں کی یہی ضد ہے کہ جیسا میں چاہتا ہوں ویسا لڑکا جب تک نہ ملیگا میں کبھی لڑکی کو نہ دوں گا' حالانکہ وہ گھر ہی میں چچا کا لڑکا بی اے پاس بیٹھا ہے مگر کیا کریں تنخواہ کمبخت کی پچاس ہے'

ایسے بہن تو اب یہ کون کہے خالو میاں سے کہ لڑکی کی عمر تباہ ہو رہی ہے کیونکہ اب تو ہر خاندان میں لڑکیوں کا یہی حال ہے کہ بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہیں مگر نہیں دی جاتی ہیں' بس بہن خدا شرم رکھے' ہمارے تو والد نے ان کے ہاں کا پہلا پرچہ دیکھ کر ہماری والدہ سے کہدیا تھا کہ بس بسم اللہ کرو اپنی لڑکی کا نصیب'

اس قسم کی بالمشافہ نمائش" کے بعد عورت ذات کی دوسری نمائش کا موقعہ ملا رموزی صاحب کی شادی کی تقریب ہے' بس جہاں یہ شادی کے گھر میں داخل ہوئی کہ اب وہ اولاد سے لیکر اپنی ایک ایک چیز کی نمائش کی فکر میں مبتلا ہو جائیگی، وہ جس طرف عورتوں کا مجمع زیادہ پائے گی اُدھر جائے گی، پھر اپنے لباس اور زیور کو پہلے خود دیکھے گی، اور پھر قسم قسم کی ترکیبوں سے محفل کی عورتوں کو اپنی چیزوں کے دکھانے کیلئے متوجہ کریگی، چلے گی تو باجے والے زیور کو زور سے بجا کر اور بیٹھے گی تو اسی ترکیب سے اور جو اس پر بھی کسی نے توجہ نہ کی تو خواہ مخواہ بے حیا بنکر نئی عورتوں سے گفتگو شروع کریگی اور تھوڑی دیر بعد انہیں باتوں باتوں میں اپنا زیور اُسکی جھوٹی قیمت اور اُسکے قسم اول ہونے کی تعریف خود ہی شروع کر دیگی' اور یہ بھی نہیں تو عورتوں کے ملنے بیٹھ کر کسی زیور کو خود ہی اُلجھا لے گی اور خود سلجھانے بیٹھ جائیگی اور اسی بہانے سے کسی عورت کو بُلا کر کہے گی کہ بہن ذرا میری یہ بالیاں سلجھا دینا میں تو تنگ آ گئی ان بالیوں سے' کہتی تھی کہ دیکھو اتنی قیمتی بالیاں نہ لاؤ میں انہیں نہ پہنونگی مگر وہ کہاں مانتے ہیں میرا کہنا حالانکہ اس سے پہلے بھی تین ایسی ہی بالیاں توڑ چکی ہوں' خیر اب گھر تو جاؤں ان کمبختوں کو بھی نہ آگ لگا دوں تو میرا نام غرض مطلب ان تمام باتوں سے یہ ہوتا ہے کہ یہ بالیاں سلجھانے والی اجنبی عورت ان بیوی کے زیور کی قیمت اور ان کے شوہر کی نازبرداری اور محبت کی قائل ہو جائے'

یہ ہیں چند نمونے انسانی نمائش کے' اب آپ فیصلہ فرما لیجئے کہ ان میں سے کتنی نمائشیں ترک کرنے کے قابل ہیں تاکہ دنیا میں عقلمند لوگ آپ کا مذاق نہ اُڑا سکیں فقط

ص ۔ رموزی

کلام الملوک ملوک الکلام

اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی متعالی سلطان العلوم میر عثمان علی خاں بہادر شہریارِ دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

اس درجہ بے اثر مری آہِ جگر ہوئی — اُس بے خبر کے دل کو نہ مطلق خبر ہوئی
اُلجھن تھی شام ہی سے مجھے مضطرب رہی — کس پیچ کی مہم تھی کہ شب بھر میں سر ہوئی
سینچا جو خونِ دل سے دعا دل نے عمر بھر — گلشن میں جب تو نشو و نمائے شجر ہوئی
اِک وقت میں یہ دونوں معمے نہ حل ہوئے — پیدا کیا دہن کو تو پنہاں کمر ہوئی
صیاد نے رہا نہ کیا فصلِ گل میں بھی — نالاں ہزار بلبلِ بے بال و پر ہوئی
پہلو سے بس اُدھر وہ اٹھے اور اس طرف — دل ہل گیا وہ شدتِ دردِ جگر ہوئی

خاکِ مدینہ آنکھ میں عثمانؔ لگائیںگے
قسمت سے اپنی کاش رسائی اگر ہوئی

کلامِ وسیم

از آقائے سخن حضرت وسیم خیرآبادی مرحوم تلمیذ خدائے سخن حضرت امیر مینائی رح

ہم نے اُس شوخ کی رعنائی قامت دیکھی
چلتی پھرتی ہوئی تصویر قیامت دیکھی

دلِ سوزاں کی طرح جلتی رہی تا بہ سحر
ہم نے دلسوزیٔ شمعِ سرِ تربت دیکھی

مجھ کو قید اس لئے کیا اُس نے نشیمن پھونکا
جورِ صیاد کا بجلی کی شرارت دیکھی

آہِ بلبل تھی کوئی تیز ہوا کا جھونکا
ہمنے ان پھولوں کی اڑتی ہوئی رنگت دیکھی

خوف تھا یہ نہ کہیں میری نظر لگ جائے
آنکھ بھر کر نہ کبھی آپ کی صورت دیکھی

اے کرم بیچنے کو جنسِ گنہ ہم بھی گئے
ہمنے جب گرمیٔ بازارِ قیامت دیکھی

کہتے ہیں نالۂ دل بھی تو نہیں آسکتا
آسماں تو نے مری بام کی رفعت دیکھی

بن کے بجلی چمک اُٹھی سرِ طور اے موسیٰ
تمنے ان شوخ حسینوں کی شرارت دیکھی

آگئی یاد مجھے واعظ و ناصح کی وسیم
زیرِ تربت جو نکیرین کی صورت دیکھی

انتخاب کلام راجہ نوشاد علیخاں نوشاد مرحوم تعلقدار جہانگیر آباد

منتخبہ حضرت جگر بسوانی وارثی

وہ دیوانہ ہوں سیکر تار میری جیب و داماں کا — رفو کرتی ہے تا صبح حشر چاک اپنے گریباں کا

بیٹھنا وادیٔ غربت میں وہ تنہا تھک کر — دیکھنا یاس سے وہ جانب منزل میرا

کچھ عجب عالم نظر آتا ہے تا حد نظر — حسن وحشت ہو وہ دیکھے آکے ویرانہ مرا

دونوں ہوں پیش نظر تو اور ہی کچھ لطف ہے — آنکھ وہ مستی بھری لبریز پیمانہ مرا

در بتخانہ اگر بند ہے مسجد کو چلو — میکشو پڑ رہو اللہ کے گھر آج کی رات

حرم کا قصد تھا ساقی جو مے پلا دیتا — تو جھومتے ہوئے ہم بھی خدا کے گھر جاتے

قفس کو باغ میں صیاد کاش رکھ دیتا — پھڑک پھڑک کے ہم اپنے چمن میں مر جاتے

چلاؤں گا میں حشر میں یہ کہہ کے ہائے دل — اور ہوں گے میرے ہاتھ میں سب پارۂ دل

تم جاننا اسی کو ہے نوشاد کا مزار — جس قبر سے آرہی ہو صدا ہائے ہائے دل

آکر انھوں نے جب یہ سنا مر گیا مریض — ہنس کر کہا کہ مرنے کے قابل ہی تھا مریض

کیا بات بتکدے کی سبھی کچھ بتوں میں تھا — دیکھا حرم میں جا کے وہاں تھا خدا کا نام

چال سے ان کی تو بچئے کیوں کر — پوچھتا ہے تمہیں قیامت سے

آج کیوں گور غریباں میں ٹہلتے ہیں آپ — یہ جگہ سیر کے قابل کبھی ایسی تو نہ تھی

چاند نکلا کہ وہ دریا سے نہا کر نکلے — رات کو رونق دریا کبھی ایسی تو نہ تھی

کسی پہ لطف کسی پر عتاب ہوتا ہے — جہاں میں روز نیا انقلاب ہوتا ہے

ہماری قبر ہے سب سے الگ گور غریباں میں — نہ پروانہ جلا کوئی نہ گریاں شمع تربت ہے

عشق میں افسردہ ہو کر دل کا ہوتا ہے وہ رنگ — پھول کا جو حال ہو جاتا ہے مرجھانے کے بعد

سر جھکا کر لاش پر آتے ہیں کس انداز سے — وہ دوا کرتے جو آئے بھی تو مر جانے کے بعد

خدا کے واسطے روتا نہ سنکر حال ناکامی — ہمارے بعد شاید کان تک یہ داستاں آئے

کلامِ نفیس

نتیجۂ فکر محمد یوسف صاحب نفیس بنگلوری تلمیذ جانشین امیر مینائی حضرت جلیل مدظلہ

عدو ہیں بزم میں کیوں بے محابا دیکھنے والے
یہ ہوتے کون ہیں جلوہ تمہارا دیکھنے والے

کسے عشق میں کھائے ہیں جس نے تیر میں وہ ہوں
ابھی موجود ہیں میرا کلیجا دیکھنے والے

مری دل کی حقیقت کیا کھلے رندو! آج اے ساقی
کہاں ہیں اب زمانہ جامِ جم کا دیکھنے والے

مریضِ غم کی فرطِ رنج و غم سی چھٹ گئی نبضیں
اسے بھی دیکھ دنیا کا تماشا دیکھنے والے

مری قسمت کا بن بن کر بگڑنا دیکھتے جائیں
ہمیشہ اپنی زلفوں کا سنورنا دیکھنے والے

حرم میں آکے ترسیں رند اک اک قطرۂ مے کو
مئے کوثر کا اپنے گھر میں دریا دیکھنے والے

یہ روزِ حشر کیوں اپنی طوالت سے ڈراتا ہے
کہ ہم ہیں شامِ فرقت کا سویرا دیکھنے والے

تری دستِ حنائی کیا لگی دل کی بجھائیں گے
یہ ہیں گھر پھونک کر گھر کا تماشا دیکھنے والے

نہ نکلا ایک بھی آنسو مریضِ دردِ الفت پر
ہوا کیا تیرا پتھر کا کلیجا دیکھنے والے

وہ اندھے تھے جو دے بیٹھے دل اپنا تیری زلفوں کو
بھلا کیوں مول لیتے ایسا سودا دیکھنے والے

نفیس آتے ہیں رندوں میں جواں بنکر مبارک ہو
یہی تو ہیں زمانہ جامِ جم کا دیکھنے والے

چچا چھکن نے جھگڑا چکایا

از جناب سید امتیاز علی صاحب تاج

مندرجہ ذیل واقعہ قلمبند کرنے میں کئی امور مانع تھے سب سے بڑی بات یہ کہ سیہ کاری میں انسان کتنا ہی سخت گیر ہو۔ پھر بھی کسی کی رسوائی کے ناگفتہ بہ واقعات طشت ازبام کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ اور پھر چچا کی رسوائی آپ جانئے خود بھتیجے کی اور سارے گھر کی رسوائی ہے۔ اسی لئے گو آج سے کئی ماہ پہلے عالمگیر کے عید نمبر میں اس مضمون کے شائع ہونے کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ لیکن مجھے اس کے لکھنے کی جرأت نہ پڑی۔ چنانچہ وہ نمبر اعلان کے خلاف بغیر اس مضمون کے شائع ہو گیا جس کیلئے میں قارئین و مدیر عالمگیر سے نادم اور معافی خواہ ہوں۔

لیکن اب کہ میں یہ مضمون لکھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ میرا شروع ہی میں یہ عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔ کہ اس کے مطالعہ کے بعد اگر کسی صاحب کے بھی دل میں میری سعادتمندی کے متعلق شبہ پیدا ہو۔ تو وہ اس کا ذمہ دار تمام تر قبلہ حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی کو سمجھیں۔ یہ سب کیا دھرا ان کا ہے۔ اتنا قصور البتہ میرا کہ ایک روز ان کی رازداری پر اعتماد کر کے چچا چھکن کا یہ واقعہ ان سے زبانی عرض کر بیٹھا تھا۔ انہوں نے یہ ستم ڈھایا۔ کہ میری نیازمندی پر اعتماد کر کے مدیر عالمگیر سے کہہ دیا۔ کہ اس کی اشاعت کا اعلان کر دیا جائے۔ اور پھر مجھ پر تقاضہ شروع کر دیا۔ کہ اعلان کے مطابق یہی مضمون رسالہ میں ضرور شائع ہونا چاہئے۔ میری صحت کی حالت میں حکیم صاحب قبلہ مضمون کے لئے زیادہ اصرار کرتے رہے۔ اور میں ان کی فرمائش کو اپنی مجبوریاں بیان کر کے ٹالتا رہا۔ لیکن ان دنوں کہ میں حکیم صاحب کے زیر علاج ہوں۔ انہوں نے مضمون کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ اور ان کی چپ اصرار کی نسبت کتنی زیادہ موثر بن گئی کہ میں اپنے آپ کو مجرم سا نظر آنے لگا۔ چنانچہ میرے لئے یہ صورت ہو گئی۔ کہ یا ان کا ڈھکوسلا کھاؤں یا کھمبا نوچوں۔ گو نہ خشک دگر نہ گو نہ خشک کا مضمون سمجھئے۔ اور اب میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کہ دگر نہ گو نہ خشک کے متعلق اپنے جذبات نظر انداز کر دوں۔

واقعہ یہ ہے۔ کہ پچھلی گرمیوں میں اتوار کا روز تھا۔ ہمارے ہاں چراغ میں بتی پڑتے ہی کھانا کھا لیا جاتا ہے۔ بچے کھانا کھا کر سو گئے۔ چچی نے کھانا کھا کر عشا کی نماز کی نیت باندھی تھی۔ نوکر باورچی خانے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ چچا چھکن بنیان پہنے۔ تہمد باندھے۔ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے چارپائی پر لیٹے مزے مزے سے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ کہ دفعتہً گلی میں سے شور وغل کی آواز آئی۔ بندو۔ امامی۔ مودا کھانا چھوڑ دروازے کی طرف لپکے۔ چچا بھی۔ چونک کر اٹھ بیٹھے۔ اور کوئی نظر نہ آیا تو چچی کی طرف دیکھا۔ چچی نے سلام پھیرتے ہوئے منہ ادھر موڑا۔ آنکھیں چار ہوئیں۔ تو چچا نے پوچھا "یہ شور کیسا ہے؟" چچی ماتھے پہ تیوری ڈال وظیفہ پڑھنے لگیں۔ چچا چھکن کچھ دیر انتظار کرتے رہے۔ کہ شاید کوئی نوکر لڑکا پلٹ کر آئے اور کچھ خبر لائے۔ ویسے چچی سے برابر پوچھتے رہے "کوئی آتا نہیں — کہاں بیٹھ رہے سب کے سب؟ — دیکھتی ہو ان کی حرکتیں؟ معلوم نہیں کیا واردات ہو گئی؟" لیکن جب نہ چچی نے کچھ جواب دیا۔ اور نہ کوئی لڑکا واپس آیا۔ تو مجبوری کو اٹھے۔ اور جوتا پہن خود باہر نکلنے کی تیاری کی۔ چچی بولیں "چلئے تو ہو۔ کسی کے جھگڑے میں نہ پڑنا"۔ چچا بولے "میرا سر پھرا ہے؟ بازاری

لوگوں کے جھگڑوں سے ہمیں کیا سروکار ؟" زنانخانے سے نکل کر دالان میں آئے۔ ڈیوڑھی میں قدم رکھا۔ تو دیکھا کہ گھر کے سامنے بھیڑ جمع ہے۔ چچا کو توقع نہ تھی کہ اتنی جلدی موقع پر جا پہنچیں گے۔ کچھ گھبرائے۔ آگے بڑھنے کے لئے ابھی تیار نہ تھے۔ واپس پلٹنے کو جی چاہتا تھا۔ چنانچہ آپ نے جلدی سے دیا گل کر ڈیوڑھی کا دروازہ بھیڑ دیا۔ اور دیر تک درز سے آنکھ لگائے صورت حالات ملاحظہ فرماتے رہے۔ معلوم ہوا۔ کہ جھگڑا دو ہمسایوں کے درمیان ہے۔ جو سامنے کے مکان میں رہتے ہیں۔ ایک اوپر کی منزل میں۔ دوسرا نیچے کی منزل میں۔ ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی تھی لیکن لوگوں نے اب دونوں کو الگ الگ کر کے سنبھال رکھا ہے۔ اور میر باقر علی سمجھا بجھا کر انہیں تقریباً ٹھنڈا کر چکے ہیں۔ چچا سے نہ رہا گیا۔ یہ بات انہیں کیونکر گوارا ہو سکتی تھی۔ کہ ان کے ہوتے ساتے محلے کا کوئی اور شخص اس قسم کے قصوں میں پنچ بن بیٹھے۔ چنانچہ آپ تہبند کس بنیان نیچے کھینچ دروازہ کھول باہر نکل کھڑے ہوئے۔ اور بڑے سرپرستانہ انداز میں بولے۔ "ارے بھئی کیا واقعہ ہو گیا ؟"

میر باقر علی نے کہا۔ "اجی کچھ نہیں۔ یوں ہی خاک سی بات پر ان خانصاحب اور مولوی صاحب میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ میں نے سمجھا دیا ہے دونو کو۔"

وہ تو سمجھ گئے۔ مگر چچا بھلا کہاں سمجھتے ہیں۔ موقع پر جا پہنچے۔ بولے۔ "مگر بات کیا ہوئی۔ یہ تو کچھ ایسا نقشہ نظر آتا ہے۔ جیسے خدانخواستہ فوجداری تک نوبت پہنچ گئی تھی۔"

میر باقر علی نے ٹالنا چاہا۔ "اجی اب خاک ڈالئے اس قصے پر۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ ہمسایوں میں دن رات کا ساتھ۔ کبھی کبھی شکایت پیدا ہو ہی جاتی ہے۔"

اب بھی چچا کی تسکین نہ ہوئی۔ بولے۔ "پر زیادتی آخر کس کی طرف سے ہوئی ؟"

خانصاحب بولے۔ "پوچھئے ان مولوی صاحب سے۔ جو بڑے متقی بنے پھرتے ہیں۔ ڈاڑھی تو بالشت بھر بڑھا رکھی ہے لیکن جب حرکتیں رذیلوں کی سی ہوں۔ تو ڈاڑھی کا کیا فائدہ ؟"

چچا چونک کر بولے۔ "او ہو یہ قصہ تو ٹیڑھا معلوم ہوتا ہے۔"

اب مولوی صاحب کیسے چپ رہ سکتے تھے۔ بولے۔ "صاحب۔ ان کو کوئی چپ کرائیے۔ میں بڑی دیر سے طرح دئیے جا رہا ہوں۔ اور یہ جو منہ میں آئے بکے چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ان کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔"

خانصاحب کڑک کر بولے۔ "ابے جا۔ چار بھلے آدمی بیچ میں پڑ گئے جو میں رک گیا۔ نہیں تو نتیجہ تو آج ایسا بتاتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔"

مولوی صاحب نے تن کے فرمایا۔ "طاقت کے گھمنڈ میں نہ رہنا خانصاحب۔ انگریز کا راج ہے۔ جی ہاں۔ اور یہاں بھی کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں۔ ہم بھی ایسے ہتھیاروں پر اتر آئے تو یاد رکھئے۔ درنہ جی ہاں۔"

خانصاحب بے قابو ہو گئے۔ مکا تان کر بڑھنا چاہتے تھے۔ مگر لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے روک لیا۔ مولوی صاحب آستینیں چڑھاتے چڑھاتے رہ گئے۔ باقر علی صاحب نے پریشان ہو کر چچا چھکن سے کہا۔ "دونو کے دونو اچھے خاصے سمجھ گئے تھے۔ آپ نے پھر دونو کو بھڑکا دیا۔"

چچا بولے۔ "لاحول ولاقوۃ۔" کہنے لگے کہ آپ نے بھڑکا دیا۔ اجی حضرت، میں تو صرف اتنا پوچھ رہا تھا۔ کہ قصور کس کا ہے ؟ آپ جو بڑے پنچ بن کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ تو اتنا تو معلوم کر لیا ہوتا کہ زیادتی کس کی ہے۔ اور اصل واقعہ کیا ہے ؟"

باقر علی نے پھر بات ٹالنی چاہی۔ "اجی کہاں اب سر راہ یہ قصہ سنئے گا۔ جانے دیجئے۔ جو ہوا سو ہوا۔ میں تو ان دونو کی شرافت کی داد دیتا ہوں کہ جو ہم نے کہا۔ انہوں نے مان لیا بات رفت گزشت ہوئی اب آپ کیا گڑے مردے اکھیڑنے آگئے۔"

چچا نے دیکھا۔ میر باقر علی چھائے چلے جا رہے ہیں۔ آگ ہی تو لگ گئی۔ لیکن سنبھل کر بولے۔ "صاحب من آپ کو اس محلے میں آئے ابھی عرصہ ہی کتنا ہوا ؟ کہ آمدی کے پیر شدی ؟ اور ہماری تو نال اسی محلے میں گڑی ہوئی ہے۔ اب آپ جانے دیجئے تا اس بات کو۔ بازی بازی باریش بابا ہم بازی۔ اور سر راہ کا کیا ہے۔ یہ جھگڑا ہم تک آج نہ پہنچتا کل پہنچ جاتا۔ سو اب بھی کیا مضائقہ ہے۔ سامنے ہی تو غریب خانہ ہے۔ اندر چل بیٹھیں دو منٹ میں قصہ طے ہوا جاتا ہے۔ مجھے تو یہ ہرگز گوارا نہیں۔ کہ جس محلے میں بھی رہتے ہوں۔ وہاں ہمسایوں میں یوں سر بازار جوتی پیزار ہوا کرے۔"

یہ کہہ کر چچا نے داد طلب نگاہوں سے مجمع کو دیکھا۔ بولے "کہیوں حضرات خدا لگتی کہئے۔ یہ بھلا کوئی شرافت ہے؟"

مجمع میں سے تائید کی بھنبھناہٹ سی سنائی دی۔ میر صاحب خاموش ہو کے رہ گئے۔ چچا بولے "تو آپ دونو صاحب اندر تشریف لے آئیے گا۔ اور میر صاحب اگر چاہیں۔ تو میر صاحب بھی آسکتے ہیں"۔ باقی لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا "آپ حضرات جا سکتے ہیں۔ یہاں کوئی بھانڈ تو نا چیں گے نہیں جو آپ کو مدعو کروں۔ آپس کے جھگڑے طے کرانے میں مغز پاشی کا کام ہے۔ آپ لوگ اپنے اپنے گھر جا کر آرام کیجئے۔"

لیجئے صاحب چچا قاضی القضاۃ بن گئے۔ مدعی مدعا علیہ اور میر صاحب کو ساتھ لئے گھر میں آئے۔ گھر پہنچ کر پہلے مردانے ہی سے قرابین کی ایک فہرست صادر ہوئی۔ کہ بند و لمپ لائے اور مودا برف کا پانی بنائے۔ اور امامی حقہ تازہ کر کے پہنچائے۔ اور بند و لمپ لا چکنے کے بعد خاصدان لے کر آئے اور مودا پانی بنا چکنے کے بعد اگالدان لا کر رکھے اور امامی حقے سے فراغت پا کر پنکھا جھلے۔

سب کو دیوانخانے میں بٹھایا۔ خود یہ کہہ کر اندر گئے۔ کہ میں ابھی حاضر ہوا۔ اندر جا کر بنیان پر چکن کا کرتا پہنا۔ پہن ہی رہے تھے۔ کہ چچی نے جلدی جلدی رکعت ختم کر کے سلام پھیر کے پوچھا "کیا بات ہے؟"

چچا بے پروائی کے انداز میں بولے "عجب حالت ہے لوگوں کی۔ نہ دن کو چین لینے دیتے ہیں نہ رات کو۔ ان سامنے والے خانصاحب اور مولوی صاحب کا جھگڑا ہو گیا۔ مصیبت میں میری جان پڑ گئی۔ سب مصر ہیں کہ آپ بیچ میں پڑ کے فیصلہ کرا دیجے۔ بات ٹالی بھی نہیں جا سکتی محلے کا معاملہ ٹھہرا۔ بہر حال ہر چہ آید بر سر اولادِ آدم بگذرد۔ تو تم نماز سے فارغ ہو کر پان کے کچھ ٹکڑے لگا کے بھیج دینا"۔

چچی جل کر بولیں "یہ شوق بھی پورا کر لیجے۔"

چچا کرتے کے بٹن لگاتے ہوئے باہر نکلے۔ دیوانخانے میں پہنچ کر آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔ ٹانگیں سمیٹ کر اوپر دھر لیں۔ بولے "میں حاضر ہوں۔ فرمائیے کیا بات ہوئی۔ سارا واقعہ بیان کیجئے۔ لیکن مختصر طور پر"۔

مولوی صاحب اور خانصاحب دونوں کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ منہ پھلائے لال لال آنکھوں سے ایک اس طرف ایک اُس طرف تک رہا تھا۔ چچا کا تقاضہ سُن کر دونوں کچھ کسمسائے مگر چپکے بیٹھے رہے۔ میر صاحب نے مہر سکوت توڑی "حضرت بات تو اصل میں بڑی معمولی تھی ——"

چچا نے کہا "آپ تمہید کو جانے دیجئے مطلب کی بات کہئے۔"

میر صاحب نے غصے کو پی کر کہا "تو اور کیا کہوں۔ بات حقیقت میں نہایت معمولی ہے۔ لیکن ——"

خانصاحب سے ضبط نہ ہو سکا۔ "کوئی آپ کی بہو بیٹیوں کو یوں دیکھتا اور آپ اسے معمولی بات کہتے تو جانتا۔"

چچا کرسی پر اکڑوں بیٹھ گئے "مستورات کا واقعہ ہے۔ تو واقعی حضرت اسے معمولی بات کہنا تو بڑی زیادتی تھی آپ کی۔ خانصاحب آپ خود ہی جو واقعہ بیان کیجیے۔"

باقر علی صاحب پھر خاموش ہو گئے۔ خانصاحب کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ بولے "آپ سا منصف مزاج بزرگ پوچھے گا۔ تو بیان کروں گا ہی۔ آپ سے کیا پردہ ہے۔"

چچا پھول گئے۔ کچھ کہنا ضروری معلوم ہوا "نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔ آپ بلا تکلف کہئے۔"

خانصاحب نے کہا "آپ کو علم ہے ہی۔ کہ اس سامنے کے مکان کی نچلی منزل میں ہم رہتے ہیں۔ اور اوپر کی منزل ان حضرت نے کرائے پر لے رکھی ہے۔ اس اوپر کی منزل میں ایک کھڑکی ہے۔ جس سے ہمارے مکان کے صحن میں نظر پڑتی ہے۔"

چچا نے بات کاٹ کر فرمایا "جی ہاں جی ہاں میری دیکھی ہوئی ہے دیکھی ہوئی کیا معنی میرے سامنے بنی۔ اور ایک اس کھڑکی کا کیا ذکر۔ اس سارے مکان کی تعمیر میں میرا بہت کچھ دخل رہا۔ مالک مکان افضل الرحمٰن خاں سے ہم سے مراسم تھے۔ حیدرآباد جانے سے پہلے ہر روز شام کو ملنے آتے تھے۔ اور سچ پوچھئے۔ انہیں یہ مشورہ بھی میں نے ہی دیا تھا کہ خالی زمین پڑی ہے اور کوڑیوں کے مول بک رہی ہے۔ تو کچھ ایسی صورت کرنی چاہئے۔ کہ کرائے کی ایک معقول سبیل نکل آئے۔ تو انہوں نے یہ گویا مکان بنایا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ آپ بات کہئے۔"

خانصاحب نے سوچا۔ کہ بات کہاں تک کی تھی۔ بولے "جی۔ تو اوپر کی منزل میں ایک کھڑکی ہے کہ اس سے ہمارے ہاں کے صحن میں نظر پڑتی

ہے۔ ہم اس مکان میں پہلے سے رہتے ہیں۔ یہ حضرت بہت بعد میں آئے۔ آتے ہی ہم نے ان سے کہہ دیا۔ کہ مولوی صاحب اس کھڑکی میں اگر آپ تالا ڈلوا دیں۔ تو مناسب ہے۔ ورنہ عورتوں کا سامنا ہوا کرے گا۔ اور مفت میں کوئی نہ کوئی قصہ کھڑا ہو جائے گا۔"

چچا نے داد دی "بہت مناسب کارروائی کی آپ نے۔ قانونی نقطۂ نظر سے گویا آپ نے ایک ایسی پیش بندی کر لی کہ بعد میں اگر کسی قسم کی بھی شکایت پیدا ہو۔ تو آپ کو گرفت کا جائز موقع ملے۔ بہت ٹھیک۔ جی تو پھر؟"

خانصاحب داد سے بہت مسرور ہوئے۔ "خدا حضور کا بھلا کرے میں نے سوچا۔ نئے آدمی ہیں۔ کیوں نہ پہلے ہی سے خبردار کر دو۔ سو صاحب انہوں نے بھی مجھے یقین دلایا۔ کہ کھڑکی میں تالا ڈال دیا گیا ہے۔ اور میں بے فکر ہو گیا۔ اب جناب آج صبح کو کیا ہوا۔ کہ ——"

"یہ لیجیے ٹھنڈا پانی پیجیے۔ آپ بھی لیجیے مولوی صاحب۔ پانی دے میر صاحب کو —— جی تو آج صبح —— ارے رکھ دے میز پر خاصدان سر پر کیوں سوار ہو گیا ہے۔ اور وہ امامی کہاں مر رہا۔ ابھی تک حقہ نہیں بھرا گیا۔ جی صاحب آپ کہے جائیے۔ میں سن رہا ہوں۔ ہاں اور وہ اگالدان۔ کہہ بھی دیا تھا پھر بھی یاد نہیں رہا۔ بڑے نالائق ہو تم لوگ۔ آپ فرمائیے نا خانصاحب۔"

خانصاحب نے کچھ دیر سکون کا انتظار کیا۔ آخر بولے "جی تو آج صبح ادھر میں دکان پر روانہ ہوا۔ ادھر اوپر کی منزل میں ایک بچے نے کھڑکی کھول دی۔ عورتیں صحن میں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے کھڑکی بند کرنے کو کہا۔ تو یہ حضرت خود کھڑکی میں آن موجود ہوئے اور بدیں ریش و فش عورتوں کو دیکھنے لگے۔ اب آپ ہی فرمائیے۔ یہ شریفوں اور مولویوں کی سی باتیں ہیں۔ یا لچوں اور شہدوں کی سی حرکتیں؟"

چچا نے عالم استعجاب میں آنکھیں کھولیں۔ اور گردن جھکائی اور پھر ایک حاکمانہ انداز میں سر پھیر کر مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔ بولے "مولوی صاحب یہ تو آپ نے ایسی نامناسب اور خلاف شرع حرکت کی جس پر آپ کو جس قدر بھی الزام دیا جائے بجا ہے۔"

مولوی صاحب دیر سے خاموش بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ کہ چچا ہمدردانہ انداز سے خانصاحب کی گفتگو سن رہے ہیں۔ اب چچا نے انہیں مخاطب کیا۔ تو وہ بھڑک اٹھے "سبحان اللہ آپ بھی عجب سادہ لوح شخص ہیں۔ جو کچھ کسی نے افترا باندھا۔ جھٹ اس پر ایمان لے آئے۔ واہ صاحب واہ۔"

چچا کو یہ اندازِ کلام کسی قدر ناگوار گزرا۔ "تو آپ کا یہ خیال ہے۔ کہ میں خانصاحب کی ناجائز حمایت کر رہا ہوں؟"

مولوی صاحب بولے "ناجائز حمایت تو ہے ہی۔ آپ پہلے میری عرض بھی تو سنئے۔ کہ میں کیا کہتا ہوں۔"

چچا بے ضابطگی کا الزام سن کر چڑ گئے۔ بولے "تو بیان کیجیے۔ آپ کیا عرض کرنا چاہتے ہیں۔ مگر عرض ہو طویل نہ ہو۔ مجھے اختصار بہت مرغوب ہے۔"

مولوی صاحب بولے "جی میں بہت مختصر طور پر سب کچھ عرض کیے دیتا ہوں۔ ہم نے تو مکان میں آتے ہی کھڑکی میں تالا ڈال دیا تھا۔ چنانچہ آج تک کبھی کوئی وجہ شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ آج اتفاقیہ بچے کے ہاتھ چابی لگ گئی اور اس نے کھڑکی کھول دی۔ اور کھڑکی میں کھڑا ہو کر ان کے بچوں کو آوازیں دینے لگا۔ میں نے جب ——"

لیکن بیان ختم ہونے سے پہلے ہی چچا نے جرح شروع کر دی "تو آپ کا بیان یہ ہے۔ کہ محض آوازیں دینے کے لئے کھڑکی کا تالا کھولا تھا؟ محض آوازیں دینے کے لئے۔ محض؟ خوب اس کے لئے بھلا کھڑکی کھولنے کی کیا ضرورت تھی؟"

مولوی صاحب بولے "آخر بچہ ہی تو تھا۔ اسے بھلا نیک و بد کی کیا تمیز۔ اسے یہ تھوڑا ہی معلوم۔ کہ صاحب یہ تالا کھولنا چاہئے۔ اور یہ کھڑکی بند رہنی چاہئے۔ چابی مل گئی تھی۔ تالے پر نظر پڑی۔ کھول ڈالا۔"

چچا ہونٹ سکوڑ سکوڑ کر اور ایک آنکھ میچ کر یوں سر ہلاتے رہے۔ گویا مولوی صاحب کے اس جواب میں بھی انہیں ایسے ایسے معانی نظر آ رہے ہیں جو دوسروں کی فہم سے بالاتر ہیں۔ مولوی صاحب نے اپنا بیان جاری رکھا۔ "میں نے کھڑکی جو کھلی دیکھی تو فوراً بند کرنے کو لپکا اور کواڑ بند کر کے اسی وقت تالا لگا دیا۔"

چچا نے پھر ٹوکا "کیوں حضرت یہ آپ کے گھر میں تالا کھولنا تو بچوں کو بھی آتا ہے۔ مگر بند کرنا آپ کے سوا کسی کو نہیں آتا خوب۔"

میر باقر علی صاحب بولے۔ "حضرت یہ ایک اضطراری حرکت تھی۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انہیں اس کھڑکی کے بند رکھنے کا ہر وقت خیال

رہتا تھا۔ کھلی دیکھی۔ تو یک لخت بند کرنے کو لپکے۔"

مولوی صاحب نے مزید صفائی کے خیال سے کہا "خدا شاہد ہے جو مجھے یہ گمان بھی گزرا ہو۔ کہ صحن میں مستورات موجود ہوں گی یا میں نے اس طرف نظر بھی ڈالی ہو۔ یہ سراسر بہتان ہے۔ کہیں کھڑا رہا۔ بلکہ میں نے تو بعد میں بھی نیچے کہلا کر بھیجا۔ کہ مجھے بڑا افسوس ہے۔ نیچے سے کھڑکی کھول دی تھی۔"

میر صاحب نے مولوی صاحب کے چال چلن کے متعلق شہادت دی "مولوی صاحب جب سے یہاں آئے ہیں۔ میں انہیں جانتا ہوں میرے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ روز کا آنا جانا ہے۔ اور میں وثوق سے کہتا ہوں۔ کہ یہ اس قسم کے آدمی نہیں۔ چنانچہ میں نے خانصاحب سے بھی یہی کہا تھا۔ کہ مستورات کو غلط فہمی ہو گئی ہوگی۔ ورنہ مولوی صاحب سے کسی بُرے خیال کی توقع نہیں ہوسکتی"

لیکن چچا بھلا کسی دوسرے کی رائے کو کب خاطر میں لاتے ہیں۔ بولے۔ "دلوں کا حال خداوند عالم بہتر جانتا ہے اور اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہنے کی جرأت کرنا میری رائے میں کفر ہے۔ بہرحال ابھی سب کچھ کھلا جاتا ہے تو جناب مولوی صاحب آپ ریلوے کے دفتر میں کلرک ہوتے ہیں نا؟ خوب! اور آپ کو اتوار کے روز چھٹی بھی ہوتی ہے؟ بہت خوب۔ اور جناب من آج اتوار ہی کا دن تھا؟ نہ نہ فرمائیے نہ تھا یا نہیں؟ خدا آپ کا بھلا کرے تھا۔ اور جناب اتوار کے روز آپ گھر ہی میں رہتے ہیں ——— بجا ——— تو سوال یہ ہے۔ کہ اگر کھڑکی کھلنی تھی۔ تو اتوار ہی کے روز کیوں کھلی جب آپ گھر میں موجود تھے۔؟ کسی اور دن کیوں نہ کھلی؟"

یہ کہہ کر چچا نے نتھنے پھلا کر فاتحانہ انداز سے باری باری سب پر یوں نظر ڈالی۔ گویا کوئی بڑا اہم نکتہ نکال کر مولوی صاحب کو لاجواب کر دیا ہے۔ مولوی صاحب اس استدلال سے پریشان سے ہو گئے تھے۔ بولے "حضرت اس بات کی اہمیت کچھ واضح طور پر میری سمجھ میں نہیں آئی۔ باقی واقعہ یہ ہے۔ کہ کھڑکی کی چابی گچھے میں ہے۔ گچھا میرے پاس رہتا ہے۔ جب میں گھر پر ہوں گا۔ تبھی گچھا گھر پر ہوگا اور اسی وقت کھڑکی کھلنے کا امکان بھی ہے۔"

چچا کو اس جواب کی توقع نہ تھی۔ سر تکیے کو ڈال کر کرسی پر لیٹ گئے۔ اور بولے "اب یہ آپ کی زبردستی کی کج بحثی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے۔ کہ اس بات کا جواب آپ کے پاس کچھ نہیں۔"

مولوی صاحب نے نہ معلوم دانستہ یا نادانستہ چچا کو تھوڑا سا روغن قاز ملا۔ بولے "صاحب جو اصل واقعہ تھا۔ وہ تو میں نے عرض کر دیا۔ اب آپ اپنی علمیت اور قابلیت سے جو نکتہ چاہیں نکال سکتے ہیں اور مجھ سے جاہل کی کیا بساط کہ بحث میں آپ سے پیش چل سکے۔"

چچا خوش ہو گئے۔ مولوی صاحب کے خلاف جو جذبہ اندر ہی اندر کام کر رہا تھا۔ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ایسے انداز میں ہنس پڑے۔ گویا دانستہ محض تفریح کی غرض سے منطق کے شعبدے دکھا رہے تھے۔ مسکرا کر بولے "معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو بھی منطق سے دلچسپی ہے ——— لے آیا بے حقہ رکھ دے ادھر اچھا اُدھر ہی رکھ دے۔ لیجئے مولوی صاحب۔ نہ نہ لیجئے نا۔ ذرا تمباکو ملاحظہ فرمائیے گا براہ راست مراد آباد سے منگاتا ہوں۔ ورنہ یہاں کا تمباکو تو آپ جانئے نرا گوبر ہوتا ہے۔ مراد آباد میں اپنے ایک عزیز ہیں۔ کلکٹری میں پیشکار ہیں۔ مگر صاحب ان کے رسوخ کا کیا کہنا۔ تو وہ کبھی کبھار یاد کر لیتے ہیں۔"

مولوی صاحب نے حقے کے کش لگانے شروع کئے۔ خانصاحب نے دیکھا۔ کہ چچا تو مولوی صاحب پر ریشہ خطمی ہوئے جا رہے ہیں۔ غصے سے لال پیلے ہو گئے۔ بولے "جس بات کے لئے آپ نے ہمیں بلایا تھا۔ وہ تو ———"

چچا نے بات کاٹ کر کہا "جی ہاں دیکھئے میں عرض کرتا ہوں تو جناب من باقی رہا اس جھگڑے کا قصہ۔ تو خاں صاحب میری ذاتی رائے پوچھئے۔ تو تالی ایک ہاتھ سے نہیں بج سکتی دنیا میں آج تک جتنے بھی جھگڑے ہوئے ان میں ہمیشہ کم از کم دو فریق کا تعلق رہا ہے"

خانصاحب نے بے اختیار پوچھا "اس جھگڑے میں بھلا میرا کیا قصور تھا؟"

چچا نے جواب دیا "ارے بھئی کچھ نہ کچھ ہوتا ہی ہے نا تمہارا نہ سہی تمہارے گھر والوں کا سہی۔ اب بھلا انہیں اس وقت صحن میں بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ کوئی وہاں باغ تو لگا ہوا نہیں۔ آپ کہیں گے کہ وہ آپ کے گھر کا صحن تھا۔ ذرا دیر کو مان لیا کہ تھا۔ مگر پھر اوپر کھڑکی کی طرف دیکھنا کیا ضرور تھا۔ ویسے میرا کوئی برا مقصد نہیں تاہم دیکھئے نا کہ بات کو بڑھایا جائے تو کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ مطلب میرا یہ ہے کہ ایسے معاملوں میں تو جتنا

چھانو اتنی ہی کرکل گئی ہے ۔"

میر صاحب اس کارروائی سے تنگ آ چکے تھے ۔ بولے "اجی اب قصور ایک کا تھا یا دونوں کا اس بحث سے آخر کیا حاصل ۔ آپ اس قصے کو اب کسی ایسی طرح چکائیے ۔ کہ آئندہ کے لئے ان دونوں صاحبوں کا اطمینان ہو جائے ۔ میں نے تو یہ تجویز کیا تھا ۔ کہ آئندہ کے اطمینان کی غرض سے مولوی صاحب کی کھڑکی میں خانصاحب اپنا تالہ ڈال دیں "

چچا چھکن نے کنکھیوں سے میر صاحب کی طرف دیکھ کر پوچھا "کیا مراد ؟ "

میر صاحب نے کہا "مراد یہ ۔ کہ مولوی صاحب کے مکان کی وہ کھڑکی مقفل رہے ۔ اور اس کی چابی اطمینان کی غرض سے خانصاحب اپنے پاس رکھ لیں "

تجویز چچا کو معقول معلوم ہوئی ۔ لیکن چونکہ میر صاحب کی طرف سے پیش ہوئی تھی ۔ اس لئے قبول کرنے کو دل نہ چاہا ۔ بولے "نہیں نہیں نہیں نہیں ۔ یہ تو کچھ ۔۔۔ اوں ہوں ۔۔۔ کچھ نہیں ۔ کچھ نہیں ۔ اس طرح تو ۔۔۔ یعنی خواہ مخواہ خاں صاحب اپنا ایک تالہ بیکار کر ڈالیں ۔ اور اپنے گھر میں کسی دوسرے کا ایسا دخل کسی غیرتمند کو کب گوارا ہو سکتا ہے ۔ یہ تالہ والا کچھ نہیں ۔ کوئی اور تجویز ہونی چاہیئے ۔ کوئی معقول تجویز ۔ جو طرفین کے لئے فائدہ مند بھی ہو ۔ اور اطمینان کا باعث بھی ہو ۔ کیوں صاحب اگر کھڑکی چنوا دی جائے ، تو کیسا ہو ؟"

خانصاحب بولے "اول تو مالک مکان اب یہاں ہے نہیں ۔ اور اگر اسے لکھا بھی جائے ۔ تو وہ منظور نہ کرے گا میں نے ایک مرتبہ کی تھی یہ تجویز پیش تو وہ کہنے لگے اس کھڑکی کے بند ہونے سے کمرا اندھیرا ہو جائے گا "

چچا نے کہا "یہ دوسری بات ہے ۔ ورنہ تجویز خوب تھی اپنا ہمیشہ کے لئے یہ قصہ ختم ہو جاتا ۔ مثلاً آپ دونوں کے چلے جانے کے بعد کوئی دو اور کرائے دار آ کر آباد ہوتے ۔ تو انہیں بھی کسی قسم کی بدمزگی کا امکان نہ رہتا ۔ آیا نہ خیال شریف میں ؟ مگر یہ کمرے میں اندھیرا ہو جانے کا سوال البتہ ٹیڑھا ہے ۔ سمجھے آپ یہ اندھیرا ہو جانے کا سوال بیشک ٹیڑھا ہے ۔ لیکن خیر نہ سہی یوں ۔ کسی اور ترکیب سے کام لے لیجئے ۔ ترکیبیں بہت ۔ بے حد و شمار ۔ مجھے تو صرف آپ لوگوں کی سہولت کا خیال ہے ۔ ورنہ میں تو تجویزوں کا انبار لگا دوں ۔ پریشان کر دوں آپ کو ۔ بڑے بڑے قصے چکائے ہیں ۔ اس ایک کھڑکی بیچاری کی کیا حقیقت ہے ۔ تو یوں کیوں نہ کیجے ۔ مثلاً آپ دونوں میں سے ایک صاحب مکان خالی کر دیں اور کسی دوسری جگہ جا رہیں کیوں صاحب کیا رائے ہے ؟"

خانصاحب اور مولوی صاحب پہلے کچھ منہ ہی منہ میں بولے ۔ پھر خانصاحب نے کہا "صاحب میں تو مکان چھوڑ نہیں سکتا ۔ کہاں نیا مکان تلاش کرتا پھروں "

مولوی صاحب نے بھی معذوری ظاہر کی "حضرت میرے لئے تو یہ فی الحال ناممکن ہے ۔ اتنے کرائے میں اسقدر گنجائش بھلا اور کہاں ملیگی ؟"

چچا کی بے حد و شمار تجویزوں کا ذخیرہ اس پہلی ہی تجویز کے بعد ختم ہو چکا تھا ۔ "اب یوں آپ ہر تجویز میں مین میخ نکالنے لگے ۔ تو طے ہو چکا آپ کا جھگڑا ۔ یعنی مکان بدلنے میں آخر قباحت کیا ہے ۔ سیدھی سی بات ہے ۔ کہ بھئی نہیں نبھتی الگ ہو جاؤ ۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری ۔ کیا آپ کے خیال میں اس مکان کے سوا شہر بھر میں اور معقول مکان نہیں یا اور مکان بال بچے دار لوگوں کے رہنے کے لئے نہیں بنوائے گئے انکار کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیئے ۔ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ آپ لوگ صلح صفائی پر آمادہ نہیں ۔ اور چاہتے ہیں ۔ کہ روز اس قسم کے قضیے کھڑے ہوا کریں ۔ ایسی حالت میں میرا کوئی تجویز پیش کرنا دشوار ہے ۔ آپ خود آپس میں کچھ طے کر لیجئے "

میر صاحب بیچارے پریشانی کے عالم میں یہ باتیں سن رہے تھے اور کرسی پر بار بار پہلو بدلتے تھے ۔ آخر نہ رہا گیا ۔ ہمت کر کے بولے "میں نے تو عرض کیا تھا کہ دونوں کے لئے بہترین ترکیب یہی ہے ۔ کہ کھڑکی میں تالہ لگا رہے ۔ اور اس کی چابی ۔۔۔"

چچا جل گئے "اجی آپ کیا ایک واہیات سی بات کو چمٹ گئے ہیں اور بار بار پیش کئے جا رہے ہیں ۔ چابی تالہ ۔ چابی تالہ ۔ یعنی آپ نے تو ایسا سمجھ رکھا ہے ۔ جیسے ایک تالے کی دوسری کنجی بنوائی ہی نہیں جا سکتی "

میر صاحب نے بھی جل کر جواب دیا "تو یوں تو دیوار کی اینٹیں بھی نکال کر جھانکا جا سکتا ہے "

بات چچا کی سمجھ میں نہ آئی ۔ بولے "تبھی تو کہا تھا ۔ کہ ایک صاحب

نقل مکان کرلیں۔ نہ مانیں تو اس کا کیا علاج۔ اچھی بات ہے۔ وہ ان کی عورتوں کو دیکھا کریں۔ یہ ان کی عورتوں کو دیکھا کریں"

خانصاحب تاؤ کھا گئے۔ بگڑ کر بولے۔ "دیکھئے صاحب منہ سنبھال کر بات کیجیے۔ عورتوں کا نام یوں ہی نہیں لیا جاتا یہ ناموس کا معاملہ ہے۔ ہم غریب سہی مگر نکٹے نہیں"

چچا کچھ کسمسائے۔ میر صاحب گھبرائے مولوی صاحب اٹھ کھڑے ہو گئے۔ بولے "خانصاحب میں اب اجازت چاہتا ہوں۔ گھر پر بال بچے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ جب کوئی بات طے ہو چکے تو مجھے اطلاع دیجیے گا"

خانصاحب نے اٹھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا "تمہارے بال بچے ہیں۔ ہمارے بال بچے نہیں۔ پہلے فیصلہ ہو جائے پھر جانے دوں گا"

مولوی صاحب نے ہاتھ چھڑانا چاہا۔ مگر خاں صاحب کی گرفت مضبوط تھی۔ بولے "تو اپنا تالا لاؤ اور کھڑکی میں ڈال لو"

خانصاحب بولے "تالا تم دو۔ چابی میرے پاس رہے گی"

چچا کو تو یہ تجویز شروع ہی سے نامرغوب تھی۔ بولے "تالا یہ کیوں دیں۔ بے پردگی تمہاری عورتوں کی ہوتی ہے۔ یا ان کی؟"

چچا کی تائید سے مولوی صاحب کو بھی حوصلہ ہوا۔ بولے "بھلا دیکھئے تو سہی"

خانصاحب کو آگ لگ گئی۔ بڑھ کر مولوی صاحب کی گردن پر ہاتھ ڈالا۔ مولوی صاحب کے گلے سے ایک اس قسم کی آواز نکلی جیسے ذبح ہوتے ہوئے بکرے کے گلے سے نکلتی ہے۔ میر صاحب "ہائیں ہائیں" کرتے لپک کر اٹھے۔ چچا بولے "یہ ہاتھا پائی ٹھیک نہیں۔ خانصاحب نے میر صاحب کو دھکیلا تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے دیوار سے جا لگے۔ چچا نے ہاتھ پکڑنا چاہا۔ تو ایک زناٹے کا دھپا انہیں رسید کیا۔ میر صاحب تو چپکے کھڑے رہ گئے۔ چچا دو قدم پیچھے ہٹ کر بولے "ہائے یہ!" لیکن خانصاحب کس کی سنتے ہیں۔...........مولوی صاحب کو گردن سے پکڑ دھکیلتے ہوئے باہر نکل گئے۔ میر صاحب آوازیں سنتے ہی پھر باہر کو لپکے چچا چپ چاپ جہاں تھے۔ وہیں کے وہیں کھڑے گال سہلاتے رہے۔

کھڑے ہی تھے کہ پردہ اٹھا چچی اندر آگئیں۔ غصے کے مارے چہرہ تمتما رہا تھا۔ بولیں "میں کہتی نہ تھی۔ کہ پرائے قصے میں دخل نہ دینا۔ مگر میری بات اس کان سن اُس کان اڑا دی۔ اب آیا ہوگا جھگڑا چکانے کا مزا۔ ایک دو کوڑی کا شخص بے آبرو کر گیا"

چچا اس کے لئے تیار نہ تھے۔ بے قابو ہو گئے "دیکھو اس وقت مجھ سے بات نہ کرو۔ ورنہ خدا جانے میں کیا کر بیٹھوں گا"

چچی جل کر بولیں "اب اور کیا کرو گے۔ گھر کی عزت خاک میں ملا دی۔ محلے میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ ابھی اور کچھ کرنے کا ارمان باقی ہے"

چچا سے جواب بن نہ پڑا "عزت تھی تو ہماری تھی تمہاری تھی۔ تمہیں کیا؟"

چچی بولیں "یہ عمر ہونے کو آئی۔ بچوں کے باپ بن گئے۔ اور بے عزت ہوتے شرم نہیں آتی"

اس کے جواب میں چچا نے گھر اور بچوں کے متعلق بعض اس قسم کے نامناسب الفاظ دہن مبارک سے نکالے جنہیں بیان کرنے سے میں قاصر ہوں۔

غرض یہ کہ محلے کے جھگڑے کی آواز گھر میں آ رہی تھی اور گھر کے جھگڑے کی آواز محلے میں پہنچ رہی تھی۔ ما بخیر شما بسلامت۔

سید امتیاز علی تاج

چاندنی رات کا ایک منظر

از جناب ماسٹر محمد حمزہ خاں صاحب جذبی نظامی

پھیلی ہوئی فضائے ظلمت میں چاندنی ہے
سارا جہاں ہے روشن مہتاب کی ضیا سے
ہر چیز ہے منوّر، ہر شئے جھلک رہی ہے
چاند اپنی روشنی کا جادو جگا رہا ہے
لیکن وہ کشتۂ غم، وہ نامراد عاشق
خلوت میں اپنی مرغِ بسمل بنا ہوا ہے
یہ چاندنی بھی اُس کو اک نشترِ جفا ہے
وہ منتظر ہے اپنے مہتابِ شعلہ رُو کا
دنیا کو ہر طرف سے ہے چاندنی نے گھیرا
عالم خرابِ کیفِ ممتاز ہو رہا ہے
اے چاند اُسکے دل کا صبر و سکوں دلا دے
اے چاند حسن کو دے پیغام عاشقی کا

چھائی ہوئی ردائے شبگوں پہ روشنی ہے
جلوے برس رہے ہیں تاریکی فضا سے
تاروں سے اک تجلّی بن کر ٹپک رہی ہے
دنیا چمک رہی ہے، وہ جگمگا رہا ہے
مہجور و دل فسردہ، مایوس و داد عاشق
لب پر ہیں اُسکے نالے، پیہم تڑپ رہا ہے
یہ چاند اُسکے دل کو وحشی بنا رہا ہے
برپا ہے اُسکے دل میں طوفان آرزو کا
اُسکی نظر میں لیکن ہے چار سو اندھیرا
وہ داد کی چمک سے بیتاب ہو رہا ہے
جس سے بچھڑ گیا ہے اُس سے اسے ملا دے
خلوت میں اُسکی پہنچا الہام عاشقی کا

بیتابِ حسن کو کر احساس سے وفا کے
جو عشق سے خفا ہے لے آ تو اس کو جا کے

عرب قبل اسلام

از جناب مولوی خلیل احمد صاحب فاضل دینیات

(زمانۂ جاہلیت میں جبکہ میں عالم الہ آباد کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ دول العرب ایک نہیں کئی کئی مرتبہ اول سے آخر تک پڑھ ڈالی مگر اس بات کا احساس تک نہ ہوا کہ فاضل مورخ نے کسقدر اختصار اور خوبی کے ساتھ حالات عرب جاہلیت کو قلمبند کیا ہے۔ مگر آج جبکہ اس دور جاہلیت کے پورے پانچ سال گذر چکے ہیں۔ خدا جانے کیوں میں نے اس کتاب کو پھر کھولا اور اس کی خوبیوں کے اعتراف کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ یہ ہے کہ پورے ایک عنوان کا ترجمہ عالمگیر میں اشاعت کیلئے بھیج رہا ہوں۔ مترجم)

۱۔ انساب۔ طبقات عرب۔ انکی طبائع۔ صفات۔ حالات اور ان کی بعض عادتوں کا ذکر۔

عرب قدیم الریاست ہونے کے ساتھ ساتھ اطراف عالم میں مشہور ہو چکا تھا۔ رفعت منزل کے لحاظ سے وہ اُن بلندیوں پر پہونچ چکا تھا جو اُن قوموں میں بھی نہ تھیں جن کا ذکر ضرب المثل کے طور پر کیا جاتا تھا۔

نسب عرب

کتب سیر میں انساب عرب کے متعلق جو کچھ ذکر کیا گیا ہے ان سب کا نچوڑ یہ ہے کہ عربوں کا نسب سام سے ملتا ہے جس نے نوح علیہ السلام کے ساتھ طوفان سے نجات پائی تھی۔ اولاد سام کئی طبقوں پر منقسم ہے (۱) ایک وہ طبقہ جو ہلاک ہو چکا ہے۔ اس کے حالات بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ اور اگر کچھ باقی بھی ہیں تو ان میں بھی صحیح اور غیر صحیح کا امتیاز ذرا مشکل ہے (۲) دوسرا وہ طبقہ جو باقی ہے اس میں سے بعض کا نسب قحطان سے ملتا ہے جسے ابو العرب کہتے ہیں اور بعض کا عدنان سے۔ جو اسمٰعیل (علیہ السلام) کا بیٹا ہے (اس دوسرے طبقہ کی یہ شاخ بھی) متضاد حالات رکھتی ہے۔ ایک اسلام سے پہلے۔ اور ایک زمانۂ اسلام میں بنو قحطان جنہیں عرب العاربہ اور بنو اسمٰعیل جنہیں عرب المستعربہ کہتے ہیں۔ یہ دونوں اختلاف طبقات کے باوجود طبائع اور عادات کے لحاظ سے ایک ہیں۔

طبائع اور حالات عرب

تاریخ کے عہد قدیم سے یعنی جس وقت سے قدیم ممالک اور عظیم الشان سلطنتیں جیسے مصر۔ یونان۔ اور فارس آباد ہوئیں۔ قوم عرب بھی منتظم اور قوی الاعضا رہی۔ اگرچہ ان کے ہاں نہ تو کوئی حکومت قائم تھی جو انہیں ایک ضابطہ میں لاتی نہ ان میں روابط سیاسیہ موجود تھے جو انہیں منظم کرتے۔ ہاں وہ طریقۂ نظریہ یعنی حریت و آزادی کو محبوب رکھتے۔ اور محکومیت سے الگ بھاگتے تھے۔

ان کے دماغ میں غالبیت کے سوا مغلوبیت کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ اس لئے سنین ماضیہ میں وہ کسی حکومت کے جھنڈے تلے جمع نہیں ہوتے تھے۔ بالفرض اگر کوئی اُن پر اپنی قوت اور اکثریت کے بوتے پر غالب آ بھی جاتا تو اس کے لئے ان کا رام کرنا ناممکن تھا۔ ان کے اخلاق اور طبیعتوں کے بدل دینے کو اپنی طاقت سے باہر سمجھتا۔ ان کی صفات کو چھڑا دینا محال تصور کرتا۔ جو

فطرتِ ثانیہ بنچکی تھیں۔ ان کی اطاعت رسمی ہوتی جب موقع ملتا غلامی کے جوے گردن سے اُتار پھینکتے۔

چونکہ ان میں حریت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی اس لئے باوجود مرور ایام کے ان کی اخلاقی حالت ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی تھی۔ جب کبھی جستجوئے آب وگیاہ میں کل کھڑے ہوتے تو پھر لوٹنے کا بہت کم ارادہ کرتے۔

جب فارس کے بادشاہ قیمروس نے مصر وشام پر غلبہ پالیا اور اپنے بیٹے قامبیز کو ان ملکوں میں اپنا نائب مقرر کردیا۔ تو اسے قرب کی وجہ سے اہل عرب کو بھی اپنی رعایا بنانے کا خیال دامنگیر ہوا۔ جس طرح اُس نے آس پاس کے ملکوں کو اپنی اطاعت میں لے لیا تھا۔ لیکن وہ ایسا نہ کرسکا اور اپنی امیدوں میں ناکام رہا اس لئے کہ عرب صرف حریت ہی سے روشناس تھے۔ غلامی کی کشمکشوں سے بالکل ناآشنا۔

اسکندر اعظم نے بھی جب بلاد مشرق ومغرب کو فتح کرلیا تو اس وقت صرف عرب ہی ایسے تھے جنہوں نے اس کی اطاعت سے انکار کیا۔ اسیطرح جب رومانیوں نے تمام دنیا کو فتح کرلیا اور صرف انہی کی حکومت کا دوردورہ تھا۔ بہت کم ایسے شہر رہ گئے تھے جو اُن کے زیر حکومت نہ تھے۔ اور بہت ہی کم انسان انکی گرفت سے بچ سکے تھے۔ اسوقت عرب ہی ایک ایسا ملک تھا جسے استقلال حاصل تھا۔ امراء اور ملوک عرب اس پر حکومت کرتے تھے۔ رومانیوں کی اطاعت کبھی ایک سکنڈ کے لئے بھی گوارا نہ کی۔ نہ کبھی انکی نیازمندی میں داخل ہوئے۔ ہاں رومانیوں اور فارسیوں کو ساحل کے قریبی مقامات پر فراسی حکومت صولتاً حاصل ہوگئی تھی۔ لیکن کسیکو اتنی جُراٗت نہ تھی کہ کسی دوسری جگہ کی آزادی کو بری نگاہ سے دیکھ سکے۔ انہوں نے کسی ایسے موقع کو کبھی رائگاں نہیں کیا جو ان کے لئے اس غلامی سے رہائی کا ذریعہ بن سکے۔ اور ان کو اس تذلیل وتوہین سے بچائے بجز طرفہ یہ کہ ان پر غیروں کی حکومت صرف انکی حیلہ سازی اور روباہ کاری کی وجہ نہیں ہوتی تھی۔ اور یہ دستور اب تک محکوم

ملکوں اور قوموں کے تباہ کرنے کا چلا آرہا ہے۔ عرب کا ہرگروہ اختلاف طبقات کے ساتھ ساتھ یا تو شہری ہوتا تھا یہ وہ لوگ ہیں جو قریوں میں بستے۔ مکانوں میں آباد ہوتے تھے۔ انہیں کو اہل حضر اور اہل مدینہ کہتے تھے۔ ان میں سے بعض کے متعلق ابن خلدون کا یہ قول بہت صحیح ہے۔

"ان کے قلوب بہت سی برائیوں اور تاریکیوں سے آلودہ ہوچکے تھے۔ جسقدر ان میں لذائذ۔ اسباب تعیش توجہ الی الدنیا اور حب مال زیادہ ہوتی جاتی تھی اسیقدر وہ بھلائیوں سے بہت دور ہٹتے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ اُن کے باعظمت حالات میں بہت کچھ تغیر پیدا ہوگیا وہ بھری محفل میں اپنے بڑوں کے سامنے اور گھروں میں فحش گالیاں بکتے۔ یہ حالات ان کی طرف اس لئے تھی کہ وہ بُری خصلتوں کے خوگر ہو چکے تھے۔ ان کا قول وعمل یکساں طور پر ناقابل بیان ہے۔ غرضکہ وہ بیوفا بھی تھے مکار بھی۔ دھوکہ باز بھی اور وعدہ خلاف بھی۔ مگر یہ وصف تمام پر یکساں منطبق نہیں ہے۔ اسلئے کہ انہیں میں سے ایک مسلمان بھی ہے۔ جو چیدہ صفات کا مالک ہے۔ صدقہ وزکوٰۃ دیتا ہے۔ پابند عمل ہے۔ اس کا دامن آلودگیوں سے پاک وصاف ہے۔ مذہبی احکام پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہے۔ اپنی دنیا کے لئے اس طور پر کام کرتا ہے گویا وہ دائم الحیات ہے اور آخرت کا اس طرح خیال رکھتا ہے گویا کل ہی مرجائے گا۔"

خانہ بدوش صحرائی زندگی پر مجبور تھے۔ اس لئے کہ چٹیل زمینوں میں جہاں پیروں کو جلا دینے والی ریت کے انبار لگ گئے ہوں۔ نہ وہاں اناج کی پیداوار ہو نہ سبزی کی۔ کنویں گرمی کی شدت سے سوکھ گئے ہوں گھر سے ہونے کے باوجود ایک قطرہ پانی نہ دے سکتے ہوں ایسی حالت میں وہ دوسرے بن گھٹوں کی تلاش میں چلدیتے تھے۔ اونٹ کی موجودگی ان کے لئے ایک نعمت تھی ان کے گوشت اور دودھ پر زندگی بسر کرتے تھے۔ انہیں کے ذریعہ چراگاہوں کی تلاش کرتے۔ انہیں کے ذریعہ مرغزاروں میں جا پہونچتے۔ اور اپنے جانوروں کے لئے چارہ مہیا کرتے۔

گھاس اور پانی کی تلاش میں ان کی یہ تگ و دو ہمیشہ رہتی۔ سدا ان کا یہی طریقہ تھا۔ جہاں جاڑا آیا اور زمین ٹھنڈی ہونے لگی۔ فوراً شہر کا رخ کرتے اور جاڑا یہیں گذارتے۔ اگرچہ یہ زمانہ ان کے لئے بہت ہی تکلیف دہ اور صبر آزما ہوتا تھا۔

چونکہ صحرا کی سکونت ان کے لئے طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ اس لئے اگر وہ شہروں میں قیام پذیر بھی ہوئے تو تبدیلی زندگی میں ان کے مویشیوں اور چوپایوں کے لئے چراگاہوں اور جنگلوں کی معدومیت پریشان کن تھی۔ اسلئے وہ شہروں کو قید خانہ کی مانند تصور کرتے تھے۔ اور صحرائی زندگی کو جو انکے نزدیک عطیہ الٰہی تھی نعمت غیر مترقبہ سمجھتے۔ اپنی جانوں اور اپنی نفیس چیزوں کو اس زندگی کے لئے قربان کر سکتے تھے۔

لیکن جس طرح وہ اپنی ان خصوصیات کی وجہ سے شہریوں سے ممتاز تھے۔ اسی طرح سخت دلی میں بھی۔ مگر باوجود اس کے کہ وہ ذلیل و خوار ہونے کے لئے تیار نہ تھے اور باوجود اس کے کہ وہ بہت ہی بلند ہمت اور ریاست پسند تھے (اسی لئے انکی خواہشات ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہوتیں) ساتھ ہی ساتھ وہ قبول حق کے لئے بہت ہی تیزی کے ساتھ گامزن ہوتے۔ اس لئے کہ وہ بہت سادہ لوح بھی تھے۔ علامہ ابن خلدون نے ان کے متعلق بہت ٹھیک لکھا ہے کہ

"وہ لوٹ مار کے مرد میداں ہیں وہ بغیر شکست کھائے ہوئے اور خطرہ میں پڑے بغیر جو کچھ پاتے ہیں لے بھاگتے ہیں۔ ان کا رئیس بھی قومی عصبیت کی بنا پر جس کے ذریعہ وہ مدافعانہ اقدام کرتے ہیں ان کا محتاج ہوتا ہے۔ اپنے ماتحتوں پر احسان اور ان کے جھگڑوں سے چشم پوشی کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ تاکہ قومی وقار کو دھکا نہ لگ جائے۔ اس لئے کہ یہ صورت راعی اور رعایا دونوں کی بربادی کا پیش خیمہ ہوتی ہے"

علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ حاکم سیاست ملک کی بہبودی کی خاطر مختلف مفید مقصد صورتوں کو بروئے کار لائے۔ ورنہ اس کی حکومت مضمحل ہو جائے گی۔ عرب انہیں چیزوں کے خوگر ہو چکے تھے جو ان کی آنکھوں کے سامنے موجود تھیں ماسوا سے گویا انہوں نے اپنی توجہ کو بالکل ہٹا لیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی طبیعتوں کو سیاست سے دور کا تعلق بھی نہ رہا۔ مرور زمانہ کے ساتھ جبکہ ان کی طبیعتیں بدلتی اور مذہبی صورتیں اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ یہ چیز ان میں کالعدم ہو گئی انہوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا کہ اپنوں ہی میں سے ایک قائد مقرر کر لیتے جو انہیں مدافعانہ انداز میں حفاظت کی تدبیریں بتلاتا۔ وہی انہیں مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا۔ قتل و غارت اور برائیوں سے روکتا"

سب سے بڑا وصف زمانۂ جاہلیت کے عربوں میں یہ تھا کہ تعریف اور فخریہ باتوں کو بہت پسند کرتے اور اُن تمام اوصاف کے حاصل کرنے کی کوشش کرتے جو اُن کی شہرت کا ذریعہ بن سکتے۔ حمیت اور علو ہمت اسیلئے ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ شجاعت کے مرتبہ اعلیٰ کو جو کہ مدد مفاخر کا سرچشمۂ اعلیٰ ہے اہم ترین وصف جانتے تھے اس لئے کہ یہی ایک چیز ہے جسے انسان کی ابدی شہرت کا پیش خیمہ کہا جا سکتا ہے۔ دشمنوں کے مقابلہ میں دوستوں کی امداد۔ اور مال غنیمت کا حاصل کرنا اسی کا ضروری نتیجہ تھا۔ نصرت و امداد کی انکے نزدیک وہی حیثیت تھی جو اور لوگوں کے نزدیک حقوق شہریت کی ہوا کرتی ہے۔ اس لئے کہ اجتماعی فضیلت کا اسی پر دارومدار ہے۔ یا پھر ان کے نزدیک اس نصرت و امداد کی وہی حیثیت تھی جو متمدن اقوام میں معاہدۂ صلح کی ہوا کرتی ہے۔

امداد کا ضامن یا تو خود صاحب حق ہوتا یا اس کے ساتھ اس کا قبیلہ بھی شریک ہوتا تھا۔ اسلئے کہ تمام عربی قبائل میں جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا اپنی خاندانی حکومت ہوا کرتی تھی۔ وہ کسی دوسرے قبیلہ کے محکوم نہیں ہوتے تھے۔ وہ بدلہ کی صورت میں دشمن سے اپنا انتقام لیتے تھے۔ اور اس وصف میں تمام قبائل مساوی حیثیت رکھتے تھے کوئی قبیلہ کسی سے بدلہ لے رہا ہے کوئی کسی سے۔ غرضکہ ذمائم و محامد کی تحصیل ہی ان کی شر و خیر پر آمادہ کرتی تھی۔ کسی عرب کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ عامر بن طفیل بن مالک عامری کی قبر پر اس طور پر اظہار غم کرنے لگا کہ

"تلمے تیری کی ابوعلی پر رحم کر۔ بیشک تو ہر سمت لوٹ مار کرتا پھرتا تھا۔ لیکن پڑوسی کی حمایت کرتا۔ غلام کے ساتھ ایفاء وعدہ میں جلدی کرتا۔ مگر وعید کے معاملہ میں تاخیر۔ تو بھی نہ جھکتا جبتک کہ تلوار سے نہ جھکتے۔ تو خائف نہ ہوتا جبتک کہ تلوار خائف نہ ہو۔ تو پیاسا بھی نہ ہوتا یہانتک کہ اونٹ پیاسا ہو جائے۔ تو بہترین مخلوق تھا صرف اس لئے کہ کوئی کسی کے ساتھ نیکی کے معاملہ میں بخل سے کام نہ لے"

ایک عرب کسی کی انتہائی تعریف اسی طرح پر کرسکتا ہے۔ (اور یہ ان کے نزدیک ایک بہترین خوبی تھی) اس لئے کہ موت کے بعد کسی انسان کی شہرت کا قائم رہنا اس کے لئے بقاء دوام کا حکم رکھتی ہے۔

فاثنو علینا "لا ابًا لابیکمْ"
بافعالنا - ان الثناءَ ھو الخلدُ -

ہمارے کارناموں کی انہوں نے تعریف کی۔ اس لئے کہ تعریف ہی ہمیشہ رہنے والی ہے۔ لا ابًا لابیکمْ (اس قسم کے جملہ کو دعائیہ کہتے ہیں)

فان یکُ افنتہُ اللیالی فاوشکت
فان لہٗ ذکرًا سیفنی اللیالیا

اگر راتوں نے اس کو فنا کردیا ہے۔ تو اب وہ زمانہ قریب آگیا ہے کہ اس کی شہرت تاریکیوں کو ہٹا دے

ان کا ایک وصف بہادری بھی تھا۔ وہ خطروں کے وقت گھبراتے نہ تھے۔ وہ اپنے اس وصف میں ایک بلند مرتبہ پر پہونچ چکے تھے ان کے جوان اپنی طاقت سے کہیں زیادہ گراں ڈیل اشیائے کے محمل ہوتے اور اس خصوص میں ایک فرد اور ایک قبیلہ یکساں حکم رکھتے۔

أکرّ علے الکتیبۃِ لا اُبالی
أفیھا کان حتفی ام سواھا

میں لشکر دل پر حملہ آور ہوتا ہوں اس کی پروا نہیں کرتا کہ اسمیں میری موت ہوگی یا کسی اور کی۔

ولی نفسٌ تتوق الی المعالی
ستتلف اَمْ اُبلغھا مناھا

میرے پاس ایک نفس ہے جو بلندیوں کا طالب ہے۔ یا تو وہ خود تباہ ہو جائے گا یا اپنی آرزو کو پالے گا۔

وکفی تستقل بحمل سیفی
ولی ممن یھضمنی امتناع

میرا ہاتھ تلوار اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے۔ اور انکا لیکہ میرے مقابل کو مجھ تک پہونچنے میں رکاوٹیں ہیں۔

وحولی من بنی قحطان شیبٌ -
وشبانٌ الی الھیجا سراعٌ

میرے آس پاس بنی قحطان کے بوڑھوں اور جوانوں کی ایک جماعت ہے جو میدان جنگ کی طرف تیزگامی کرنیوالی ہے۔

اذا فزعوا فامرھمو جمیعٌ -
وان لاقوا فایدیھم شعاعٌ -

جب گھبرا جاتے ہیں تو ان کے کام میں اجتماعی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور اگر دشمنوں سے دوبدو ہوتے ہیں تو انکے ہاتھ آفتابی کرنیں پیدا کرتے ہیں۔

جب کسی قبیلہ کو ضرورتاً کسی خطرہ سے دوچار ہونا پڑتا تو تمام افراد متحد ہوکر جسم واحد کی صورت اختیار کر لیتے اور اپنی دلی خواہش کو پورا کرنے کی ٹھان لیتے۔ اور بہت کم ایسا ہوا ہے کہ انہیں کامیابی نہ حاصل ہوئی ہو۔ اسی کے متعلق کسی شاعر نے کہا ہے۔

کانوا علی الاعداء نارًا تلتظی
ولقومھم حرمًا من الاحرام

وہ اپنے دشمنوں کے لئے شعلہ فشاں چنگاریاں ہیں۔ اور اپنی قوم کے لئے جاپناہوں میں سے ایک جائے پناہ۔

منزلِ مقصود تک پہونچنے کے لئے دو چیزیں تھیں جن کی ان کے پاس بہتات تھی۔ ایک تو وحدت لسانی دوسرے اتحاد ملی۔ یعنی ہر قبیلہ کا مذہب اور زبان مخصوص تھی۔ اگر کہیں تمام عرب کے قبیلے اس زمانہ میں زبان (لہجہ) و مذہب کے لحاظ سے ایک ہوتے تو دوسرے رعب و دبدبہ میں کبھی ان کی برابری نہ کرسکتے۔ اور نہ کوئی دوسری قوم یا شخص ان کی حکومت میں مداخلت کرسکتا۔ اور نہ اتنے زمانہ تک وہ دنیا کے سامنے

غیر معروف رہتے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل جس کا انکار ناممکن ہے۔ یہ ہے کہ جس وقت وہ سب کی سب ہم عقیدہ اور اسلامی جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ تو کتنے ہی ملکوں کو فتح کر ڈالا۔ اور کتنی قوموں کو اپنا محکوم بنا لیا۔ پھر تو تمام قومیں ان کی عظمت کا لوہا مان گئیں۔ اور ان کے دلوں میں عربوں کا رعب بیٹھ گیا۔

عربوں کی ایک صفت حمیت وغیرت ہے (یعنی اپنے شرف آبرو۔ اور ناموس کی حفاظت) یہ وہی صفت ہے جس نے باوجود اختلاف قبائل کے دلیرانہ کاموں پر جری کیا۔ انتہائی بہادری اور شرافت کے جوہر ان میں پیدا ہو گئے۔ بعضوں نے تو اس حفاظت ناموس میں اسقدر غلو کیا کہ ان میں بہت سی صفات رذیلہ پیدا ہو گئیں۔ جیسے لڑکیوں کا زندہ درگور کرنا۔ لیکن وہ اس فعل شنیع کے سبب کو بہ نظر استحسان دیکھتے تھے۔ وہ دفع عار یا محتاجی کا خوف ہے۔ جس کی وجہ سے رشتۂ مناکحت قائم کرنے کے لئے کوئی کفو نہ ملے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غیر کفو کے ہاتھ میں اپنی عزت و آبرو کو دیدیں گی۔ اس لئے کہ وہ خود کمانے سے رہیں۔ لیکن جب عربوں نے اسلام قبول کیا تو بہت سی بُری عادتوں اور بُرے اخلاق سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے۔ اس کا ذکر قرآن میں بھی ہے

"ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق
نحن نرزقکم و ایاھم"

مشہور شاعر عرب فرزدق کا دادا صعصعہ لڑکیوں کو خریدتا اور قتل سے بچاتا تھا۔ فرزدق نے اپنے اشعار میں فخر کے ساتھ دادا کے اس وصف کا تذکرہ کیا ہے۔

ومنا الذی منع الوائدات
واحیا الوئید فلم توأد۔

(ہم میں سے وہ شخص بھی ہے جس نے زندہ درگور کی جانے والی لڑکیوں کو بچایا۔ اور ایسی لڑکیوں کو جو ابھی زندہ درگور نہیں کیگئیں)

لیکن باوجود اس کے زندہ درگور کرنے کا رواج بکثرت نہ تھا۔ جو کچھ تھا وہ بہت کم۔ اسلئے کہ عربوں کو بھی دوسری قوموں کی طرح بقاء نسل وخاندان کی حرص تھی۔ جیسا کہ تقاضائے طبیعت ہے، (اسکے پیش نظر) ایک غریب لڑکی کی شادی بادشاہ کے لڑکوں سے ہو جاتی تھی۔ خود امراء القیس کا نکاح اور اس کا قبائل عرب میں ایک صاحب عقل کو تلاش کرنا۔ اس کی شہادت ہے۔ اسی طرح محلق کلابی کی لڑکیوں کا قصہ بھی ہے۔

غرضکہ عربوں میں بہت سی صفات تھیں جن سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ان میں اپنے زمانہ کی ترقی یافتہ قوموں کے درجہ تک پہنچنے کی کسقدر خواہش تھی۔ اگرچہ وہ مضبوط اتحاد اور (اجتماعی) وحدت لسانی کے لئے ظہور اسلام کے محتاج تھے۔ پس جن صفات کی بنا پر وہ تمام قوموں سے ممتاز تھے۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔ علو ہمت۔ شرافت نفس۔ پڑوسی کی حرمت۔ مظلوم کی حمایت ایفاء وعدہ۔ صدق عہد۔ جرأت اقدام۔ عظیم الشان کارنامے محبت جود و کرم۔ اور یہ بات کہ آدمی ان کی تاریخ اور ان کے فخریہ . . . . . کارناموں کے دفتروں کو دیکھے۔ ان تمام صفات کے متعلق صدہا اشعار ہیں۔

جو شخص شعراء عرب اور ان کے خطیبوں کے اقوال دیکھے گا تو اسے اندازہ ہو جائے گا کہ ان میں کتنی اچھی خصلتیں اور عمدہ عادتیں تھیں۔ اسی کے ساتھ حالات کا احاطہ کر سکے گا۔ وفاء عزت اور اظہار فخر کو سموئل کے قصیدہ سے زیادہ کونسی چیز ظاہر کر سکتی ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

اذا المرء لم یدنس من اللوم عرضہ
فکل رداء یرتدیہ جمیل

(جب آدمی برائی سے اپنی آبرو کو لت پت نہ کرے۔ تو جو چادر وہ اوڑھے گا۔ اس پر زیب دے گی)

سخاوت اور حفاظت عمرو بن ایہم تغلبی کے کلام سے کس خوبصورت طریقہ سے عیاں ہے

ونکرم جارنا ما دام فینا۔
ونتبعہ الکرامۃ حیث کانا۔

(اپنے پڑوسی کی جبتک کہ وہ ہم میں رہے۔ عزت کرتے ہیں اور

اسکے پیٹ پیچھے جہاں کہیں بھی ہو ہم اس کی تعریف ہی کرتے رہتے ہیں) بلند ہمتی اور شرافت نفس حاتم طی کے کلام سے سے معلوم ہوتی ہے۔

اماان المال غاد ورائح
ویبقی من المال الاحادیث والذکر

(افسوس کہ مال آتی جاتی چیز ہے۔ اور وہاں) ملفوظات اور ذکر خیر باقی رہنے والے مال کی حیثیت رکھتے ہیں)

وقد علم الاقوام لو ان حاتما
اراد ثراء المال کان له وفر

(بیشک سب لوگ جانتے ہیں کہ اگر حاتم مال جمع کرنے کا ارادہ کرتا تو اس کے پاس اس کی بہتات ہوتی)

یفک به العانی ویاکل طیبا
ویحفظ عرضا ان هذا هو الفخر

(اس کے ذریعہ قیدیوں کو چھڑاتا ہے۔ بہتر غذا کھاتا ہے۔ اور دوسروں کی آبرو بچاتا ہے۔ یہی فخر کی باتیں ہیں۔)

ان کی ان صفات حسنہ کے بہت سے شواہد تھے۔ جن کا اظہار میلوں اور جلسوں میں ہوتا تھا۔ یہ جلسے عکاظ اور ذی المجاز وغیرہ مشہور بازاروں میں منعقد کئے جاتے۔ ان جلسوں میں وہ اپنے بہترین قصیدوں کو جو فخر و شجاعت حادثات۔ جنگیں۔ اور مدح و ذم سے بھرے ہوتے پڑھتے تھے۔

عرب اس وقت اپنی اصلی حالت پر تھے اس لئے کہ انکے ذرائع معاش وہی پرانے تھے۔ اور چونکہ انہوں نے اپنے انساب کو غیروں سے مخلوط نہیں کیا تھا۔ اس لئے مشرقیوں میں خونریزی کرم میں سب سے زیادہ۔ انتقام و مہمان نوازی میں بہتر۔ اور فخر و احسان میں سب سے برتر تھے۔ اگر بزرگ ترین حیوانات کے ساتھ تشبیہ دینا جائز ہو تو عربوں کو حمیت کے لحاظ سے اونٹنی اور صبر و قناعت کے لحاظ سے اونٹ سے تشبیہ دے سکتے ہیں (یہ ایک ایسی تشبیہ ہے جس سے بدو کبھی غضبناک نہ ہوگا۔ اس لئے کہ بدو عرب اپنے گھوڑے کی موت پر اس طرح روتے دیکھے گئے ہیں۔ جیسے کوئی اپنے عزیز کو یاد کر کے روتا ہو۔)

بورک ھارڈ سیاح نے بدوؤں کی صحیح تعریف کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بدو مہمانداری۔ کرم۔ حفاظت عہد بیان فرمودہ بہادری شرافت۔ زود فہمی۔ فراغت قلب۔ جب قناعت اور حریت کی خاطر شہریوں کے ذلت آمیز سلوک کے برداشت کرنے کی وجہ سے ممتاز ہے۔ وہ ان کے ساتھ معاملہ کرنے سے ان کے مکر و دھوکہ کو جان جاتا ہے۔"

ان کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ بھی تھی جس کی ہر انسان کو تقلید کرنی چاہئے کہ پڑوسیوں کے ستر سے چشم پوشی اور انکے حرم کے درپے نہ ہوتے تھے۔ ایک آدمی مسافرت میں جاتا۔ اپنے اہل و عیال کو گھر پر چھوڑ جاتا۔ تو اس کا پڑوسی ذمہ دار ہوتا۔ اور کسی برائی کا خیال بھی دل میں نہ لاتا بلکہ اس کی غیرت پڑوسی کی عورت کے معاملہ میں اپنی عورت سے زائد ہوتی۔ صرف اس لئے کہ وہ اپنے شوہر کے آنے تک اس کی حفاظت میں ہے۔ صفات عرب میں فصاحت بھی داخل ہے اور اسمیں مشہور ہونے والے اشخاص کی اسقدر کثرت ہے کہ احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ حکمت بھی سلسلۂ اوصاف میں شمار کی جاتی ہے۔ مشہور حکماء عرب میں لقمان بن عاد ہے۔ خطابت۔ اس میں سحبان وائل کی شہرت ہے ان کی عادتوں میں ایک عادت یہ بھی ہے جس نے ان کی۔ انکے انساب اور قوت کی حفاظت کی ہے۔ کہ وہ غیر جنس سے سوائے تجارتی معاملات کے اور کسی قسم کا تعلق پیدا نہ کرتے تھے۔ اور اپنے انساب کو غیروں سے آمیخت نہ کرتے نہ باپ کی طرف سے نہ ماں کی بلکہ اسے بہت برا سمجھتے۔ یہاں تک کہ اگر ان کے گھوڑوں اور اونٹ میں اس قسم کا اختلاط ہوتا تو وہ اسے بھی برا سمجھتے۔ اور اسکو ناپسند کرتے۔

ان صفات حمیدہ کے پہلو بہ پہلو ان میں بہت سی بری صفتیں بھی تھیں (اگرچہ نور اسلام کی تجلیوں نے ان سب کو کانٹ چھانٹ کر رکھدیا) ان میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ مثلاً شراب۔ جوا۔ بتوں اور بتوں کے نام کے تیروں سے بطور

عقیدۂ تقدیر) مشغولیت حالانکہ خدا نے ان کو حرام کیا۔ (انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون)

شراب کے معاملہ میں تو انہیں بہت غلو تھا۔ تمام فخریہ کارنامے اسکی ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ دن کے اکثر حصہ میں اسیکا ذکر رہتا۔ ہر وقت کی شراب ہی کا ایک جداگانہ نام تھا۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ اسکی پینے میں بدنی مالی۔ اور عقلی کسقدر نقصانات اور نتائج کس درجہ خطرناک ہیں۔

جوا کھیلنے سے ان کا منشا یہ تھا کہ انکی دولت و ثروت کا اظہار ہو اور چونکہ یہ عادت برائیوں کا پیش خیمہ۔ نیز جو لوگ مفلس تھے اور قرض پر زندگی بسر کرنا ان کا شیوہ تھا ان لوگوں کی جانب سے بغض و حسد کا ذریعہ بنتا تھا اس لئے اسلام نے اس کو ممنوع قرار دیدیا

انصاب پتھر اور دہات کے ٹکڑے ہوتے تھے جنکو مختلف صورتوں میں گھڑ لیا جاتا تھا۔ ان پہ طرح طرح کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔ اس گمان کے ساتھ کہ یہ تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے۔ اور یہ بت خدا کے سامنے ہماری سفارش کریں گے اس میں جسقدر شرک و گمراہی ہے وہ ظاہر ہے۔

ازلام۔ اس کا واحد زلم ہے۔ یہ لکڑی کے تین ٹکڑے ہوتے تھے۔ جنہیں ازلام استخارہ اور ازلام قسمت کہا جاتا تھا۔ ایک پر امر۔ دوسرے پر ناھی۔ اور تیسرے پر غفل لکھا ہوتا تھا۔ جب کوئی شخص کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا تو ان تینوں کو ملا کر کسی ایک کو اٹھا لیتا۔ اگر امر نکلتا تو اس کام کو کرتا۔ اور ناھی نکلتا تو نہ کرتا۔ ہاں غفل نکلنے کی صورت میں از سرِ نو تیروں کو ملا دیتا تھا۔ بغیر اس خوف کے کہ اس فعل کو حقانیت سے کسقدر بعد اور اعتقادی گمراہی میں بہ نسبت اُن کاموں کے جو ایک بے بس سے بلا اختیار صادر ہوتے ہیں کسقدر دخل ہے۔ اس لئے اسلام نے اس سے بھی روک دیا جس طرح کہ اور گمراہ کن اعتقادات سے باز رکھا۔ اسیطرح ان کی رکیک عادتوں میں استسقا بالعشر بھی شامل تھا اسکی صورت یہ تھی کہ خشکی اور قلت باراں کے زمانہ میں بارش کے لئے عشر و سلع دو گھاسوں کے گٹھے بناتے تھے۔ اور ان کو اونٹ کی دموں میں باندھ دیتے پھر ان میں آگ دیکر اونٹوں کو ساتھ لیکر پہاڑوں اور بلند ٹیلوں پر چڑھتے تھے۔ لیکن اسطور پر کہ ان کے بچوں کو ان سے علیحدہ رکھتے۔

(ابھی کچھ عرصہ ہوا یورپین علمائے نزول بارش کا ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بہت فلیٹ دھواں اوپر چھوڑا گیا۔ اس کے بعد تقاطر ہوا۔ امریکہ نے اس تجربہ میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اسے "مصنوعی بارش" کہتے ہیں)

ان میں ایک بری عادت یہ بھی تھی کہ عورت سے لونڈی کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ اگرچہ طلاق و نکاح میں اس کو آزادی تھی۔ اسلام نے عورتوں کو حقوق دیکر ان کی اس عادت کا بھی قلع قمع کر دیا۔ اس قسم کے حقوق و امتیازات کسی دوسرے قانون میں نہیں پائے جاتے جس شخص نے شریعت اسلامیہ کے شعبۂ حقوق کا مطالعہ کیا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے۔ اسیطرح عرب جاہلیت بچوں اور عورتوں کو ورثہ نہیں دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ جو نیزہ باز ہو۔ ملک کی طرف سے مدافعت کر سکے اور مال غنیمت جمع کر سکے وہی وارث ہو سکتا ہے۔ جب اسلام آیا تو اس نے انکے لئے بھی ورثہ میں حصہ مقرر کیا خدائی ارشاد ہے (للرجال نصیبٌ مما ترك الوالدانِ والاقربون وللنساء نصيب مما ترك الوالدانِ والاقربون مما قلَّ منهُ او كثُرَ نصيبًا مفروضا)

غلاموں کی تجارت کرتے تھے۔ اکثر باندیوں کو اپنے لئے مخصوص کر لیتے۔ لیکن ان سے جو اولاد ہوتی اس کو غلام سمجھتے اور غلاموں کا سا برتاؤ کرتے۔ مگر ہاں ان بچوں میں اگر کوئی قابل فخر شرافت و بہادری کا مالک نکل آتا تو اس وقت اس کا لوہا مان جاتے اور بیٹے کے نام سے ممتاز کرتے۔ لیکن اسلام نے غلام بنانے کے لئے اسقدر شرطیں عائد کر دیں کہ ان کے ہوتے ہوئے غلامی کا وجود شاذ و نادر ہی ہو کر رہ جائے۔ خود غرضانہ محرکات سے الگ ہو کر اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرنے والا اچھی جان سکتا ہے

کہ اسلام نے غلام کے ساتھ کسقدر نرمی اور حسن معاملہ کا درس دیا ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں عرب بہت سے ایسے کام کرتے تھے جن کو اسلام نے بھی باقی رکھا۔ مثلاً حج۔ عمرہ۔ طواف۔ سعی۔ وقوف نواہی۔ غسل جنابت۔ کلی۔ ناک میں پانی دینا۔ کنگھی۔ مسواک۔ استنجا۔ ناخن ترشوانا۔ بغل کے بال۔ نیز موئے زیرناف صاف کرنا۔ اور ختنہ وغیرہ۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ پانچ چیزیں مقتضائے فطرت ہیں ختنہ۔ سوئے۔ لبیں لوانا۔ ناخن ترشوانا۔ اور بغل کے بال اکھاڑنا۔ ایسے ہی بخاری کی ایک حدیث میں ہے۔ اس کا تعلق شاہ غسان کے قاصد سے ہے جبکہ اس نے اس کو شاہ ہرقل کے پاس بھیجا تھا۔ اس سے صراحتاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کی عادت میں ختنہ کرانا داخل تھا۔ نیز چور کا دایاں ہاتھ کاٹنا۔ اسلام نے بھی ان چیزوں کو باقی رکھا۔

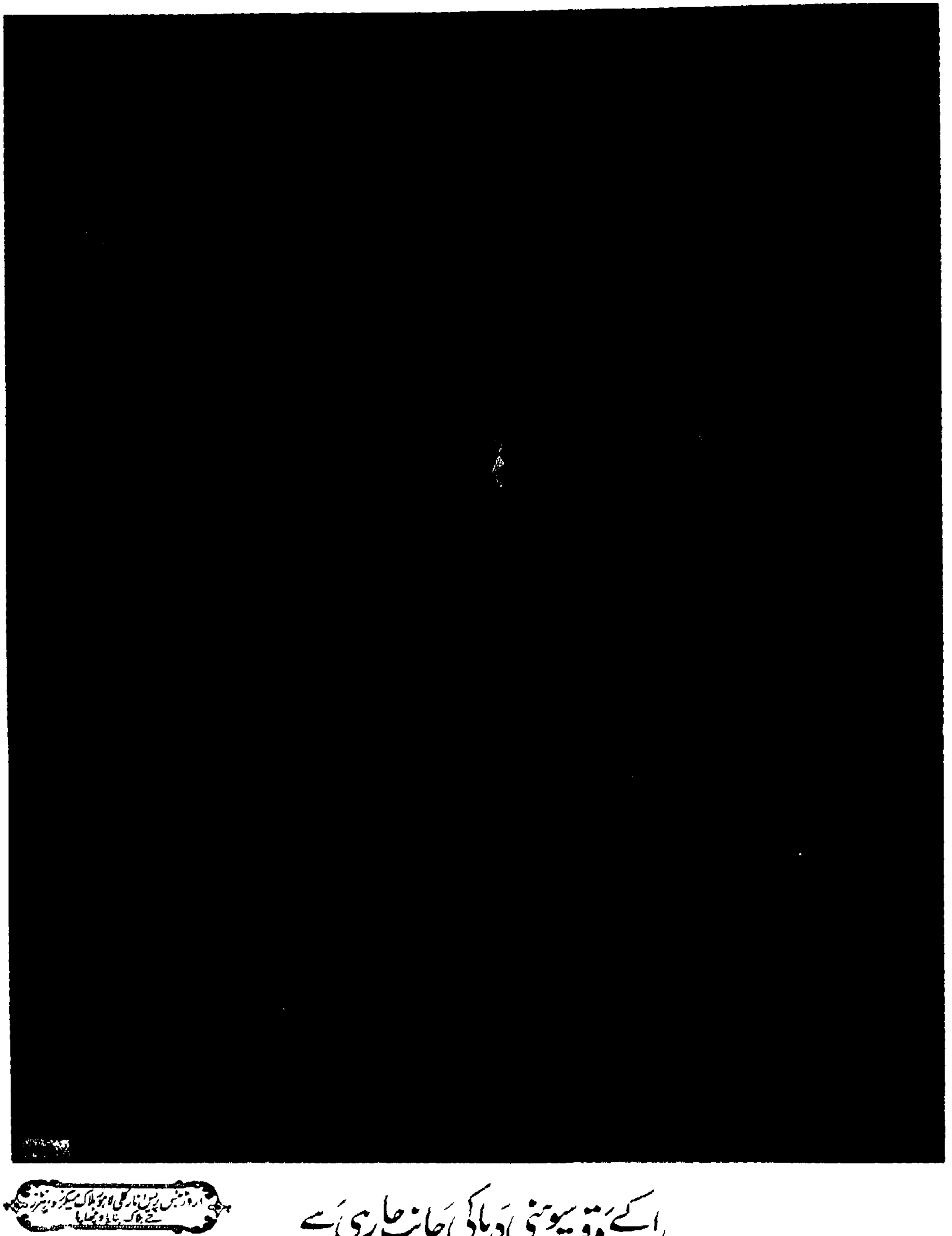
ان کی یہ بھی عادت تھی کہ جنگ کے قیدیوں کو قتل کر ڈالتے تھے۔ لیکن اگر قیدی قید کرنے والے کی کوئی چیز کھا پی لے تو قتل سے بچ جاتا اور اس کے بعد چھوڑ دیا جاتا مگر اس کی پیشانی کاٹ لی جاتی تھی۔ اگر کوئی شریف قید ہو جاتا تو دو سو اونٹ فدیہ میں دیتا تھا البتہ اسلام نے عربوں سے اس قید کے جھنجھٹ کو دور کیا۔ بلکہ اس کے لئے اتنی قیود رکھیں کہ آدمی اپنا بچاؤ حسن معاملہ اور آزادی دینے ہی میں سمجھے۔

مردوں کی صفات وعادات بیان کر دینے کے بعد اب یہ مناسب ہے کہ کچھ یوں ہی سا بدوی عورتوں کے متعلق تذکرہ کیا جائے۔ وہ تعداد کے لحاظ سے مردوں سے زیادہ اور طبعاً نرم ورقیق القلب لیکن باوجود اس کے نخوت و بہادری میں مردوں سے کم نہ تھیں تکلیفیں اٹھاتیں۔ مشقتیں برداشت کرتیں۔ سختیاں سہتیں۔ اور ہر طرح کی دشواریوں میں مردوں کا برابری کے ساتھ ساتھ دیتیں اسی لئے ہر وادی میں اپنے خیموں کو ایستادہ کرتیں۔ اور مردوں کی امداد کرتیں یہاں تک کہ لڑائیوں میں۔ درحقیقت مردوں سے ان کا بہت گہرا تعلق ہوتا تھا۔

انہیں بدویت سے اسقدر لگاؤ تھا کہ شہریت کے نام سے نفرت آتی تھی۔ اور کیسی نفرت کہ اگر کوئی شہری ان کی لڑکی کی خواہش کرتا تو کہدیا کرتی تھیں کہ "صکاک باب ما اریدنہ" یعنی جب سوتا ہے تو دروازہ بند کرتا ہے گویا وہ بزدل ہے ایسے لڑکے کو میں نہیں چاہتی۔ میری لڑکی کے لائق نہیں ہے۔ اور اس خیال کی حیثیت ان کے نزدیک نہ ٹلنے والے حکم کی مانند تھی......!

.... اس کے علاوہ انہیں انسان کو پرکھنے کی مہارت تھی اور عجیب وغریب طریقے جانتی تھیں۔

ان کے لباسوں کی ہیئت ایک طرح کی سوتی تھی جو بدلتی نہ تھی البتہ باکرہ لڑکیاں اکثر اوقات آگے اور پیشانی کے بال کاٹ دیتیں۔ اور صرف پیشانی کے اوپر سر کی انتہائی بلندی کے پاس اپنے بالوں کو ظاہر کرتیں۔ اور جب شادی شدہ ہو جاتیں تو بالوں کو لٹکا دیتیں۔ اور ان کو رومال سے چھپا دیتی تھیں۔ باکرہ اور ثیبہ کے درمیان مابہ الامتیاز یہی چیز تھی۔ بلا تکلف وہ بہت سی ایسی باتوں کو عمل میں لائیں کہ اگر اسوقت اسیطرح کی کوئی بات یورپین لیڈیاں کے دماغ کا اختراع ہوتی ہے تو وہ اس کی خوشی میں ایک محفل مسرت منعقد کرتی ہیں۔ اس کو چیئرز دیئے جاتے ہیں۔ اخبارات میں اس کے چرچے ہوتے ہیں۔ حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ بدوی عورتیں ان سے پہلے اسی کام کو بلا اظہار فخر کر چکی ہیں۔ ہاں دونوں کے لباسوں میں فرق صرف اتنا کہ وہ آخر وقت تک ایک ہی ڈھنگ پر رہا اور آجکل ہر روز کچھ نہ کچھ تغیر ہوتا رہتا ہے۔ نیز بدوی لباس اس وقت شہری ہو گیا اور شہری متروک۔ لمبے لمبے کرتے جن کو یورپین عورتوں نے چھوڑ دیا ہے بادیۂ عرب میں مستعمل ہیں اسیطرح تنگ کرتے بھی جو اسوقت مستعمل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قدیم وجدید دونوں طریقوں کو جمع کرنا چاہتی ہیں۔ مالدار عورتیں تنگ کرتے اور ان کے اوپر لمبے کرتوں کا استعمال کرتیں جن کے کنارے کھنچے ہوتے تھے۔ البتہ لمبے دامن جن کا استعمال متمدن لڑکیوں میں دو موقعوں پر ہوتا ہے۔ ایک تو عروسی لباس میں۔ دوسرے گھر لو لباس میں۔ بادیۂ عرب میں ان کا



اردو مبس پریس انارکلی لاہور بلاک میکرز و پرنٹرز نے بلاک بنایا و چھاپا

رات کے وقت سوہنی دریا کی جانب جا رہی ہے

(سوہنی اور مہینوال کے متعلق مفصل نظم اسی سالانہ نمبر میں دوسری جگہ ملاحظہ فرمائیے)

استعمال عام تھا۔ ہاں دامن کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے چلنا اس سے تو شعراء کی کوئی نظم خالی نہ ہوتی تھی۔ یورپین لیڈیوں کی طرح وہ بھی کمر پٹہ استعمال کرتی تھیں۔ جسے ایک خاص قسم کے کچے تاگے سے بناتی تھیں۔ یہ مضبوطی میں لوہے اور فولاد سے زیادہ اور بہت نرم ہوتا تھا مگر استعمال ذرا کم کرتی تھیں۔ تاکہ تکلیف دہ نہ ہو۔ ایک دوسرے قسم کے کمر پٹہ کا بھی استعمال کرتی تھیں جس سے ایلی عورتوں کا سینہ ابھرا رہتا تھا۔

بلوجودیکہ دور حاضر میں کپڑوں کی زینت میں بہت غلو اور لباس کی ایجاد کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ سیکڑوں برس ہوئے بادیۂ عرب میں اس لباس کی ایجاد ہو چکی ہے۔ بلکہ عرب کے شہری اور بدوؤں نے پہلے ہی لباس کے بارے میں طرح طرح کے تفنن سے کام لیا ہے۔ عظامۃ۔ مرفد اور عجیزہ مختلف قسم کے نام بھی رکھ دیئے۔ غرضکہ زمانۂ موجودہ اپنے اختراعات کے باوجود نشو و نما اور ترقی میں ان کے برابر نہ پہونچ سکا۔ اب انکے متعلق یہ کہنا کہ ان کا لباس دیر طلب نہ تھا ان کو بہت وقت اور روپیہ صرف نہ کرنا پڑتا تھا ایک کھری سی بات ہے۔ مگر اُن کی عورتیں۔ نازک اور حسین عورتیں لباس ہائے فاخرہ سے مزین ہوتیں تو لباس کی تنگی تکلف دشواری۔ اور گرانی کو محسوس نہ ہونے دیتی۔

پردہ نشین عورتیں صورج سے باہر آکر اپنے چہروں پر سیاہ رومال کا نقاب ڈال کپڑوں میں رنگوں کی کثرت کو پسند کرتی تھیں۔ سب سے بہتر رنگ ان کے نزدیک سرخ تھا۔ بھاری بھاری زیور بھی پہنتی تھیں جیسے کنگن کڑے۔ جسب اطاعت سونے اور چاندی دونوں طرح کے۔ ناک میں بہت بڑی نتھ ہوتی۔ اکثر سونے کی ہوتی جس پر کم قیمت پتھر جڑے ہوتے جیسے فیروزے کے نگ۔ ان کی بالیاں بھی بہت لمبی چوڑی ہوتیں۔ لمبائی دو تیراط چوڑائی ایک کے برابر۔ مختلف قسم کے ہار اور گجرے سونے اور چاندی کے بناتی تھیں۔

اسباب زینت میں مہندی بھی شمار تھی جس کا بکثرت استعمال ہوتا۔ ہاتھوں۔ انگلیوں۔ ناخونوں ایڑیاں اور پیر کی انگلیوں میں مہندی لگاتیں۔ ہونٹوں پر سرخ خضاب۔ آنکھوں میں سُرمہ۔ بھنوؤں کو لمبائی میں باریک کر لیتی تھیں۔ بالوں میں خالص تیل استعمال کرتی تھیں۔ اسی طرح گدانے کا شوق بھی تھا۔ جلد کو کریدتی اور سیاہ رنگ کے مختلف کے نقش و نگار کے ساتھ مزین کرتیں۔ پیشانی کے بیچ میں۔ ٹھوڑی اور ناک کے کنارے پر چھوٹے چھوٹے نقطے ڈالتی تھیں۔ بسا اوقات نیچے کا ہونٹ۔ رخسار۔ بازو۔ اور قدموں کو بھی گدگدا ڈالتی تھیں۔

ان کی اخلاقی حالت بہت اچھی ہوتی تھی۔ ان کی امتیازی صفت پاس آبرو۔ اور اہل و عیال کے ساتھ انتہائی محبت تھی۔ وہ اکثر مردوں کے کرنے کے کام کر ڈالتی تھیں۔ مگر مرد ان کے کام نہ کر پاتا۔ مرد کا یہی مشغلہ ہے کہ دوسرے مارے لوگوں سے جنگ کرے۔ عورت ان میں سے اکثر امور میں مرد کا ساتھ دیتی۔ اگر مرد از دست رفتہ مال یا مدافعت کے لئے کچھ دنوں کے واسطے اہل و عیال سے الگ ہو جاتا۔ تو وہی مالکۂ بیت ہوتی۔ اسپر معیشت و تربیت کی تمام ذمہ داریاں عائد ہوتیں۔ بہرحال مرد کو عورت پر پورا بھروسہ ہوتا تھا گو اس کا امکان تھا کہ عورت مرد پر پورا اعتماد نہ رکھے۔ مگر باوجود اس کے وہ بہر صورت راضی اور مرد نا راضی رہتا تھا۔ یہ ہر اس شے کے لئے لازمی ہے جس کو تمدن سے کوئی لگاؤ نہ ہو۔ عشق و پریشاں حالی جو بعض وقت جنون تک پہونچ جاتی یہ عرب میں ہمیشہ رہی اور رہے گی۔ لیکن ان کا عشق عموماً اس قدر پاکبازانہ ہوتا جس کا عشر عشیر بھی دوسرے ملکوں میں بھی نہیں سنا گیا۔ اسی لئے ہم ان کے اشعار کو اکثر تغزل اور تشبیب سے لبریز پاتے ہیں۔ لیکن خیانت اور عدم عفت گو وہ کسی خاص قبیلہ ہی میں ہوتی مگر اس کا وجود شاذ و نادر تھا۔

خلیل احمد
(فاضل دینیات)

دورِ جدید

از جناب بسمل الہ آبادی

مدعا نامہ ہے بس اس چیز کا مطلب کیا
ہر نیا رنگ نیا ڈھنگ نیا مذہب کیا
پوچھے مذہب کے دیوانوں سے کوئی بسمل
جس پہ جھگڑا ہے اٹھے آپ ہیں یا وہ مذہب کیا

سمجھے ہیں جسے ان کی ترقی کا سبب
کچھ نہیں ہے وہ فقط ان کی تباہی کا سبب
سمجھے ہیں جسے آج وہ سمجھے ہی نجات
بسمل جو غیر سے ملی ہے سب
جینا آسی ہے بس جو بھی ہے سب

بشر کو چاہئے ہر وقت نیک کام کرے
غرض یہ جینے سے دنیا میں ہے کہ نام کرے
سلام دور سے ایسے اسلام کو بسمل
وہ چاہتے ہیں کہ دنیا ہمیں سلام کرے

گزشتہ ہے زمانہ قسمت ہے اپنی کھوٹی
کھانے کو پیٹ بھر اب ملتی نہیں ہے روٹی
مفلس ہی ہو رہے ہیں اور رہا ہوں بسمل
تہذیب بن جائے گی کسی دن بھولی بھی کیا لنگوٹی

حرماں نصیب

از جناب ایم - اسلم صاحب.

سردیوں کا موسم تھا - آسمان پر بادل کے خیمے ڈیرے لگے ہوئے تھے - برکھا ہوئی تو نہیں تھی لیکن آس لگ رہی تھی - خشک جاڑا پڑ رہا تھا -

شام کا وقت تھا اور میں اپنے کمرے میں کمبل اوڑھے قالین پر بیٹھا کوئی اخبار دیکھ رہا تھا - اتنے میں دروازہ کھلا اور خادم اندر آیا -

"چائے نہیں لائے تم ؟"

"جناب تیار ہو رہی ہے - ایک بی بی ملنا چاہتی ہے"

"کون ؟"

"کوئی برقعہ پوش عورت ہے"

"کہاں سے آئی ہے ؟"

"میں نے پوچھا نہیں - حکم ہو تو اندر لے آؤں"

"جاؤ لے آؤ"

میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ ملنے والی کون ہے کہ خادم ایک برقعہ پوش کو ساتھ لایا -

میں نے اخبار چھوڑ کر پوچھا

"بی بی ! فرمائیے کیا کام ہے"

وہ بولی

"میں ایک بیکس . . . . مظلوم ہوں"

میں نے یہ آواز پہلے بھی سنی ہوئی تھی - لیکن پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہوں اس نے برقعہ اٹھا دیا اور کہا

"افسوس ! آپ بھی مجھے بھول گئے"

"کون ؟ زہرہ !"

"جی ہاں"

زہرہ یا بیگم عباس کو میں اس وقت سے جانتا تھا جب وہ محلے کے مدرسہ میں پڑھتی تھی قدرت نے اسے حسن اور نزاکت عطا کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا - زہرہ کی شادی میرے دوست عباس سے ہوئی تھی - دونوں میاں بیوی تعلیم یافتہ تھے - اور آزاد خیال بھی - عباس اکثر اوقات زہرہ کو جہاں جاتا ساتھ ہی لے جاتا

زہرہ کو نفیس اور خوبصورت لباس پہننے کا بہت شوق تھا - اور حقیقت میں لباس اسے سجتا بھی خوب تھا - گھر سے باہر نکلتے وقت وہ ایک باریک سی نقاب چہرے پر ڈال لیا کرتی - عباس مغربی تمدن کا بہت دلدادہ تھا اور زہرہ شوہر کو خوش کرنے کے لئے اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھی - لیکن اس کے ساتھ ہی دونوں صوم و صلوٰۃ کے بھی پابند تھے - اور مذہب کا بہت احترام کرتے تھے -

---

عباس ایک کاروباری آدمی تھا - شادی کے دوسرے سال زہرہ کا دامنِ مراد گلِ امید سے لہلہاتا نظر آنے لگا - اور خدا نے اسے ایک چاند سا بیٹا عطا کیا اور عباس اختر اس کا نام رکھا گیا - اس اخترِ سحر کے طلوع کے تین سال بعد ایک چھوٹی سی بچی بھی زہرہ کی محبت بھری آغوش میں کھیلتی نظر آنے لگی - بچی کا نام ناہید رکھا گیا -

---

میں ہمیشہ اس جوڑے کو رشک کی نظر سے دیکھا کرتا۔ اولاد ہو جانے کے بعد تو میاں بیوی اور بھی ایک دوسرے کے متوالے نظر آنے لگے۔ لیکن افسوس فلک فرجام کسی اور ہی خیال میں تھا۔

ناہید ابھی پانچ چھ مہینے کی ہوئی تھی کہ عباس کو کاروبار کے سلسلہ میں افریقہ جانا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خصوصیت سے پنجاب سے لوگ بکثرت افریقہ جا رہے تھے۔ اور جن میں سے اکثر جاتے ہی لقمۂ نہنگ اجل ہو جاتے۔ شیروں اور سانپوں نے جسقدر ہلاک کر ڈالے ان کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا۔

عباس کی رخصت کا دن زہرہ کے لئے روزِ محشر سے کم نہ تھا۔ چلنے سے ایک روز پہلے عباس نے مجھے گھر بلوایا۔ زہرہ مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ رو رو کر غریب کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ چہرہ بالکل اُتر گیا تھا عباس بھی مغموم سا نظر آتا تھا۔ ناہید ماں کی آغوشِ محبت میں پڑی سو رہی تھی۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ عباس بولا۔

"یہ بچے اور زہرہ ...... اللہ کے بعد تمہارے حوالے ہیں"

اس کی آواز بھرا گئی لیکن وہ طبیعت پر ضبط کر کے کہنے لگا۔

میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ فضلِ ایزدی کسقدر میرے شاملِ حال ہے خدا نے آسودگی بھی دی اور اولاد بھی عطا کی۔ اور تم جیسا دوست ...."

"اب اس وقت ان باتوں کا ذکر کیا؟" میں نے بات کاٹ کر کہا۔

وہ بولا

تم جانتے ہو افریقہ کا سفر بچوں کا کھیل نہیں۔ کل شام تک تو میں آپ لوگوں کے پاس ہوں۔ کون جانے پھر کیا واقعات پیش آئیں۔ مجھے امید ہے کہ میری عدم موجودگی میں تم ان کی طرف سے غافل نہیں رہو گے۔ میں نے قانونی طور پر بھی تمہیں ان کا نگران مقرر کر دیا ہے"

میں نے اسے یقین دلایا کہ انشاء اللہ میں اس کی امانت کی پوری پوری خبرگیری کروں گا۔ اگلے روز شام کے وقت اسٹیشن پر عباس کے بہت سے ملنے جلنے والے موجود تھے۔ ہم نے اسکے گلے میں ہار ڈالے۔ وہ سب سے بغلگیر ہوا۔ اور جب گاڑی حرکت کرنے لگی تو ہم سب دس پانچ قدم اللہ حافظ خدا حافظ کہتے ساتھ گئے

عباس کو گئے ایک سال سے زائد عرصہ ہو چکا تھا۔ مہینے بھر میں وہ دو خط ہمیں ضرور بھیجا کرتا۔ لیکن اب پورے ایک مہینے سے اس کا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ چنانچہ ایک روز جو میں زہرہ کے ہاں گیا تو میں نے پوچھا۔

"کہئے! کوئی خط آیا؟"

زہرہ بولی۔

"یہی تو میں آپ سے پوچھنے والی تھی۔ مجھے تو اس مہینے کوئی خط نہیں آیا۔ خدا خیر کرے ... پردیسی کا اللہ حافظ"

"ممکن ہے کہیں سیر کو چلا گیا ہو۔ گھبرائیے نہیں۔ انشاء اللہ دونوں خط اکٹھے آئیں گے"

لیکن ایک مہینہ کیا پورا ایک سال گذر گیا اور عباس کی کوئی خبر نہ آئی۔ میں نے ہر ممکن طریق سے اس کا پتہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ کئی لوگوں کو لکھا۔ ڈاک خانہ والوں کو لکھا۔ حکومت سے استفسار کیا۔ لیکن سب بے سود۔ سب نے لاعلمی کا اظہار کیا بہت مدت کے بعد گورنر کے دفتر سے صرف اسقدر اطلاع ملی کہ عباس برٹش افریقہ میں کہیں موجود نہیں۔

یہ تمام عرصہ زہرہ نے کیسے کاٹا۔ اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔ گو خرچ کی تنگی نہ تھی لیکن اس کی زندگی موت سے بدتر معلوم ہوتی تھی۔ اسی طرح پانچ سال گذر گئے۔ اور اس پر تازہ مصیبت یہ نازل ہوئی کہ جس بنک میں زہرہ کا روپیہ تھا اس نے دیوالہ نکالا۔ اور روپے کے چار پیسے رہ گئے۔

اس واقعے کی خبر پا کر میں نے ایک روز باتوں باتوں میں کہا۔

"زہرہ! میں آج عباس کی آخری وصیت ..... خدا اسے جلد زندہ سلامت واپس لائے۔ پوری کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ آج سے تمہارے گھر کے سب اخراجات میں ادا کیا کروں گا کسی خرچ میں کمی کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب تک دم میں دم ہے

عباس کے بچے میرے دم کے ساتھ رہیں گے"

زہرہ نے سر جھکا لیا۔ اور پھر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں بہت دیر تک پاس بیٹھا اسے تسلی دیتا رہا۔ وہ بولی۔

"میں تو اس پردیسی کی آس میں زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔ ..... میرا تو دل نہیں مانتا کہ ان کے دشمنوں کو کوئی بری گھڑی دیکھنی نصیب ہوئی ہوگی"

کچھ دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ اور پھر میں اپنے مکان کو اُٹھ آیا۔

مجھے گاہے گاہے دو چار روز کے لئے اپنے گاؤں جانا پڑتا تھا۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ میں کوئی دس روز کے بعد واپس لوٹا۔ ابھی گھر تک نہیں پہنچا تھا کہ میرا ایک دوست مجھے راستہ ہی میں مل گیا اور باتوں باتوں میں بولا۔

"یہ تو تم نے اچھا ہی کیا۔ بے چاری کب تک یوں بیٹھی رہتی عباس کو لاپتہ ہوئے بھی تو اب چھٹا سال جاتا ہے"

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔ کس کا ذکر کرتے ہو"

وہ میری طرف تعجب سے دیکھ کر بولا۔

"تو کیا تمہیں علم ہی نہیں"

"کیا؟"

"یہی کہ زہرہ نے نکاح کر لیا ہے"

میں یہ سنکر سناٹے میں آگیا۔

"کب نکاح ہوا۔ کس سے ہوا؟"

"پرسوں شب شیخ طاہر بخش سے"

"شیخ طاہر بخش سے؟"

"ہاں ہاں وہی جو محلے کے پرلے کونے پر رہتے ہیں"

میں یہ سنکر گھر جانے کی بجائے سیدھا عباس کے ہاں پہنچا۔ ماما نے دروازہ کھولا۔ "بچے۔ چچا جان" کہتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئے ناہید رونے لگی۔ اور عباس اصغر بھی کچھ اداس سا نظر آتا تھا۔ میں نے ناہید کو گود میں اُٹھا لیا۔ اور عباس اصغر کو بھی پیار کیا۔ پھر ماما سے پوچھا کہ آخر یہ قصہ کیا ہے۔ میرے زور دینے پر وہ بولی کہ شیخ طاہر بخش ایک مدت سے شادی کے پیغام بھیج رہا تھا۔ بیگم صاحبہ ہمیشہ تلخ جواب دیتی رہیں۔

پرسوں رات وہ عمر بھر میں پہلی بار رات گھر سے باہر رہیں صبح جب آئیں تو مجھ سے سب بات کہدی

"اور اب ہے کہاں؟"

"شیخ کے گھر میں"

"کب آئے گی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔ کل آئیں تھیں۔ بچوں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی رہیں۔ اللہ جانے کیا بات ہوئی۔ بس روتی تھیں اور بار بار یہی کہتی تھیں کہ انہیں کس کے حوالے کروں"

اچھا! خبردار بچوں کی طرف سے ہرگز غافل نہ رہنا۔ جس چیز کی ضرورت ہو مجھ سے لو"

ماما اور بچوں کو تسلی دیکر میں سیدھا شیخ طاہر بخش کے ہاں پہنچا۔ جب اطلاع کروائی تو پہلے تو یہ جواب ملا کہ اس وقت مل نہیں سکتے۔ جب میں نے دوبارہ پیغام بھیجا تو آپ باہر تشریف لائے اور آتے ہی پوچھا۔

"کیا ارشاد ہے؟"

"میں ذرا مسز عباس سے ملنا چاہتا ہوں"

"کون مسز عباس؟" وہ ذرا تنک کر بولے۔

"مسز عباس نہ سہی۔ زہرہ بیگم سہی"

"لیکن آپ جسے مسز عباس کہتے ہیں وہ تو میری منکوحہ ہے"

"ہوگی" میں نے کہا۔ لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میں قانوناً اسکا اور اس کے بچوں کا نگراں ہوں"

"ہونگے۔ ہونگے" اور پھر اسی طرح تنک کر "لیکن آپ میری

بیوی سے نہیں مل سکتے"

میں نے کہا۔

"شیخ صاحب! بیشک میں آپ کی بیوی سے نہیں مل سکتا۔ لیکن اس عورت سے ضرور مل سکتا ہوں جس کا اور جس کے بچوں کا میں نگراں اور محافظ ہوں۔ آپ قانوناً بھی روکنے کے مجاز نہیں"

اب ذرا شیخ صاحب کی آنکھیں کھلیں۔ لیکن پھر بھی ناک بھوں چڑھاکر صرف اسقدر کہا۔

"تو خیر آپ پھر کسی وقت تشریف لادیں۔ میں اس کے متعلق سوچوں گا۔"

"یوں ہی سہی" میں نے کہا۔ "کل بارہ بجے آؤں گا۔ اور اس وقت زہرہ کو مجھ سے ملنا ہوگا۔

شام ہوتے ہی میں پھر عباس کے بچوں کو دیکھنے گیا لیکن اس وقت زہرہ بھی خلاف توقع وہاں موجود تھی۔

پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہوں وہ بولی۔

"میں بہت نادم ہوں۔ لیکن سچ پوچھئے تو آپ کے احسانات کی متحمل نہ ہو سکی"

"لیکن بچوں کے متعلق کیا سوچا؟" میں نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔

"بس یہی ایک پھانس تو مجھے کل نہیں آنے دیتی"

"آخر کچھ تو فیصلہ کیا ہوگا"

"پہلے تو یہی وعدہ تھا کہ بچے میرے پاس رہینگے لیکن ...."

وہ فقرہ پورا نہ کر سکی اور رونے لگی۔

"لیکن کیا؟"

"لیکن اب نہیں مانتے"

"کیا نہیں مانتے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ چاہتے ہیں کہ بچوں کو الگ رکھا جائے۔ البتہ اخراجات دیدیا کرینگے۔ مشکل سے دن رات میں ایک بار دیکھنے کی اجازت دیتے ہیں ..... اُف میری عقل پر کیا پردا پڑ گیا"

یہ کہہ کر وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے کہا۔

"زہرہ! جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ تم بچوں کی فکر مت کرو۔ عباس کے بچے میرے دم کے ساتھ رہینگے۔ ہاں تم اپنی فکر ضرور کرو"

پیشتر اس کے کہ وہ کچھ جواب دے سکے۔ ملازمہ نے آکر اطلاع دی کہ شیخ صاحب باہر کھڑے جلدی آنے کو کہہ رہے ہیں۔ زہرہ نے میری طرف بڑی حسرت اور ندامت بھری آنکھوں سے دیکھا۔

میں نے کہا۔

"میں اب بھی ہر ممکن خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ رہے بچے۔ تو وہ میں پہلے ہی کہہ چکا کہ جیتے جی تو انہیں اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دوں گا"

اب باہر سے آواز آئی۔

"چلو۔ اب آؤ باہر"

یہ سنکر مجھے غصہ تو آیا۔ لیکن میں نے زہرہ کی خاطر تحمل سے کام لیا اور کہا

"اچھا اس وقت تو تم جاؤ۔ میں پھر ملنے کی کوئی راہ نکالوں گا"

اس واقعہ کو ابھی پورے سات روز بھی نہیں گذرے تھے کہ میں شام کے وقت عباس کے بچوں کے پاس بیٹھا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا۔ اور میاں عباس میرے سامنے کھڑے تھے۔ وہ آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ اور پھر دونوں بچوں کو اٹھاکر دیوانوں کی طرح چومنے لگا۔ اور ساتھ ہی آواز دی

"زہرہ! کیا اب چھپی ہی رہوگی"

لیکن کچھ جواب نہ ملا۔ تو میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

"صبر کیجئے! ابھی آجاتی ہے۔ محلے میں ایک سہیلی کو ملنے گئی ہے"

یہ الفاظ کچھ اس طرح میری زبان سے نکلے کہ عباس نے میری طرف ایک خاص انداز سے دیکھا۔ آخر میں نے اصل حالات سے اسے اسوقت آگاہ کر دیا۔ یہ سنکر اس نے سر جھکالیا۔ لیکن صد آفریں ہے اس کی شرافت اور حمیت پر کہ

اس کے منہ سے ایک لفظ بھی ناشائستہ نہ نکلا۔ بس کہا تو اتنا کہا۔

"ہاں میرا تو پہلے ہی یہی خیال تھا کہ تم لوگ تو مجھے رو پیٹ چکے ہوگے۔ کیا اچھا ہوتا کہ اس زندگی کا وہیں خاتمہ ہو جاتا"

کچھ دیر بعد میں نے جب استفساریہ پوچھا کہ کہاں رہے تو اس نے صرف اسقدر کہا۔

کبھی فرصت میں سن لینا بڑی ہے داستاں میری

آج عباس کو وطن لوٹے کوئی گیارھواں دن تھا۔ میں اس خیال میں تھا کہ چائے پی کر اس کے ہاں جاؤں گا۔ کہ اتنے میں زہرہ آگئی۔

کچھ دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ آخر میں نے پوچھا۔

"فرمایئے! اس وقت کیسے آنا ہوا؟"

وہ بولی

میں عباس کے پاس سے آرہی ہوں"

"عباس کے پاس سے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ ناہید کو گود میں لئے بیٹھے تھے۔ عباس اصغر مولوی جی سے پیچھے کی منزل میں پڑھ رہا تھا۔ مجھے ان کے آنے کا علم ناہید کی اتا سے ہوا تھا۔۔۔ شیخ آج کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور برقعہ اوڑھ کر آنکے" (عباس کے) گھر گئی (زہرہ کے آنسو نکل آئے) وہ کمرے میں بیٹھے تھے۔ میں سامنے جاکر کھڑی ہوگئی۔ ناہید امی جان کہہ کر جو ان کی گود سے اٹھنے لگی تو انہوں نے بچی کو روک لیا۔ (بارش کے قطروں کی طرح زہرہ کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے) اور کہا۔ "بیٹا! تمہاری امی مر گئی"۔۔۔۔ کاش میں مر بھی جاتی۔۔۔۔ بس اللہ ہی جانے جو چرکا ان الفاظ سے میرے دل پر لگا۔ میں نے منت سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ عباس! میں خدا کی اور آپ کی گنہ گار ہوں۔ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ان بچوں کے سر صدقے مجھے بخش دو۔ بخدا مجھے آپ سے کچھ شکایت نہیں"

وہ رو کھے پن سے بولے۔

تمہیں ان بچوں کا واسطہ دیتے شرم تو نہیں آتی۔ اتنے ہی پیارے تھے تو انہیں چھوڑا کیا"

"حالات نے مجھے مجبور کر دیا" میں نے روتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کی گنہ گار ہوں" (اور وہ اس وقت بھی رو رہی تھی)

"سچ کہتی ہو" وہ ناہید سے پیار کرتے ہوئے بولے۔

میں بھی مجبور ہوں"

میں نے پھر ہاتھ جوڑ کر کہا۔

عباس! میں تم کو اس محبت کا واسطہ دلاتی ہوں۔ جو کبھی تم کو مجھ سے۔۔۔۔۔ میں اور کچھ نہیں چاہتی۔ صرف بچوں کو گاہے دیکھنے کی اجازت چاہتی ہوں"

وہ بولے

"جس طرح تم نے بچوں کو باپ کی طرف سے یتیم سمجھ کر انہیں چھوڑ دیا۔ اب میں اور یہ دونوں یوں سمجھا کریں گے کہ ان کی ماں مر گئی"

پھر وہ غصے سے بولے۔

"غضب خدا کا! تمہارا دل ایسا پتھر ہو گیا۔ کہ تم نے اپنے نہیں میرے جگر گوشوں کو یوں چھوڑ دیا۔ مانا میں چھ سال تک گمنام رہا۔ لیکن وہ بھی تو ہیں جو شوہر کی یاد میں۔ بچوں کی خاطر زندگی کاٹ ڈالتی ہیں"

میں ان باتوں کا جواب کیا دیتی۔ مجھے روتے دیکھ کر میری ناہید بھی رونے لگی۔ انہوں نے اسے سینے سے لگا لیا اور مجھ سے بولے۔

"بیوی خدا کے لئے میری بچی کو یوں ہلاک مت کرو۔ اب تو اس پر رحم کرو"

میں آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"ہاں سچ کہتے ہو۔ لو اب نہ روؤنگی۔ لیکن اسے ذرا میرے

پاس تو آنے دو - دیکھو میں ہاتھ جوڑتی ہوں - پاؤں پڑتی ہوں"

خدا نے ان کے دل میں رحم ڈالا - اور انہوں نے ناہید کو گود سے اتارا - وہ جھٹ مجھ سے آکر لپٹ گئی - میں نے بچی کی بلائیں لیتے ہوئے کہا -

"عباس ! میں گنہ گار ہوں - خدا کے لئے معاف کردو" پھر میں نے کہا "ہائے تمہیں کیا ہو گیا ؟ "

وہ بولے -

"وہی جو تمہاری محبت کو ہوا -" اور پھر - زہرہ ! افسوس تم نے بچوں پر بھی رحم نہ کیا انہیں پروان تو چڑھنے دیا ہوتا"

ناہید میری گود میں آتے ہی سو گئی - گو انہوں نے تو نہیں کہا لیکن میں خود ہی ان کے سامنے دہلیز کے پاس بیٹھ گئی - انہوں نے انا کو آواز دی - وہ آئی تو اس سے کہا کہ ناہید کو پلنگڑی پر ڈال دو - میری کیا مجال تھی جو میں اف کرتی - جب انا چلی گئی تو میں نے کہا -

"سنو! میں لونڈی بنکر رہوں گی - مجھے بچوں کی خدمت کیلئے رکھ لو - جو سزا چاہو دے لو -"

لیکن وہ بالکل خاموش رہے -

آخر میں نے مایوس ہو کر پوچھا -

"اب میرے لئے کیا حکم ہے ؟ "

وہ بولے -

" اپنے گھر جاؤ - اور آئندہ میرے بچوں سے ملنے کی کبھی کوشش نہ کرنا"

یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے

زہرہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی - اور پھر بولی -

اب میں آپکے پاس ایک آخری آرزو لے کر آئی ہوں -

"فرمائیے "۔

عباس کو میرے فعل سے جو صدمہ ہوا ہے - اسکی تلافی در اصل ناممکن ہے - اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ شیخ بڑا ضدی آدمی ہے ..... میں تو اس گھڑی کو روتی ہوں - لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ مجھے کیا فریب کیا گیا - .... - کاش میں گھر سے قدم نہ نکالتی - .... - بہرکیف دونوں جانب سے مایوسی ہے - تو بس میری آخری آرزو تو یہ ہے کہ میرے مرجانے کے بعد آپ میرے دونوں بچوں کو میری قبر پر ضرور لائیے اور ان کے معصوم ہاتھوں سے میری تربت پر پھول ڈلوائیے ..... خدا آپ کو اسکا اجر دے گا -"

یہ کہہ کر زہرہ کچھ اس طرح رونے لگی کہ میرے آنسو بھی نکل آئے - میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ گھبراؤ نہیں - اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے - میں صفائی کی کوئی ترکیب سوچوں گا - اور انشاء اللہ عباس کو راہ پر لے آؤں گا - رہا شیخ تو کچھ فکر نہ کرو - اس سے بھی نپٹ لیں گے - گھبراؤ نہیں - بچے تم سے ضرور ملتے رہیں گے -

"خیر اب جو اللہ کی مرضی "

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی اور برقعہ سنبھالتی ہوئی کمرے سے نکل گئی -

---

اسوقت غالباً آٹھ کا وقت ہوگا - آسمان کی گود ستاروں سے بھری ہوئی تھی - اور بازاروں میں بھی خوب چہل پہل تھی - زہرہ کے جانے کے کچھ دیر بعد میں بھی گھر سے نکلا - لیکن اب چوک تک ہی گیا تھا کہ کسی کو یہ کہتے سنا

"جانے بگلی تھی یا مظلوم"

ساتھ ہی کسی اور کی آواز آئی -

"معلوم تو شریف عورت ہوتی ہے - ابھی جوان ہی ہے"

یہ سنتے ہی میرے بدن میں ایک نامعلوم خوف کی لہر دوڑ گئی - چند قدم آگے گیا تو ایک طرف لوگوں کی بھیڑ تھی - سب اچک اچک کر کچھ دیکھ رہے تھے - میں بھی ادھر ادھر دیکھتا ہوا آگے بڑھا -

الٰہی توبہ .... میرے سامنے زہرہ کی لاش پڑی تھی - بدنصیب نے کنوئیں میں گر کر خودکشی کرلی تھی -

---

مرنے والی کی آخری آرزو اسکی وصیت کے مطابق پہلے میں نے خود پوری کی م

مقالاتِ شامی

از جناب صاحبزادہ محمد معراج الدین صاحب شامی

میں جب سے پنجۂ صیاد میں اسیر ہوا　　نہ چہچہے ہیں نہ وہ جوشش نہ زمزمہ خوانی
لگی ہے آگ مرے گھر کو میری ہی آگے　　یہ بیکسی، یہ تباہی، یہ خانہ ویرانی
نصیب پھر نہ ہوا دیکھنا نشیمن کا　　اُٹھا چمن سے غرض مرا دانہ اور پانی
پروں کو کاٹ کے معذور کر دیا مجھ کو　　دکھائی اُسنے یہ تیغِ ستم کی بُرّانی
قفس میں بند کیا۔ پھر قفس وہاں رکھا　　جہاں نصیب چمن کی نہیں ہوا آنی
کروں ہزار خوشامد۔ وہ خوش نہیں ہوتا　　یہ اُسکی سنگدلی، یہ مری پریشانی
مری زبان جدا، اور الگ مزاج اُسکا　　نہ وہ سُنے۔ نہ مجھے آئے بات سمجھانی
گذر گئی ہے مری زندگی اسیری میں　　کہوں تو کس سے کہوں اضطرابِ روحانی
جفائیں سہتا ہوں میں اور شاد رہتا ہوں　　جو بات کرتا ہے ظالم سو اپنی من مانی!
نوائے غم ہے مری، میں ہوں۔ اور عجز مرا　　سمجھ رہا ہوں یہی ہے اصولِ زندانی!
سُنے گا کون کہ بے لطف ہے مرا قصہ　　میں کیا سناؤں مری داستاں ہے طولانی
سرودِ عیش سے دن رات ہے سرور انداز　　تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ میدانی

"طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ برپا را"

عربی زبان کا اثر یورپ کی زبانوں پر

از مولانا صدیق طبیب معاون و مدیر زمیندار

اب سے تیرہ سو سال پہلے جبکہ تمام اگلے تمدنوں کا چراغ گل ہو رہا تھا اور وحشت وجہالت کی تاریکی معمورۂ حیات کو ایک ظلمت کدہ میں تبدیل کر رہی تھی، ناگاہ وادی غیر ذی زرع میں خورشید اسلام طلوع ہوا اور اس کی معرفت خیز تنویر میں عرب کے گم کردہ راہ وحشی بدوؤں نے نہ صرف دین بلکہ دنیا، مافیہا سب کچھ پالیا۔ وہ جنہیں اسوقت کے علمبرداران تمدن "صحرا کے کتے" کے لقب سے یاد کرتے تھے، چندہی دن میں اسقدر مہذب اور متمدن ہوگئے کہ چین سے طنجہ تک ان سے اخلاق و تہذیب کی بھیک مانگی جانے لگی۔ اور ان کے تمدن کی درخشانی نے سابقہ تمام تمدنوں کے نقوش کو کالعدم کردیا۔

اب نہ وہ عرب رہے اور نہ ان کا تمدن رہا لیکن ان کی اور ان کے تمدن کی یادگاریں دستبرد حوادث کے علی الرغم ہنوز کرۂ ارضی کے دور دست گوشوں میں بھی موجود ہیں۔ اور یہ حقیقت روز بروز واضح تر ہوتی جارہی ہے کہ دنیا کے موجودہ تمدن کی بنیا دانہی بدوؤں کے تمدن کے کھنڈروں پر قائم ہے اور اس کا کوئی نظری یا عملی شعبہ ایسا نہیں جس کی بسم اللہ عربوں نے نہ کی ہو۔ لیکن یہ ایک مستقل بحث ہے اور ہم یہاں چند مثالیں پیش کرکے صرف اس موضوع پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں کہ عرب جہاں گئے وہاں کی زبان بھی انکی زبان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اور مشرق و مغرب کے بعد کے باوجود یورپین زبانوں میں بھی نہ صرف یہ کہ عربی کے الفاظ داخل ہوگئے بلکہ اسکے گرامر اس کے تلفظ اور اس کے لہجہ تک کا تتبع کیا جانے لگا۔ یورپ کے جن خطوں تک عرب پہنچ سکے ان میں عربی لہجہ اور بدوی مخرج کے مطابق اصلاح شدہ الفاظ اور حروف آج بھی موجود ہیں اور اطراف یورپ کی سیاحت کرنے والے اہل علم کے کان ان سے آشنا ہیں۔

یورپ میں عربوں کے پہنچنے سے پہلے لاطینی اور وہاں کی دوسری زبانیں حروف تعریف سے بالکل خالی تھیں۔ اور جن علاقوں میں وہ نہیں پہنچ سکے اور جہاں کی زبانوں سے ان کو واسطہ نہیں پڑا ان میں اب بھی حروف تعریف کا وجود نہیں ہے۔ لیکن لاطینی بولنے والی اقوام سے جب عربوں کا واسطہ پڑا تو انہوں نے عربی کے حروف تعریف کو اپنا لیا اور کسی لفظ کو معرفہ بنانے کے لئے حروف شمسی و قمری[1] میں امتیاز کئے بغیر عربی کو اداۃ تعریف استعمال کرنے لگے۔ اس کی بیسیوں مثالیں لاطینی سے نکلی ہوئی زبانوں میں اب بھی موجود ہیں مثلاً پرتگالی میں بندرگاہ کو "Oporto" اور روئی کو "Opain" کہتے ہیں ان میں حرف "O" ہمزہ (الف) کا قائم مقام ہے اور لام اسیطرح حذف کردیا گیا ہے جس طرح عربی کے لفظ "شمس" کے ساتھ ضم ہوکر تلفظ سے ساقط ہوجاتا ہے۔ انہی الفاظ کو اسپینولی میں "Elhain" اور "Elhorto" کہتے ہیں یعنی یہاں عربی کا الف لام علیٰ حالہٖ قائم ہے صرف الف کے فتحہ کو کسرہ کے قریب کردیا

[1] حروف شمسی عربی کے ان حروف کو کہتے ہیں جنکے ساتھ اداۃ تعریف الف لام ضم ہوتا ہے تو تلفظ میں اسیطرح لام ساقط ہوجاتا ہے جس طرح "الشمس" میں اور قمری ان حروف کو کہتے ہیں جن کے ساتھ ضم ہوکر لام ساقط نہیں ہوتا جیسے "القمر" میں۔

گیا ہے۔ فرانسیسی میں کسی لفظ کو معرفہ بنانے کے لئے اس کے شروع میں "Le" لاتے ہیں اور اطالوی میں "Il" بولتے ہیں اور یہ سب عربی کے اداۃ تعریف الف لام کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں

عرب جب اسپین میں داخل ہوئے اور جنوبی فرانس اور جنوبی اٹلی پر فتح پائی تو وہاں کے باشندوں سے سنا کہ وہ پانی کو "Aqua" کہتے ہیں۔ انہوں نے "Q" کا قائم مقام قاف کو قرار دیا اور "اقوا" "آقوا" ہوگیا پھر اکثر بدوی عربوں کے تلفظ نے "قاف" کو اب بھی گاف بولتے ہیں اسے "اگوا" بنا دیا۔ اور آج بھی پرتگال میں پانی کو "Agua" ہی کہتے ہیں۔ جس طرح اکثر عامی عرب "قاف" کو "گاف" بولتے ہیں اسی طرح مصر کے عرب "قاف" کو "آف" کہتے ہیں اہل فرانس کا چونکہ مصری عربوں سے زیادہ تعلق رہا اس لئے وہ بھی "Q" کا تلفظ انہی جیسا کرنے لگے۔ لاطینی کے لفظ کا آخری حرف اگر متحرک ہو تو فرانسیسی میں منتقل ہو کر وہ حرف ساکن ہو جاتا ہے اس قاعدہ کی بنا پر "اقوا" (Aqua) فرانسیسی میں "اقو" (Aque) اور قاف کے تلفظ پر مصری عربوں کے اثر کے باعث "آؤ" رہ گیا۔ اس کے بعد دو ہمزہ کے اجتماع نے دعوت اختصار دی اور لاتینی کا "aqua" عربوں کی زبان اور ان کے لہجہ سے متاثر ہو کر فرانسیسی میں صرف "او" (eau) رہ گیا۔ اور اب تک فرانسیسی میں پانی کو اسی "او" سے تعبیر کرتے ہیں۔

مصر اور شام کے بدوی عرب "کاف" کو صاف ادا نہیں کرتے مثلاً حکومت کو "حچومت" کہتے ہیں "ذت" اور "حق" کا درمیانی تلفظ جس کی قریب ترین تعبیر ہم "چ" سے کر سکتے ہیں) لاطینی اور جدید اطالوی زبان میں بھی کسی لفظ میں اگر کاف کے بعد حرف متحرک ہو تو کاف کا تلفظ انہی بدوی عربوں کی طرح کرتے ہیں مثلاً مشہور رومن قانون دان "سیسرن" (Ciceron) کو "چیچرن" کہتے ہیں۔ لیکن جرمن اسے لاتینی کے صحیح تلفظ کے مطابق "کیکرو" (Kekero) بولتے ہیں۔

شاہ تاتار نے بیزنطی فرمانروا شہنشاہ قسطنطنیہ کے پاس اس کی لڑکی سے اپنے رشتہ کا پیغام جن سفرا کے ذریعہ بھیجا تھا ان میں مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ بھی شامل تھا وہ اپنے سفرنامہ میں اس واقعہ کے ذکر کے دوران میں لکھتا ہے کہ ہم قسطنطنیہ پہنچے تو وہاں کے باشندے بازاروں میں "سارکینو" کہہ کر میری طرف اشارہ کرتے تھے۔ مغربی یورپ کی اقوام بھی عربوں کے لقب کے طور پر یہ بیزنطی لفظ استعمال کرنے لگیں۔ لیکن مذکورہ فوق تصریح کے مطابق اہل اطالیہ نے کاف کا تلفظ "چ" سے کیا اور "سارکینو" اطالوی میں "سارا چینی" (Sarraceni) بنگیا۔ فرانس والوں نے اس میں کچھ اور ترمیم کی اور شاہ لوئی اور صلیبی جنگوں کے زمانہ میں عرب فرانس میں "سارازین" (Sarrasin) کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ فرانسیسی سے یہ لفظ انگریزی میں آیا اور انگریز عربوں کو "سارانیسنز" (Sarrasino) کہنے لگے۔

بیزنطیوں نے ابن بطوطہ کی طرف جن الفاظ سے اشارہ کیا تھا اس کے معنی کچھ اچھے نہیں ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ دشمن سے کسی اچھے خطاب کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ "سارکینو" کا پہلا جزو خالص عربی ہے اور دوسرا یونانی۔ "سارا" "صحرا" کا بگڑا ہوا تلفظ ہے اور "کینو" کے معنی کتے کے ہیں جسے قدیم یونانی میں "کینوس" (Kynos) کہتے تھے

جدید یورپین زبانوں میں بھی ایسے سیکڑوں الفاظ رائج ہیں جو یا تو عربی ہیں یا ان کا کوئی جزو عربی ہے مثلاً لفظ "فارمیسی" (Pharmacy) جو عطار خانہ کے معنی میں متداول ہے۔ اس کا پہلا جزو عربی لفظ "بہار" کی تحریف ہے جسکے معنی عطر اور خوشبودار معجون کے ہیں اور دوسرا جزو یونانی لفظ "ماکیون" (Makeon) کا مخفف ہے۔ فرانسیسی میں شراب خانہ کو "کوسے" (Corne) کہتے ہیں اور یہ دراصل عربی کا لفظ "قبو" ہے جو عربی میں بھی تقریباً اسی معنی میں مستعمل ہے۔ اسی طرح عربی کا لفظ "مسکین" (Mesquin) اپنے مشہور معنی کے ساتھ فرانسیسی میں داخل ہوگیا ہے۔

غرضیکہ یورپ کی اکثر زبانوں میں ایسے سیکڑوں الفاظ موجود ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عربوں کے تمدن اور کلچر میں کسقدر جاذبیت تھی اور وہ جہاں گئے تمدن کے مرتب کی طرح وہاں کا لٹریچر ان کے لٹریچر سے کس حد تک متاثر ہوا۔

رُباعیات!

از سحر طراز مولوی سید ابو محمد ثاقب کانپور

میخانے میں آ توبہ سے بیزار بھی ہو
عقبیٰ سے نہ ڈر ہوش میں آ اے ثاقب
رحمت کی طلب ہے تو گنہگار بھی ہو
کوثر پہ وہی پیئے جو میخوار بھی ہو

نشے میں کسے راز خدا ہو معلوم
دریا میں کیا ہے کس نے موجوں کا شمار
پردہ بنے بیخودی تو کیا ہو معلوم
کیوں کر قدرت کی انتہا ہو معلوم

صیاد کے بس میں نہ رہا طائرِ روح
تڑپا جو کبھی ٹوٹ گیا رشتۂ دام
تھا محوِ چمن راز بقا طائرِ روح
اِک نالہ کیا اور اُڑا طائرِ روح

محفل میں نہ ہو شمع سے پروانے کی بحث
ہاں جلوۂ یار آیا دلِ ویراں میں
مستوں میں نہ ہو ساغر و پیمانہ کی بحث
ہو ختم ابھی کعبہ و بتخانے کی بحث

پریمی لیڈر

(افسانہ)

از جناب مولانا شاکر صاحب ناطقی کانپوری

کنور پور کے زمیندار پنڈت کیلاش ناتھ کیننگ کالج کے تعلیم یافتہ نوجوان تھے جو کہ اپنے والد پنڈت رام ناتھ کے انتقال کے بعد حقیقی معنی میں اپنے باپ کے جانشین تھے۔ رعایا کی خوشحالی اور وقت پر لگان کا بلا کد و کاوش وصول ہو جانا اُن کی انتظامی قابلیت کی دلیل تھی پنڈت جی باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے اپنے بزرگوں کی وضع کے سختی سے پابند تھے۔ ان کا سینہ انصاف و رحم کا خزانہ تھا ان کا دل پریم بھاؤ کا اتھاہ سمندر تھا جس میں ضرورت کے وقت لہریں اٹھا کرتی تھیں وہ کسی غریب کو دُکھ میں مُبتلا نہ دیکھ سکتے تھے اُن کا معمول تھا کہ گاؤں کے کاشتکاروں کے جھونپڑوں میں جا کر گھنٹوں بیٹھا کرتے اور ان کا دکھ درد سنا کرتے۔ اُن لوگوں کی بیماری میں پنڈت کیلاش ناتھ ڈاکٹر بھی تھے اور تیمار دار بھی۔

سیکڑوں روپیہ کی ہومیو پیتھک دوائیں۔ کونین۔ اور پھوڑا پھنسی کے مرہم وغیرہ ہر سال ان غریبوں کو مفت تقسیم کرتے تھے ان کے مواضعات کے غریب کسان خواہ وہ چمار ہوں یا ٹھاکر پاسی ہوں یا برہمن سب اُن کے رشتہ دار تھے بوڑھے اگر ان کے نانا دادا تھے تو ادھیڑ ان کے چاچا تایا حقیقت یہ ہے کہ پنڈت کیلاش ناتھ اپنے علاقہ میں دیوتا سروپ سمجھے جاتے تھے۔ پنڈت جی کا برتاؤ اور طرز عمل ہی ایسا تھا کہ ان کو غریب کسان انسانی ہستی سے کچھ زیادہ سمجھیں۔

(۲)

دسہرہ کی صبح بھرت ملاپ کا مبارک دن پنڈت کیلاش اپنے دروازہ پر چوپال میں بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ آٹھ دس آدمی پاس بیٹھے ہیں کچھ اسامی ہیں جو لگان ادا کرنے آئی ہیں کچھ غریب کاشتکار دوا کے لئے آئے ہیں۔ پنڈت جی ہر ایک سے نہایت اخلاق کے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں۔ کہ ایک بوڑھا کسان گاڑھے کی مرزائی پہنے ہوئے لکڑی ٹیکتا آیا اور پہنا چرن چھوتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔ اب پنڈت جی نے اُس کو دیکھا اور کہا آہا گھنشیام دادا تم ہو کہو کیسے آنا ہوا۔ میں تو خود کل تمہارے گاؤں آنیوالا تھا تم نے ناحق تکلیف اُٹھائی۔ بجو (ملازم) جاؤ گھنشیام دادا کے لئے ایک مونڈھا لاکر رکھ دو بیچارے ضعیف آدمی دو کوس چلکر آئے ہیں تھک گئے ہونگے۔

گھنشیام۔ نہیں سرکار نئی ریت نہ نکالئے بھلا ایک چمار براہمن دیوتا کے سامنے مونڈھے پر بیٹھ سکتا ہے۔

پنڈت جی۔ گھنشیام دادا یہ ذات پات کے بکھیڑے مجھے بالکل ناپسند ہیں آخر وہ کونسی چیز ہے جس کو پرمیشر نے صرف براہمن کو دی ہے اور چمار اُس سے محروم ہے۔ دھتکار ہے ایسے علم اور عزت پر جو بڑوں کی عزت نہ کر سکے۔ بیٹھو گھنشیام دادا اگر تم مونڈھے پر نہ بیٹھوگے تو مجھے بھی زمین پر بیٹھنا پڑے گا

میں بھی تو ایسے براہمن کی اولاد ہوں کہ جو تمہارے لئے جب تک چارپائی نہ بچھوا دیتے خود نہ بیٹھتے تھے۔

آخر بعد ردوکد کے گھنشیام چودہری مونڈھے پر بیٹھنے کے

ارادے سے اُٹھے لیکن ان کا دل جذبات تشکر سے لبریز تھا کانپتے ہوئے ہونٹوں سے دعا بن رہی ہے بہتا کیا آنسو دعا بن رہا ہے۔ اچھوں کے اچھے ہی ہوتے ہیں کہتے ہوئے پنڈت جی کے قدم چھوئے اور مونڈھے پر بیٹھ گئے۔

پنڈت جی۔ کہو گھنشیام دادا کیسے آئے۔

گھنشیام۔ بھیا تمہاری دوا اور تمہارے چرنوں کی برکت نے منوہر کی ماں کو موت کے چنگل سے چھڑا لیا۔ اب وہ بھگوان کی کرپا سے بالکل تندرست ہے۔ سب بچوں کی رائے ہے کہ اس شبھ اوسر پر ست نارائن کی کتھا ہو جائے اور اس کام کے لئے شکروار کا دن اور پورنماشی کی سہانی رات مقرر کی گئی ہے۔ سرکاریوں کو برادری کے چار گاؤں کے لوگ جمع ہوں گے۔ لیکن منوہر کی ماں کی آشا ہے کہ بھیا کے چرن اگر ہمارے دوارے آ جائیں گے تو برادری میں ہمارا سر اونچا ہو جائے گا۔ ویسے تو آپ کی دیا سے ہم لوگ ہمیشہ گن گاتے ہیں لیکن اس برادری کے جماؤ میں ہمارے دروازہ پر آ جانا ہماری عزت کو آکاش پہنچا دے گا۔

پنڈت جی۔ اچھا اچھا گھنشیام دادا ہم ضرور آئیں گے۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ اس کا انتظام کر دیا جائے۔ دری قالین روشنی کے لیمپ وغیرہ جس چیز کی ضرورت ہو سب موجود ہیں لے جاؤ۔

گھنشیام۔ بھیا دری قالین کی تو ہمیں ضرورت نہیں۔ کیونکہ جنم سے ہم لوگ ٹاٹ پر بیٹھتے آئے ہیں وہ آپ کی دیا سے گھر میں موجود ہیں۔ کچھ مانگے آ جائے گا ہاں دو لیمپ اگر سرکار دیدیں تو روشنی کا اچھا انتظام ہو جائے گا۔

پنڈت جی۔ گھنشیام دادا۔ جنم کے رواج کا خیال نہ کرو اور دری قالین ضرور لے کر بچھاؤ۔ میں سب سامان ایک روز قبل بھیجدوں گا اور میں بھی کتھا کے روز ضرور آؤں گا گھنشیام چودھری پالاگن کرکے واپس چلے گئے۔

(۳)

پورن ماشی کا چندرماں منوہر پور پر نور کی بارش کر رہا ہے۔ چودھری گھنشیام کے دروازہ پر ہزاروں آدمیوں کا ہجوم ہے ایک طرف کتھا کا انتظام ہے دوسری طرف پکوان اور مٹھائی طیار ہو رہی ہے کتھا بانچنے کے لئے منوہر پور کے بڑے ودیاوان پنڈت چرنجی لال کیلوں کے پتوں کے درمیان بچھی ہوئی چوکی پر گلے میں موٹا سا گجرا پہنے براجمان ہیں۔ اب پنڈت کیلاش ناتھ کا انتظار ہو رہا ہے کہ مہاراج آ جاویں تو کتھا شروع ہو کہ ایک طرف سے گھوڑوں کی ٹاپوں کے ساتھ صدا سنائی دی سرکار آ گئے۔

پنڈت کیلاش ناتھ چماروں کے مجمع کے پاس گھوڑے سے اُترے۔ ہزاروں آدمی پالاگن مہاراج کہہ کر پنڈت جی کے قدموں پر جھک پڑے۔ پنڈت جی اس سمندر کے مدوجزر میں پھنس گئے اگرچہ ان کو اس ہجوم سے کسی قدر تکلیف ہوئی۔ لیکن ان غریبوں کی نیچرل طرز معاشرت اور سادہ لوحی نے ان کے دل کو پریم سے بھر دیا۔ اب چودھری گھنشیام کی باری تھی گھنشیام کی ضعیفہ بیوی اس کے لڑکے ناتی پوتے وغیرہ کے ایک غول نے پنڈت جی کو گھیر لیا۔ سب سے پہلے گھنشیام نے پالاگن کرکے کہا کہ پرمیشور نے بھیا کو جو دولت اور عزت دی ہے اس میں ایک رائی بھر کمی نہیں ہوئی۔ لیکن اس پوتر چرنوں کی بدولت ہمارا سر جتنا اونچا ہو گیا ہے اسے ہمارا دل جانتا ہے۔ آخر میں گھنشیام کی بیوی ایک تھالی لے کر آگے بڑھی گلے میں پھولوں کا ہار پہنایا اور چراغ سے آرتی اتار کر پاؤں دھونے بیٹھ گئی۔ پنڈت جی ہزار منع کرتے ہیں کہ دادی یہ تم کیا کر رہی ہو کیوں مجھے گنہگار کرتی ہو میں تو تمہارے منوہر سے بھی چھوٹا ہوں مجھے تمہاری خدمت کرنا چاہئے لیکن بڑھیا کے جذبات پنڈت جی کیا جانیں۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پنڈت جی کے قدم پکڑ لئے اور تھالی میں رکھ کر ایک لوٹیا پانی سے اس کو دھویا۔ پھر اس پانی کو اسی لوٹیا میں انڈیل کر اپنی بہو کو یہ کہہ کر دیا کہ بہو لے جاؤ اس کو یہ سچا چرن امرت ہے تم بہو بچوں کو پلاؤ اور آج یہی چرن امرت برادری میں بھی تقسیم ہوگا۔

اس کے بعد پنڈت جی آگے بڑھے۔ کتھا کی چوکی کے

پاس پنڈت جی کے لئے ایک کرسی لاکر رکھ دی گئی تھی گھنشیام نے اصرار کیا کہ بھیا اس پر براجمان ہوں۔ لیکن پنڈت جی نے کرسی اُٹھوادی اور سب لوگوں کے ساتھ فرش پر بیٹھ گئے۔

چربجو مہاراج پنڈت جی کی اس حرکت پر ششدر رہ گئے اور اپنے دیوتانہ انداز میں کہنے لگے۔ مہاراج یہ آپ کہاں نشٹ اچھوتوں میں بیٹھ گئے آپ تو بڑے دیادان پُرش کے فرزند اور خود عالم فاضل ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ان اچھوتوں کی جسم کی ہوا لگنے سے ایک برہمن چنڈال ہو جاتا ہے۔ نہ کہ اُن کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا

پنڈت جی کو مدت العمر میں پہلی مرتبہ غصہ آیا اور وہ ترش رو ہوکر بولے کہ پنڈت جی مہاراج آپ کتھا بانچئے اور اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھئے یہ معاملات دل سے تعلق رکھتے ہیں آپ کے تنگ دل اور بیکار دماغ میں ان باتوں کی گنجائش نہیں ہے۔ چربجو مہاراج نے پنڈت جی کے تیور دیکھے تو لرز گئے۔ اور جو شری سرکار کی کہہ کر کتھا شروع کر دی حسب معمول کتھا اپنے وقت پر ختم ہوگئی۔ اب پرشاد کی مٹھائی تقسیم ہونے لگی تو پنڈت جی کھڑے ہوگئے۔ اور گھنشیام سے رخصت چاہی گھنشیام نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ سرکار مٹھائی حلوائی نے بنائی ہے ابھی ہم لوگوں نے ہاتھ نہیں لگایا۔ چربجو مہاراج مٹھائی لاتے ہیں۔ اگر کوئی ہرج نہ ہو تو بھیا اس کو پرشاد سمجھکر قبول کریں۔

پنڈت جی۔ کوئی ہرج نہیں گھنشیام دادا لاؤ تم اپنے ہاتھ سے مٹھائی کی تھالی لے آؤ۔ چربجو مہاراج ابھی چوکی سے اٹھے بھی نہ تھے کہ گھنشیام ایک تھالی میں تھوڑی مٹھائی لے کر آگیا اور پنڈت جی نے تھالی میں سے ایک گوٹ برفی اُٹھاکر منہ میں رکھ لی۔ اور کہا مہتوں دادا تمہاری خوشی ہوگئی اب میں جاؤں۔ اُدھر چربجو مہاراج نے رام رام کہہ کر منہ پھیرلیا۔ پنڈت کیلاش ناتھ ادھر کنور پور واپس ہوئے اُدھر بجلی کی سرعت کے ساتھ دور دور تک یہ خبر پھیل گئی کہ کنور پور کے زمیندار نے چمار کے ہاتھ سے کتھا کے جلسہ میں مٹھائی کھائی۔

(۴)

پنڈت کیلاش ناتھ کی بیوی پربھاتی بھی مثل اور ہندوستانی عورتوں کے اپنے شوہر سے محبت کرنے والی اور سچی پرستار تھی اسی طرح پنڈت جی بھی اپنی بیوی پر دل وجان سے فدا تھے ایک پریم رس کے دونوں متوالے محبت کی ایک برقی رو تھی جو دونوں دلوں کو یکساں حرارت پہونچاتی تھی پنڈت جی کا خندہ پیشانی کے ساتھ لفظ پربھا کہہ دینا پربھاتی کے دل کے کنول کو شگفتہ کرنے کو کافی تھا۔

پربھاتی لکھنؤ کے بڑے تعلقدار پنڈت اجودھیا ناتھ آنجہانی کی صاحبزادی اور موجودہ تعلقدار پنڈت امرناتھ تواری کی بہن تھی۔ پربھاتی کو خاندانی رواج کے مطابق اردو ہندی اور کسیقدر انگریزی کی بھی تعلیم دلائی گئی تھی وہ بہت سمجھدار اور بہ نسبت اور دیہاتی عورتوں کے ضرورت سے زیادہ روشن خیال تھی پربھاتی کی پرورش ایسے خاندان میں ہوئی تھی کہ جہاں اچھوت اور نیچ ذات کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا زبردستی بیگار لینا اور معمولی بات پر ان کو مار پیٹ کر دینا روزمرہ کی بات تھی۔ کاشتکار اگر وقت پر لگان ادا نہ کرے تو اُس کو بندھوا کر پٹوا دینے کے سوا اور کسی تدبیر سے وہ لوگ ناواقف تھے ایسے ماحول میں پرورش پانے کا اتنا اثر پربھاتی میں موجود تھا کہ وہ اپنے شوہر کیلاش ناتھ کے اس طرز عمل کو ناپسند کرتی تھی۔ لیکن پنڈت جی ایسے موقع کو بلطائف الحیل ٹالتے رہتے تھے کتھا کے واقعہ نے پربھاتی کی خودداری کو بری طرح زخمی کیا اور اب وہ اس معاملہ میں اپنے شوہر سے گفتگو کرنے پر آمادہ ہوچکی تھی۔ شب کو جس وقت پنڈت جی مکان پر پہونچے تو چاندنی اپنی چاندنی صحن مکان میں پھیلا چکا تھا۔ پنڈت جی نے دیکھا کہ پربھاتی ایک چھوٹی سی پلنگڑی پر صحن میں لیٹی ہوئی ہے انہوں نے حسب عادت اپنا پریمی الجھہ پربھا کہہ کر چھوڑا لیکن خلاف معمول اس محبت بھرے جملے نے پربھاتی پر کوئی اثر نہ کیا نہ اُس نے ہنستے ہوئے دوڑ کر طفلانہ انداز سے پنڈت جی کے ہاتھ میں اپنے

ہاتھ دے۔ اور عادت کے موافق پربھا کے جواب میں پران ناتھ کا دلیں مدد جزر پیدا کرنے والا لفظ کہا۔ بلکہ پلنگڑی پر اُسی طرح لیٹی رہی آخر پنڈت جی آگے بڑھے اور انہوں نے پربھا کو ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا۔ پربھا۔ تم کیسی ہو کیا باعث ہے کچھ طبیعت ناساز ہے بتاؤ بتاؤ جلدی میری پربھا آخر تم خاموش کیوں ہو پنڈت جی نے بغیر سانس لئے ہوئے یہ سب سوالات کرڈالے لیکن پربھا نے ان تمام سوالوں کا صرف ایک جواب دیا کہ کچھ نہیں یونہی لیٹ رہی تھی اور اسی وقت خادمہ کو آواز دے کر شوہر کو حسب عادت اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا اور نوکرانیوں کو حکم دیا کہ رسوی بند کر دی جائے

کیلاش۔ ہائیں پربھا کیا آج تم کھانا نہ کھاؤ گی

پربھا۔ میں پہلے ہی کھا چکی ہوں

کیلاش۔ پربھا مجھے زیادہ پریشان نہ کرو تم نے کب بغیر میرے کھانا کھایا ہے جو آج کھا لیا۔

پربھا۔ جب مجھے خبر معلوم ہوئی کہ سرکار نے منوہر پور میں چودھری گھنشیام کے یہاں پوری مٹھائی جیم لی تو میں نے بھی یہاں اپنا کھانا کھا لیا۔ پربھاتی کے الفاظ بجلی بنکر کیلاش کے دل پر گرے اور وہ تلملا اُٹھے اسی پلنگڑی پر پربھا کے قریب بیٹھ گئے اور پربھا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگے پربھا پیاری تم کو خبر غلط ملی ہے۔ میں نے گھنشیام کے یہاں کچھ نہیں کھایا اور کتھا ختم ہونے سے قبل ہی اُٹھکر چلا آیا ہوں کیا مجھے معلوم نہیں ہے کہ تم اس میل ملاپ سے ناخوش ہوتی ہو پربھا اٹھو آج میں تمہارے لئے کھانا پروسوں گا۔ پربھا کو کیلاش کی من موہنی باتوں پر ہنسی آگئی۔ اور اُس نے اپنے روزمرہ کے انداز میں کہا۔

پربھاتی۔ معاف کیجئے میں اچھوت کے ہاتھ سے کھانا نہیں کھاؤنگی

کیلاش نے اُسی انداز سے جواب دیا کہ اب تو میں پربھا دیوی کی سیوا میں آگیا ہوں اب اچھوت کہاں رہا۔

(۵)

اس واقعہ کو پندرہ دن گذر گئے۔ پنڈت کیلاش اب بھی گاہے ماہے مواضعات کو جاتے ہیں لیکن پربھاتی کی دلشکنی کے خیال سے ہمیشہ جھوٹ بولتے ہیں کہ آج فلاں مقدمہ کی پیروی کے لئے کچہری گیا تھا اور آج فلاں رئیس کے پارٹی میں مدعو تھا۔ لیکن پربھاتی ان باتوں کو اچھی طرح سمجھتی تھی کہ میں اپنے شوہر پر کس قدر ظلم کر رہی ہوں کتنا رحم دل اور یہی جس نے کبھی بڑے سے بڑے معاملہ میں جھوٹ بولنا گوارا نہ کیا آج صرف میری خوشی کے لئے جھوٹ بولتا ہے۔ اے پرمیشور میں بڑی گنہگار ہوں۔ میں اپنے پتی کے اس دکھ کو نہیں دیکھ سکتی بھگوان تو مجھے اس پاپ سے بچا۔ پربھاتی دوزانو بیٹھی ہوئی اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھائے ہوئے اسی دعا میں مصروف تھی کہ پنڈت جی ہنستے ہوئے اندر آئے ایک لفافہ ان کے ہاتھ میں تھا پکار کر کہا پربھا لو تمہارے بھائی صاحب آرہے ہیں۔ اس خبر سے پربھاتی ذرا بھی خوش نہ ہوئی اور اس نے نہایت پست آواز میں دریافت کیا کہ بھائی امرناتھ کس دن آئیں گے؟ کیلاش نے اس کے جواب میں وہ خط پربھا کے ہاتھ پر رکھ دیا پربھا اس خط کو پڑھ کر سوچ میں پڑ گئی اور جس طرح بیٹھی تھی اسی طرح سکوت میں بیٹھی رہی۔ کیلاش پر اس غیر معمولی حالت کا اثر ہوا اور وہ نہایت سادگی سے کہنے لگے۔

پربھا پیاری کیا بات ہے کہ تم اپنے بھائی کی آمد کی خبر سنکر بجائے خوش ہونے کے افسردہ نظر آتی ہو؟

اب پربھاتی کے لئے ضبط مشکل تھا۔ وہ بیتابانہ انداز سے اُٹھی اور دوڑ کر کیلاش کے قدموں پر گر گئی آنسوؤں کے چند گرم گرم قطرے کیلاش کے قدموں پر گرے اور پربھا نے گلوگیر آواز میں کہنا شروع کیا۔

پربھاتی۔ پران ناتھ چھما کرو میں تمہاری خطاوار ہوں مجھے رنج و غصہ کی حالت میں ایک بہت بڑی خطا ہو گئی ہے۔ میں نے کتھا کے صبح بھائی صاحب کو آپ کی حالت کے متعلق ایک شکایتی خط لکھ دیا تھا۔ میں اسی سوچ میں ہوں کہ بھیا امرناتھ سخت مزاج اور ضدی آدمی ہیں اگر وہ آپ سے کچھ جھگڑا کر بیٹھے تو میرے لئے سوائے مرجانے



مصر اور شام کی سرحد کا نظارہ



ملک معراج دین ڈورا

کے دوسری صورت نہیں ہے۔

کیلاش۔ ہنستے ہوئے اچھو پر بھیا تم کیسی باسمجھو ہو اگر تم نے خط لکھ دیا تو کیا برا کیا اسی حیلہ سے بھیا امرناتھ کے درشن ہو جائیں گے ایسے تو وہ کبھی نہیں آتے ہیں۔ اور یوں بھی وہ ہمارے بڑے ہیں اگر کچھ برا بھلا کہہ لیں گے تو کیا ہماری عزت گھٹ جائے گی۔ آؤ پربھا چلو تمہیں آج ایک فرانسیسی مصنف کا بہت عمدہ افسانہ سنائیں ایسا افسانہ تم نے کبھی نہ سنا ہوگا۔

(۶)

اماوس کا دن دیوالی کا سماں اسٹیشن منوہر پور پر پنڈت کیلاش ناتھ اپنے سالے امرناتھ کے استقبال کے لئے کھڑے ہیں باہر ایک ہاتھی سجا ہوا اور چند عمدہ گھوڑے اور بیل گاڑیاں طیار کھڑی ہیں۔ کیلاش ناتھ کے مواضعات منوہر پور اور دوسری جگہ کے کسان لوگ کثیر تعداد میں اسٹیشن کے باہر جمع ہیں پنڈت جی ہزار ان لوگوں کو سمجھاتے ہیں کہ شام ہو گئی ہے اب تم لوگ اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔ مگر وہ نہیں سرکار ہم بغیر درشن کئے نہ جائینگے کہہ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

وقت مقررہ سے آدھا گھنٹہ دیر کر کے گاڑی اسٹیشن پر پہنچی اور پنڈت امرناتھ تعلقدار تلوکپور کو کیلاش ناتھ نے بڑے تپاک سے اتارا۔ اسٹیشن کے باہر نکلے تو بھیا امرناتھ کی جے کے نعروں نے فضا میں ہلچل ڈال دی۔

آخر دونوں آدمی گھوڑوں پر سوار ہوئے اور ہجوم کے درمیان آہستہ آہستہ منوہر پور کی آبادی کی طرف چلے۔ امرناتھ اپنے دل میں سوچتے جاتے تھے کہ معلوم نہیں یہ ہجوم استقبال کے لئے کہاں سے بلایا گیا ہے اور یہ حسن عقیدت اور جوش محبت انکے اندر کس طرح پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ دلی جذبات میں تصنع نہیں ہوتا۔

چودھری گھنشیام کے دروازہ پر سواری پہونچی تو گھنشیام کو معہ اپنے تمام کنبہ کے کھڑا ہوا پایا۔ گھنشیام نے دوڑ کر رکاب تھامی اور کہا سرکار تھوڑی دیر کے لئے اتر پڑیں۔ آپ کی رعایا بغیر دونوں بھائیوں کے چرن چھوئے جانے نہ دینگے۔ جسقدر کیلاش انکار کرتے تھے مجمع کا اصرار بڑھتا جاتا تھا۔ آخر کار مجبور ہو کر دونوں آدمی گھوڑوں سے اتر کر گھنشیام کے دروازہ پر ایک پلنگ پر بیٹھ گئے۔ گھنشیام کی بیوی نے دونوں آدمیوں کے پیر دھلائے۔ جو مجمع اسٹیشن سے سواری کے ساتھ آیا تھا اس وقت وہ گھنشیام کے دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اب اس میں حرکت ہوئی اور باری باری سے ایک ایک دو دو آدمی اُٹھتے اور کیلاش امرناتھ کے قدم چھوتے اور دونوں کے پاؤں کے قریب ایک ایک دو دو روپیہ رکھ کر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ جاتے۔ اس پالاگن اور نذرانہ کی رسم میں ایک گھنٹہ سے زیادہ صرف ہو گیا۔ پنڈت امرناتھ کے لئے یہ بات بالکل نئی اور حیرت میں ڈالنے والی تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ عورت و مرد کا ایک کثیر مجمع ہے جو اپنے زمیندار کو دیوتا سروپ سمجھتا ہے۔ اور اس پر اپنا جان و مال نثار کرنے کو طیار ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے کیا کیلاش کی سیاست نے ان کو مرعوب کر رکھا ہے؟ لیکن سختی اور دباؤ میں یہ پریم لہر کہاں۔ اب ان کو اپنے علاقہ کا نقشہ نظر میں آگیا اور ان کو اپنے بہنوئی کیلاش کی زندگی پر رشک ہونے لگا۔ انہوں نے مجمع پر اپنے جذبات دل کی آنکھ سے نظر ڈالی اور کیلاش سے کہا کہ بھائی یہ بڑی بھولی مخلوق ہے یہ کس قوم کے لوگ ہیں۔

کیلاش۔ بھیا یہ چمار لودھ اہیر پاسی کئی قوم کے آدمی ہیں جن کو بڑے لوگوں کی اصطلاح میں اچھوت کہا جاتا ہے۔ میرا ایمان اور عقیدہ ہے کہ دنیا میں اگر کچھ سچائی اور محبت باقی ہے تو وہ اسی فرقہ میں ورنہ دنیا میں اونچی قوم کی جو کچھ حالت ہے وہ ظاہر ہے۔

اب پنڈت امرناتھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے مجمع کو مخاطب کر کے کہا کہ بھائیو میں تمہارے اس برتاؤ سے بہت خوش ہوا۔ میری خواہش ہے کہ میں کنور پور میں کل آپ لوگوں کی دعوت کروں۔ مجھے امید ہے کہ یہ سب لوگ میری دعوت کو منظور کرینگے۔

سب کی طرف سے چودھری گھنشیام نے جواب دیا کہ سرکار ہم روز ہی آپ کی دعوت کھاتے ہیں یہ اناج اور جن جناور سب آپ ہی کے دیا سے پل رہے ہیں۔ بھیا کیلاش ہمارے زمیندار ہی نہیں بلکہ مائی باپ بھی ہیں۔ سرکار نے جو ہم لوگوں کو دعوت دی ہے یہ

ہماری عزت بڑھانے کو بہت ہے۔ لیکن ہماری بھی ایک ارداس ہے، بھیا اگر اس کو مان لیں تو جیسے اس جنم میں ہم کو بیکنٹھ مل گیا

کیلاش۔ گھنشیام دادا آخر تمہارا مطلب کیا ہے صاف صاف کہو۔

گھنشیام۔ بھیا آپ کی کرپا سے اور کوئی مطلب نہیں بس یہی کہ دونوں بھائی ایک دن ہم غریبوں کی بھی چھوٹی بھوسی قبول کریں۔ یہ موقعہ امرناتھ کے لئے نہایت مشکل تھا وہ اس سوال سے سخت کشمکش میں مبتلا ہو گئے گھنشیام چودھری بوڑھا اور تجربہ کار تھا امرناتھ کے بشرہ سے اس نے دل کا حال پڑھ لیا۔ اور کہا سرکار کچھ چنتا نہ کیجئے۔ ہمارے گاڑھے پسینے کی کمائی کا اناج ہوگا۔ برہمن رسوئی تیار کرے گا۔ اور وہی سرکار کو کھلائے گا بھی۔ کیلاش ناتھ کبھی گھنشیام کی سادگی پر غور کرتے ہیں اور کبھی امرناتھ کی صورت دیکھتے ہیں اور دل میں کہتے ہیں کہ گھنشیام غریب امرناتھ کو کیلاش سمجھا ہوا ہے وہ ڈرتے تھے کہ امرناتھ کا دلشکن جواب کہیں بوڑھے کسان کا دل نہ توڑ دے۔

آخر امرناتھ بولے کہ اچھا ہم تمہاری دعوت منظور کرتے ہیں اور کل کنور پور میں اس کے لئے وقت مقرر کریں گے "دھن ہو بھیا دھن ہے" گھنشیام نے کہا۔ اور جے جے کے فلک شگاف نعروں میں دونوں بھائی ہاتھی پر سوار ہو کر کنور پور روانہ ہو گئے۔

واقعات پیش آمدہ نے امرناتھ کو ایسا مبہوت بنا دیا تھا کہ وہ راستہ بھر یہی سوچتے رہے کہ اب میں کیلاش سے اس معاملہ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ جبکہ خود اس سحر میں مسحور ہو چکا ہوں اب دیکھنا یہ ہے کہ پربھا رانی کس خیال میں ہیں۔

مکان پر پہونچے تو کیلاش نے امرناتھ کو اپنے خاص بیٹھک میں بٹھایا اور دوڑ کر اندر مکان میں پہونچے نہایت بیتابانہ انداز سے پربھا پربھا کہتے ہوئے بڑھے ہنسی ضبط کرتے ہیں لیکن نہیں رکتی۔ پربھاوتی نے کیلاش کو اس حالت میں دیکھ کر کہا کہ یا تو ہنس لو یا بات کر لو آخر بھیا نے تمہیں کیا دیدیا ہے جو خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے۔ میرا تو یہ حال ہے کہ جب سے تم اسٹیشن گئے ہو بھیا کا خیال کر کے میرا دل دھڑک رہا ہے۔ کیلاش نے کہا نہیں

پربھا پیاری یہ بات نہیں ہے بھیا امرناتھ نے کل سب اچھوتوں کی دعوت کی ہے اور خود بھی اُن کی دعوت منظور کر لی ہے یہ ڈیڑھ گھنٹہ کا واقعہ چودھری گھنشیام کے مکان پر انہیں معاملات میں گذر گیا ہے

پربھا نے روزمرہ کے انداز میں کیلاش کے گلے میں اپنی بانہیں ڈالدیں اور کیلاش نے فرطِ محبت میں پربھا کا بوسہ لے لیا

کیلاش۔ پربھا جلد انتظام کرو بھیا کھانا کھانے آ رہے ہیں یہ حکم دے کر کیلاش باہر آئے۔ اور امرناتھ سے کہا کہ بھیا اندر چلو امرناتھ مکان میں داخل ہوئے پربھا نے دوڑ کر بھائی کا پالاگن کیا سب کی خیریت دریافت کی اور کھانے کے انتظام کے لئے رسوئی میں چلی گئی۔ امرناتھ اور کیلاش کھانا کھا کر بیٹھے تو امرناتھ نے کہا کہ پربھا رانی تمہارے خط نے مجھے بہت تکلیف پہونچائی کس قدر ضروری کام ہرج کر کے یہاں آیا ہوں۔

پربھاوتی۔ بھیا اگر میں ایسا خط نہ لکھتی تو کاہے کو آپ کے قدم یہاں آتے برسوں صورت کو ترس جاتی ہوں۔

معاف کیجئے بھائی میں نے ہنسی میں آپ کو خط لکھ دیا تھا۔ امرناتھ کیلاش ناتھ دونوں ہنستے ہوئے باہر آئے اور لیٹ کر باتیں کرتے کرتے سو گئے۔

(۷)

کنور پور کی آج کی صبح بہترین صبح تھی پنڈت کیلاش کے دروازہ پر خوب چہل پہل ہے شامیانے لگائے گئے۔ پوری مٹھائی تیار ہونے لگی بس پہر سے گاؤں کے لوگوں کی آمد شروع ہو گئی اور شام ہوتے ہوتے سب لوگ جمع ہو گئے۔ اپنے اپنے گاؤں کی مختلف بھجن منڈلیاں بنائیں اور گانا بجانا شروع کر دیا۔ امرناتھ اور کیلاش ان لوگوں کی نیچرل طرز معاشرت اور سادہ زندگی کو دیکھ کر دل میں خوش ہو رہے تھے۔ چراغ جلتے ہی کھانا کھلانا شروع کر دیا گیا بوڑھے گھنشیام چودھری اور اس کے لڑکوں نے اس خدمت کو نہایت عمدہ طریقہ سے انجام دیا۔ ایک طرف قنات کی آڑ میں

عورتوں کے لئے انتظام کیا گیا تھا۔ اور اس خدمت کو پربھاتی نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ پربھاتی گاڑھے کی موٹی ساڑی پہنے ہوئے نہایت خوشی خوشی ہنس ہنس کر ان گنوار عورتوں کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا رہی تھی معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے مسرت وشادمانی کے پھول برس رہے ہیں۔ اس عورتوں کے مجمع میں پربھاتی رحم وانصاف کی دیوی معلوم ہوتی تھی۔ پنڈت کیلاش پربھاتی کے اس انہماک کو دیکھ کر اپنے جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد جب وہ ایک خاص اثر کے ماتحت اُس طرف نکل جاتے اور پربھاتی کو ہنس ہنس کر اُن غریب عورتوں سے باتیں کرتے دیکھتے تو ان کے دل میں ایک پریم کی لہر اٹھتی اور وہ اپنے خاص انداز میں پربھا کہہ کر پکارتے اور پربھاتی پران ناتھ معاف کیجئے ابھی فرصت نہیں ہے کہہ کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔ آٹھ بجتے بجتے سب لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے۔ محبت اور اخلاص کے بوجھ سے لدا ہوا مجمع پنڈت جی کے دروازہ پر جمع ہو گیا سب سے آگے چودہری گھنشیام تھے جنہوں نے تمام مجمع کی طرف سے اپنے الفاظ میں دونوں بھائیوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور منوہر پور کی دعوت کا پنڈت امرناتھ سے دن مقرر کرنے کا مطالبہ کیا آخر طے ہو گیا کہ دوسرے روز دونوں بھائی ۵ بجے شام کو منوہر پور آکر دعوت کھائیں گے۔ اس اعلان نے مجمع کے دلوں کو تشکر واطمینان سے بھر دیا اور وہ جذبات کے جوش میں چلا اُٹھے بھیا امرناتھ کی جے ہو بھیا کیلاش کی جے ہو۔ آخر اس پرجوش مجمع کو پنڈت کیلاش نے پریم سبھاؤ کے دو اپدیش سنا کر رخصت کیا اور وہ سب اپنے اپنے گاؤں کو چلے گئے۔

اس سے پیشتر بھی پنڈت جی بڑے بڑے جلیل القدر حکام ورؤسا کی دعوتیں کر چکے تھے لیکن آج ان کو اس غریب اور بھولی بھالی مخلوق کی دعوت سے جو سچی خوشی اور دلی انبساط حاصل ہوا وہ تمام عمر یاد رکھیں گے۔

دوسرے روز منوہر پور میں امرناتھ اور کیلاش ناتھ کا جس خلوص اور محبت سے استقبال کیا گیا اُس کی شرح کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ ایک راجہ اور رئیس کا بھی استقبال کیا جاتا ہے مگر آہ کس دل سے کیا حکومت اور اقتدار نے کبھی اس طرح دلوں پر حکومت کی ہے؟ کیا ایک ظالم وجابر بادشاہ کے لئے بھی کسی دل سے اس طرح دعا نکلتی ہے؟ جس کو آج امرناتھ اور کیلاش ناتھ دل کے کانوں سے سن رہے ہیں۔ انصاف اور رواداری کے جواب میں اخلاص اور وفاداری کی ایسی بہترین مثال کیا اس زمانہ میں کوئی پیش کر سکتا ہے؟ آج امرناتھ کے دل کی دنیا بدلی ہوئی تھی اب وہ سیاست اور محبت کے راز سے واقف ہو چکے تھے چودہری گھنشیام کے دیہاتی زبان سے انہوں نے بجائے جسم کے دل پر حکومت کرنے کا سبق پڑھ لیا تھا۔ آج اُن کو غریب اچھوتوں سے میل ملاپ رکھنے والا کیلاش ایک پریمی دیوتا نظر آتا تھا۔ آخر وہ اپنے دل میں اُٹھنے والے جذبات سے مجبور ہو کر ایک والہانہ انداز سے اٹھے اور کیلاش ناتھ سے لپٹ گئے۔

امرناتھ۔ بھیا کیلاش اگرچہ تم عمر میں مجھ سے چھوٹے ہو لیکن علم میں بڑے ہو وہ علم جو انسان کو انسانی درجہ سے کچھ بلند کر دیتا ہے۔ تم نے آج اس مغرور اور سرکش دل کی کایا پلٹ دی ہے کہ جو کمزور اور غریب انسان کو انسان نہ سمجھتا تھا۔ کیلاش میں تیرے سامنے اپنا عقیدتمند دل اور نیازمند سر جھکاتا ہوں اور آج سے تجھے اپنا گرو مانوں گا اور اس مبارک سفر کو ہمیشہ پریم یاترا کے نام سے یاد کرونگا۔

کیلاش نے امرناتھ کو گلے سے لگا لیا۔ فقط

شاکر کانپوری

جذباتِ بسمل!

از جناب بسمل صاحب الہ آبادی

دمِ آخر اُنہیں سمجھا رہا ہوں
گلے مل لو کہ اب میں جا رہا ہوں

کرو امداد اے میری اُمیدو
ہجومِ یاس سے گھبرا رہا ہوں

ٹھہر کوئی دم اور اے عمرِ رفتہ
کہ تیرے پاس میں بھی آ رہا ہوں

نہ پوچھیں آپ مجھ سے رازِ اُلفت
کہ میں کہتے ہوئے شرما رہا ہوں

نہیں معلوم ہوتا بے خودی میں
خدا جانے کدھر میں جا رہا ہوں

یہ نکلا دل لگانے کا نتیجہ
کہ دل دے کر اُنہیں پچھتا رہا ہوں

گرہ جو پڑ گئی تھی اُن کے دل میں
اُسی کو آج تک سلجھا رہا ہوں

اُڑاؤں جستجو میں خاک کیوں کر
تمہیں تو ہر جگہ میں پا رہا ہوں

مرا دل پھر جہاں لے جا رہا ہے
ابھی تو میں وہیں سے آ رہا ہوں

پرایوں کی شکایت کیا ہے بسمل
کہ اپنوں کو مخالف پا رہا ہوں!

"حماقت"

از حضرت کوئی

جس طرح محبت ایک غیر اختیاری مرض ہے جو انسان کے احساسات لطیف سے متعلق ہے اسی طرح حماقت بھی ایک پوشیدہ بیماری ہے جو براہ راست انسان کے دل و دماغ سے واسطہ رکھتی ہے، محسوس نہ محبت ہوا کرتی ہے نہ حماقت، فرق دونوں کے درمیان صرف اتنا ہے کہ مقدم الذکر تو تپ دق Revolutionary Movement کی طرح محض نوجوانوں کو اپنا شکار بنا سکتی ہے لیکن مؤخر الذکر بچے، بوڑھوں، لنگڑے لولوں، ہندو مسلمانوں، عیسائیوں، موسائیوں، غریبوں، رئیسوں، کوتوالوں ڈاک منشیوں سب کو ایک نظر سے دیکھتی ہے اور سب میں یکساں پھیلتی ہے اسطرح حماقت کا دائرہ محبت سے زیادہ وسیع ہے اور اسی وجہ سے حماقت کو محبت پر فوقیت بھی حاصل ہے، دنیا کا کوئی ملک، کوئی قوم، کوئی قبیلہ اور کوئی خاندان حماقت اور محبت کے کارناموں سے خالی نہیں ہے۔

اس بیان سے میرا مدعا یہ نہیں، کہ محبت و حماقت چھوٹی بڑی بہنیں ہیں یا یہ کہ ہر شخص (جس میں خدانخواستہ آپ بھی شامل ہیں) محبت و حماقت کا ایک مرکب ہے، ضروری نہیں کہ ہر وہ فرد جو حماقت کرتا ہے محبت کا شکار بھی ہو، دونوں علیحدہ علیحدہ عنوان ہیں اور منطق کی رو سے دونوں کے نتائج جدا جدا، لیکن چونکہ ایک چیز (انسان کا زمانۂ شباب) دونوں میں مشترک ہے اس لئے یہ کہنا منطق سے باہر نہیں کہ ہر وہ شخص جو محبت کرتا ہے حماقت کا ضرور شکار ہوتا ہے۔

اب کہنے والے ایک اور بات بھی کہتے ہیں مثلاً میرے ایک ضرورت سے زیادہ شاعر دوست کہا کرتے ہیں کہ ہر انسان کی عمر میں ایک لمحہ ایسا ضرور آتا ہے جس میں فطرت اس کے قلب کو خالص جذبات محبت سے معمور کر دیتی ہے اور وہ بلا تخصیص بھنگی چمار کیوپڈ کے تیر کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے یا ذرا اور شدھ زبان میں ہر منشی کے جیون میں ایک گھڑی ایسی بھی آتی ہے کہ وہ پریم کرنے لگ جاتا ہے۔

اس اصول کی بناء پر یہ نتیجہ صریح مرتب ہوگا کہ ہر وہ شخص جو حماقت کرتا ہے محبت بھی کرتا ہے اور چونکہ حماقت دنیا میں ہر ایک سے سرزد ہو سکتی ہے اس لئے انسان (کم از کم کسی خاص زمانہ میں) محبت و حماقت کی معجون مرکب ہوتا ہے، مگر میرے نزدیک ان کا یہ بنیادی اصول کہ محبت انسانی زندگی کا جزو لاینفک ہوتی ہے ایک لاطائل اور بلا دلیل بات ہے ضروری نہیں کہ ہر ایک ان کے اس اصول کو تسلیم کر کے محبت و حماقت کی چٹنی بننا پسند کرے، لیکن اگر وہ اسے اپنے لئے پسند کرتے ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔

تقسیم کرنے والوں نے جس طرح محبت کو مختلف عنوانات و موضوعات میں تقسیم کیا ہے اسی طرح حماقت کے بھی حصے بخرے کئے گئے ہیں یعنی جیسے محبت "حقیقی" "مجازی" "شہوانی" "جذباتی" اور "وقتی" اقسام میں تجزیہ کی جا سکتی ہے اسی طرح حماقت بھی "ادیبانہ حماقت" "منشیانہ حماقت" "دوستانہ حماقت" "رئیسانہ حماقت" "وکیلانہ حماقت" "لیڈرانہ حماقت" وغیرہ وغیرہ عنوانات پر تقسیم کی جا سکتی ہے۔

دنیا کی تمام حماقتوں میں جو "تفضیل کل" کی حیثیت رکھتی ہے اس کا نام "پاجیانہ حماقت" ہے اور سہ

ایں سعادت بزور بازو نیست ۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

دنیا کا بڑے سے بڑا حماقت بیگ بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے

اندر پاجیانہ حماقت" کے جراثیم موجود ہیں، اندریں حال ایک طفل نوخاستہ جس نے دربار حماقت سے ابھی کوئی باقاعدہ سرٹیفکٹ بھی حاصل نہیں کیا ہے نہایت آسانی سے پاجیانہ حماقت کا ایکٹ کرسکتا ہے، مدعا یہ کہ حماقت کی یہ قسم ہر شخص کا حصہ نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ خود حمق اعظم حضرت ابلیس کی ذاتی اور خصوصی امداد شریک حال نہ ہو۔

حماقت کے مفہوم کو ہر چھوٹی سے چھوٹی اور ہر موٹی سے موٹی عقل پر واضح کرنے کیلئے اس کی ضرورت ہے کہ اس کی چند اقسام پر ایک تفصیلی اور تمثیلی بحث بھی کی جائے تاکہ آپ کو "حماقت کی سُرخ جھنڈی" کی پہچان ہو سکے، اور مجھے بعض "دوستانہ حماقتوں" سے امان مل جائے، وہو ہذا۔

۱۔ ادیبانہ حماقت :۔ اس حماقت کی تین ذیلی اقسام ہیں۔

حماقتِ منظوم، حماقتِ منثور، حماقتِ مجہول۔

ا۔ حماقتِ منظوم۔ اس تک بندی کو کہتے ہیں جسے شاعر اپنے خیال میں تو دیوانِ غالب کا جواب یعنی وید مقدس کا منتر سمجھکر لکھے لیکن اُسکی حقیقت کلمۂ مہمل سے آگے نہ بڑھے اور بعض اوقات خود لکھنے والے کی زبان سے اس قسم کے الفاظ کہلوادے کہ :۔ ؎

مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

اس کے علاوہ حماقتِ منظوم اس کرایہ کے کلام کو بھی کہتے ہیں جسے صرف مشاعرہ کی واہ وا وصول کرنے کیلئے کوئی حماقت زدہ کسی پُرانے دُہرانے شاعر سے لکھوالے، اور اُسے جھوم جھوم کر سوہنی کے سُروں میں نہایت صفائی سے معہ سکتہ و "صفت " ہزاروں کے مجمع میں پڑھ جائے پھر اس حماقت پر جو قہقہے اُڑیں اُنہیں داد اور جو خاموشی طاری ہوا سے "سکوت سخن ناشناس" سمجھکر بتیسی کھولے ہوئے دونوں ہاتھوں سے محفل کو سلام کرتا ہوا تخت سے نیچے اُتر آئے۔

ب۔ حماقتِ منثور۔ اس حماقت کا نام ہے جس میں آج کل ہمارے مکرم دوست مسٹر حضرت نیاز فتحپوری مبتلا ہیں اور اپنی اچھی خاصی انشا نگاری کو چھوڑ کر مولویوں کی داڑھی سے لپٹ گئے ہیں چنانچہ گذشتہ ایک سال میں جو نثر اُنھوں نے نگار کے ذریعہ سے پیش کی ہے اس میں سات سو جگہ مولوی کے لفظ کو دُہرایا ہے اب اگر اسی نسبت سے آپ مولوی کے متعلق استعمال ہونے والے الفاظ اُن کی نثر سے چھانٹ لیں گے تو زیادہ سے ان کی یک سالہ ریزش دماغ کا نتیجہ ہزار آٹھ سو الفاظ پر ختم ہوجائیگا، یہ موضوع ان کیلئے ایسا مخصوص ہوکر رہگیا ہے کہ بعض ستم ظریف حضرات صرف اُنھیں چھیڑنے کیلئے ایک آدھ مذہبی استفسار کا شوشہ چھوڑ دیتے ہیں اور مدتوں ان کی "حماقتِ منثور" کے نمونے دیکھتے رہتے ہیں۔

ج۔ حماقتِ مجہول۔ اس حماقت کو کہتے ہیں جس میں مبتلا ہوکر ادیب کو اپنے نام کے ساتھ بلیغ الکلام، مصورِ جذبات، فطرت نگار، ابن الوقت الوالبیان، سحر لف نگار، زبان الملک، مژگان الھند، زنخدان البنجاب دندان البھوپال، زعفران الکشمیر وغیرہ لکھنے کا خبط ہوجاتا ہے۔

۲۔ عشقیانہ حماقت :۔ اس رعنائی کا نام ہے جس کے ماتحت اکثر حضرات اپنے دستخطوں کو آنکھ پھوڑ ٹڈا، کٹا ہوا پتنگ، بھول بھلیاں یا قطب مینار قسم کی چیز بنادیا کرتے ہیں، اور تحریر میں قصداً حروف کو ایسی ایسی قلابازیاں کھلاتے ہیں، الفاظ کی وہ وہ جمناسٹک کھلاتے ہیں، شکست کو ایسے ایسے اولمپک گیمس *Olympic Games* کھلواتے ہیں کہ ان کی تحریر اچھا خاصہ کٹ پتلیوں کا تماشہ بنکر رہجاتی ہے

۳۔ دوستانہ حماقت :۔ یہ حماقت بھی ادیبانہ حماقت کی طرح تین درجوں میں تقسیم ہے۔ حماقتِ جارحانہ، حماقتِ مدافعانہ، حماقتِ طفلانہ

ا۔ حماقتِ جارحانہ۔ اس بے تُکے پن کو کہتے ہیں جس میں دوسروں کو بنانے کی کوشش میں آپ خود مضحکہ بنکر رہ جائیں۔

ب۔ حماقتِ مدافعانہ۔ اس حماقت کا نام ہے جس میں ہر بات کو آپ یہ سمجھنے لگیں، کہ آپ کو بنایا جارہا ہے اور پھر یہ سمجھنے کے بعد پہلے تو اس کا جواب متانت سے دینے کی کوشش کریں، لیکن رفتہ رفتہ آپکا پارۂ مزاج چڑھکر بالکل غیر ارادی طور پر جنگ کی صورت اختیار کرلے

ج۔ حماقتِ طفلانہ۔ اس بدتمیزی کا نام ہے جو کسی دوسرے کے مکان پر آپ کو صرف اپنے لب لعلین رچانے کیلئے اپنی جیب سے پان کی ڈبیہ نکالنے پر مجبور کرے، اور جب آپ کا کوئی دوست اُس "خانگی تبرک" کو بلا تواضع جیب میں واپس پہونچتا ہوا دیکھکر اپنا حصہ طلب کرے، تو آپ باقاعدہ آستین چڑھاکر جنگ کا الٹی میٹم دے دیں اور اس پر بھی اصرار جاری رہے تو اسے اپنی چیز سمجھکر ایک دیوبندی

ہلوی کی طرح سنجیدگی اختیار کرلیں اور آپ کی ہر ادا سے " جو چھیڑو گے درو دینگے " والی بات ظاہر ہونے لگے۔

اس کے علاوہ حماقت طفلانہ اس چومنزے پن کو بھی کہتے ہیں جو ش کے کھیل میں بازی ہارنے پر آپ کے توازن دماغی کو درہم برہم ردے اور آپ اپنے مدمقابل دوستوں کو بالکل ایسا دشمن سمجھنے لگیں نہوں نے آپ کی تباہی یا بربادی کیلئے آپس میں ساز باز کرلیا ہے پھر اگر اتفاق سے آپ اپنی بذاتی حماقت فرمائی سے اپنا کوئی قیمتی تیرضائع ردیں تو اس کا آپ کو اتنا ہی رنج ہو جتنا اپنی اولاد کے ضائع ہونیکا۔

۴ رئیسانہ حماقت :- اس بوکھلاہٹ کا نام ہے جس میں مبتلا ہوکر آپ اپنی جائداد عرف ریاست کو کورٹ آف وارڈس کے سپرد کردیں ور پھر " بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم " ہوکر یا تو تمام شعراء کے منتخب اشعار جن میں ہائے وائے، آہ، اُف وغیرہ کسی نہ کسی طرح نظم وگیا ہو ہر وقت اپنی نوٹ بک میں نقل کرتے رہا کریں یا دُنیا بھر کی جائدادوں کے انتظام میں اپنی ٹانگ اُڑانے کا شوق فرمالیں اور ہر شخص و اپنے قیمتی مشوروں سے اس طرح مستفید فرمانے لگیں، گویا آپ واقعی زمینداری اور ریاست داری کے امور میں آخری لفظ ہیں، اسکے ساتھ ہی ساتھ اس مہمل روش کو بھی اپنا شیوہ بنالیں کہ جس وقت آپ مردانے میں آکر اپنے پسماندہ دوستوں سے گپ شپ اڑائیں، س وقت آپ کے چاروں طرف بھاری بھاری رجسٹروں، لال ربن والے فائیلوں اور لمبی لمبی رسید بہیوں کا انبار اس بے ترتیبی سے پھیلا ہوا ہوکہ ہر نیا آدمی آپ کو " منیجر کمپنی ہذا " سے کم نہ سمجھ سکے۔

۵ مولویانہ حماقت :- اس لغویت کو کہتے ہیں کہ صرف ایک چھوٹی موٹی ڈاڑھی رکھکر اور مسجد میں دو چار وقت کی نماز پڑھکر تمام دُنیا آپکی نظر میں دوزخ کا ایندھن اور ہر شخص کافر ملحد اور بیدین نظر آنے لگے پھر اگر کوئی شخص آپ کے مذہبی اعتقادات پر ذرا وسیع تبصرہ کرنا چاہے تو آپ جواب دینے کی بجائے اُسے اسی نظر سے دیکھنے لگیں جس نظر سے بقرعید کے دن ڈاکٹر مونجے اپنے مسلمان پڑوسیوں کو دیکھا کرتے ہیں

۶ وکیلانہ حماقت :- اس بے تکے پن کا نام ہے کہ صرف مؤکلوں کو مرعوب کرنے کیلئے اپنی بحث کو بلاضرورت طول دیکر وکیل صاحب ایسے واقعات کو چھیڑ دیں جن کا اثر اپنے مؤکل کے خلاف پڑتا ہو اور جب عدالت اس بے وقت کے راگ کو روکنا چاہے تو وکیل صاحب بطور احتجاج " تجھپہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا " کہتے ہوئے مستقل خاموشی اختیار کرلیں، پھر جب اس حماقت کا نتیجہ مقدمہ ہارنے کی صورت میں برآمد ہو تو پشیمان ہوکر اپنے مؤکلوں کو اپیل کی صلاح دیتے ہوئے ٹوپی ہاتھ میں لئے عدالت کے کمرے سے باہر نکل آئیں۔

۷ لیڈرانہ حماقت :- اس مغالطہ کو کہتے ہیں کہ آپ صرف ایک مرتبہ جیل جانے کے بعد دو چار جلسوں میں اُلٹی سیدھی تقریریں کرکے خود کو مہاتما گاندھی نہیں تو کم از کم خان عبدالغفار خان ضرور سمجھنے لگیں

اب سب سے آخر میں **پاجیانہ حماقت** کا نمبر ہے پاجیانہ حماقت اسے کہتے ہیں کہ آپ صرف اپنی حماقت سے مردم آزاری، تباہی یا نقصان رسانی کا موجب بنیں، مثلاً فرض کیجئے رات کے وقت کوئی لالہ بھائی اپنی دوکان پر نہایت بیفکری سے توند کھولے ہوئے سو رہے ہیں انھیں دیکھکر آپ کی رگ حماقت بھڑکتی ہے آپ بازار سے چھوٹے پٹاخوں کی ایک لڑی خریدتے ہیں اور فلیتہ کو آگ دکھاکر اس غریب کی توند پر پھینک دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ آپکی یہ حماقت آمیز تفریح کس قدر لالہ آزاری کا موجب ہے۔

اب اس کے بعد فرض کیجئے کہ کوئی گاؤں کا سیدھا سادا دہقانی ایک نہایت ہی لمبا چوڑا بھاری بھرکم دوپٹہ باندھے اپنی گنوارانہ حماقت کا ثبوت دیتا ہوا آپ کے پاس سے گذرتا ہے، آپ اپنی جلی ہوئی سگریٹ چپکے سے پس پُشت جاکر اس کی پگڑی میں رکھ دیتے ہیں اور کوئی دس بیس قدم کا فاصلہ دے کر اس کے ساتھ ساتھ چل دیتے ہیں تاآنکہ وہ غریب پہلے تو ہوا لگ لگ کر ای آئی آر کا انجن اور پھر رفتہ رفتہ شعلہ فروش بن جاتا ہے پھر جب وہ بدحواسی سے اپنا حماقت کا ٹوکرا اُتار کر پھینکتا ہے تو آپ ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ آپ صرف اپنے شوق حماقت کو پورا کرنے کیلئے اس غریب کی جان تک کی بازی لگا دیتے ہیں، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ سر کے بالوں میں آگ لگ جانے سے فوراً موت واقع ہوجاتی ہے۔

اس کے علاوہ " پاجیانہ حماقت " کی ایک مثال وہ بے وقوف قسم

کے ناعاقبت اندیش لوگ بھی ہیں جنھیں صرف اپنی خباثت نفس کو مطمئن کرنے کیلئے ہزاروں ہم مسلمان بھائیوں کا دل دکھانے میں تامل نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کی حماقت میں جتنا فتنہ وفساد پھیلانے، کشت و خون بکا بازار گرم کرنے کا اندیشہ ہوتا ہے، اتنا ہی خود انکی جان کا بھی خطرہ ہوتا ہے حماقت پر اس اجمالی گفتگو کے بعد غالباً آپ کو اندازہ ضرور ہو گیا ہوگا، کہ حماقت کا مرض کتنا عام ہے اور کہاں کہاں، کس کس موقعہ پر اس کی سُرخ جھنڈی شناخت کی جاسکتی ہے اب اگر اس کے بعد بھی آپ حماقت کے معنی نہ سمجھیں اور یہ رائے قائم کریں کہ ہمارا مضمون لکھنا ہی بجائے خود ایک حماقت تھا تو یقین کیجئے کہ یہ بھی آپ کی ایک حماقت ہوگی اور ان تمام اقسام کی حماقتوں سے زیادہ خطرناک جن کا بیان لکھا گیا اوپر قلم ہمارے سے۔

"بر رسولاں بلاغ باشد و بس"

تجلیات

از جناب نیّر امرتسری

دُعا دیکر کہا زیبا نہیں روپوش ہوجانا
بگڑ کر وہ لگے کہنے کہ بس خاموش ہوجانا

تمہارا دیکھنا اور دیکھ کر روپوش ہوجانا
ہمارا دیکھنا اور دیکھ کر بے ہوش ہوجانا

میری عرضِ تمنا پر ترا پر جوش ہوجانا
مرا مجبور ہوجانا مرا خاموش ہوجانا

تجمل کے تقاضے پر کہا اُس رشکِ خوباں نے
کہیں تم بھی نہ موسیٰ کی طرح بے ہوش ہوجانا

خدا شاہد ہے وہ منظر قیامت کا نمونہ تھا
ہمارا دیکھنا اور آپ کا روپوش ہوجانا

دُعا مرنے کی کرتا ہے عدو جب یاد کرتا ہے
مرے لاشے سے آکر تیرا ہم آغوش ہوجانا

تمہاری ہجر کے بیمار کا یہ حال رہتا ہے
تڑپنا لوٹنا بیتاب اور بے ہوش ہوجانا

تنگ دو میں حقیقی زندگی کا راز مضمر ہے
مصیبت میں پھنسا دیتا ہے راحت کوش ہوجانا

ملاقاتوں میں اکثر پیشِ احوال پر نیّر
ہزاروں حال کہہ دیتا ہے اک خاموش ہوجانا



صحرا کی بیٹیاں کمبل تیار کر رہی ہیں



صحرا کی راہ کے نخلستان

آسامی اردو

مسٹر لطف کے مزیدار قلم سے

اس سال کی عید خوب ہوئی، خدا غریق رحمت کرے مولانا بدھو کو جنکے وعظ سے میدان عیدگاہ کشت زعفران بن گیا تھا افسوس مولانا عید کی ۔کو موٹر پر سیر گشت کرتے چلے گئے، ورنہ آپ کی دوچار تقریروں کے فیض سے آسام کے نہیں تو شلانگ والے جاہل ضرور اُردو دان بن جاتے ۔آپ نے نماز سے پہلے فصاحت، بلاغت، لطافت، ظرافت کے وہ وہ دریا بہائے ہیں، جو آج تک کسی دیوبندی، بریلوی، دلہوی، لکھنوی مولوی نے خواب خیال میں نہ دیکھے ہونگے، اور کیوں نہ بہاتے ماشاء اللہ آپ موتی ہیں، رند ہیں مست ہیں، قلندر ہیں، صفات والا کا امتحان لینا تو ہمارے بس کی بات نہیں البتہ آپ ظریفوں کے باوا آدم، ہنسنے ہنسانے کی کل مجسم دیوار قہقہہ ضرور ہیں، یہ آپ کے وعظ ہی کا اثر ہے کہ جب یار لوگ ایک ایک فقرے کو دہراتے ہیں تو ہمارے دانت ہونٹوں کا نقاب اس طرح اُتار پھینکتے ہیں جس طرح چودہویں صدی کا آزادی پسند فرقۂ نسواں برقع، اس خوشی میں اگر ہم اپنے دور دراز رہنے والے بھائیوں کو شامل نہ کریں، تو کوئی حق نہیں کہ انسان کہلائے جائیں، مولانا کے وعظ سے کل عالم فیضیاب ہو، صرف اسی خیال سے عالمگیر میں چھپوانے کی ٹھان لی-چونکہ اُردو رسائل میں عالمگیر رسالہ اورنگ زیب کی طرح مشہور ہے اور ایمان کی تو یہ ہے جو اس کا خریدار نہیں وہ بھی مانگ کر پڑھ نہ لے جب تک بے چین رہتا ہے، دنیا اسکو خریدتی ہے سر آنکھوں میں جگہ دیتی ہے، دیدہ دل میں بٹھاتی ہے، محبت کرتی ہے پیار کرتی ہے تقریر لکھ کر ہم اپنے فرض سے سُبکدوش ہو گئے، اب حافظ صاحب کے اختیار میں ہے چھپا دیں یا چُھپا دیں-مولانا کے جُبّہ و دستار کا حال اور حلیہ کی حالت لکھکر ناظرین کا وقت ضائع کرنا منظور نہیں ہے اسلئے آمدم برسر مطلب-

ہاں تو مولانا وعظ فرمانے کھڑے ہوئے، پہلے آہستہ آہستہ کچھ گنگناتے رہے جسکو ہمارے کانوں نے نہیں سُنا مگر آنکھوں نے دیکھا کہ ہونٹ ہل رہے تھے چشم نے پٹ کھلتے اور بند ہوتے تھے، شاید آیۃ الکرسی اپنے سینے پر دم کی ہوگی، پھر کھنکارے، ادھر اُدھر دیکھا بعدہٗ گویا ہوئے-

معززان با صفات والا صفات ۔لَعْنَةُ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ-یعنی کہ میں جو کچھ ارشاد فرماؤں گی وہ فرمان الٰہی اور رسول کے حکم کے عین مطابقت سے ملتا جلتا ہوگا، اور کیا معنی کہ جو کچھ کہوں گا سچ مچ کہوں گی، البتہ یہ کہنا کچھ بے فضول نہ ہوگا، کہ میری پہلا موقع ہے جو اس کفرستان جنت نشان آسام کے صدر مقام شلانگ میں وعظ فرمارہے ہیں-

ایک آواز - مولانا صاحب! جمع واحد کا خیال نہیں تو مذکر و مونث کا تو ملحوظ رکھیے-

مولانا-تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ کے بکنے سے کیا ہوتا ہے ہماری بنگال میں مرد و زن سب نے پردہ اُٹھا دیا ہے، میں اپنی وعظ میں عورتوں کا خاص خیال رکھتی ہوں، میں کوئی پرانا دہقانی کاٹھ کا ملا نہیں ہوں، چودھویں صدی کی ہوا کا رُخ پہچانتے ہیں یعنی کہ داڑھی منڈانا عیب نہیں تو نماز پڑھنا ثواب ضرور ہے میں سچ کہتی ہوں "کہتی ہوں" پر ایک فرمائشی قہقہہ جو پڑا، تو سیکڑوں کے وضو ٹوٹ گئے ہم بھی رکوع سے پہلے سجدے میں گر گئے، مولانا فورا رُک کے پھر نادرشاہی ڈانٹ میں للکار کر کہا، کیسی بیوقوف ہو ہنسی اُڑاتے ہو، ڈرو خدا سے، ورنہ اس کا قہر نازل ہوگا-جیسے عذاب آیا کٹار پور کان پور، آرا بہار، آگرہ اور بنارس یونیورسٹی اور بہت سے مسلمان بغیر قضا کے راہی عدم سدھار ہو گئے-

یہ مہینہ ہے بقرا عید کا اور یہ دن ہیں بکرے قربان کرنے کے، اسلئے سوچ سمجھکر ہاتھ پیر بچا کر قربانی کرنا ثواب ہوتی ہے، آج تم مرجاؤ تو کل کوثر میں جو بہت بڑا جنت ہے تمھارا گھر ہونگے، آخر میں تمام رسائل کی اُستادات

طلبات، عورات، مردات سے میں یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ میل جول اور "اتفاق" میں بڑے فائدہ ہیں، اور شرع میں شرم مت کرو، محنت نہیں کر سکتے تو مزدوری کرو۔ اللہ ساتھ ہے صبر کرنے والوں کے چونکہ ٹائم زیادہ گذر گئی ہے، نماز کی وقت آگئی، اس لئے میں اپنی وعظ کو ختم کرتے ہوں، کھڑے ہو کر صفیں صاف کر لی جائیں اور نماز کی نیت غور سے سنو۔

دو رکعت نماز عید الفطر ساتھ چھ تکبیروں کے ساتھ میں پیچھے امام کے واسطے اللہ کے واجب ہے، منہ میرا طرف کعبہ کے، اللہ اکبر۔

ہاں ایک بات یاد آگئی، ایک لڑکے صاحب بیمار ہیں جسکو والدہ کی خواہش ہے کہ نماز کے بعد سب لوگ خدا سے دعا کریں کہ صحت کلی عطا فرما دے اور اپنی جوار رحمت میں جگہ دے، آمین ثم آمین۔ (ایم اے حسین لطف سکرٹری)

تصنیفات ملا رموزی

شادی

اس کتاب میں ملا رموزی نے اپنی ہی شادی کے تفصیلی حالات اپنے ہی قلم سے جس کمال لطافت اور تحقیق سے لکھے ہیں ان کو دیکھ کر دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو میں ایسی لطیف کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی قیمت فی جلد دو روپے آٹھ آنے .... (عہ۸ر)

صبح لطافت

اسے نکات رموزی کا حصہ سوم سمجھئے۔ مگر اس میں علم و ادب سیاست اور اخلاق کے جن حالات پر بحث ہے۔ حق یہ ہے۔ ادب اردو اس کے جواب سے عاجز ہے۔ قیمت دو روپے ...... (عہ۲ر)

نکات رموزی حصہ اول

یہ ملا رموزی کا وہ مروجہ روزمرہ اور محاورہ سے فصیح اور سلیس انداز انشا کا مجموعہ ہے جس میں ملا رموزی کی تصویر بھی شامل ہے۔ عام ملکی، قومی، علمی، ادبی اور اخلاقی حالات پر عجیب و غریب طرز کا تبصرہ قیمت ایک روپیہ ...... (عہ۱ر)

نکات رموزی حصہ دوم

اس میں حصہ اول سے سوا دلفریب اور دلکش مضامین ہیں۔ جو انداز خطاب اور فصاحت نگاری کا اچھوتا نمونہ ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے .... (عہ۱۸ر)

ملنے کا پتہ: عالمگیر بک ڈپو بازار سید مٹھا لاہور

سمن بغرض قرار داد امور تنقیح طلب

مقدمہ نمبر ۵۴۹۰ سنہ ۱۹۳۱ء

عدالت جناب منصف صاحب بہادر بہرائچ مقام بہرائچ

گجادھر ولد ہیرالال بنام راجہ محمد سعادت علی خاں وغیرہ مدعی

بنام محمد عثمان ولد نامعلوم قوم پٹھان ساکن جالگائی گھاٹ ضلعدار پرگنہ نانپارہ مدعاعلیہ

واضح ہو کہ مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت ہرجہ کے دائر کی ہے لہذا تم کو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ اکیس جولائی سنہ ۱۹۳۱ء وقت ۱۰ بجے دن کے اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امورات اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جس کے ساتھ کوئی اور شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعویٰ مدعی مذکور کی کرو اور تم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ جملہ دستاویزات کو جن پر تم بتائید اپنی جوابدہی کے استدلال کرنا چاہتے ہو پیش کرو۔

مطلع رہو کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ تمہاری غیر حاضری میں مسموع اور فیصل ہوگا۔

آج بتاریخ ۱۹ ماہ مئی سنہ ۱۹۳۱ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

(دستخط حاکم بخط انگریزی) (مہر عدالت)

آپ اپنا قاتل!

از جناب غلام الثقلین صاحب مانکپوری

دنیا عجب عبرت کدہ ہے اس میں بہت سے ایسے واقعات گذرے ہیں، جن کو سُنکر انسان دنگ رہجاتا ہے ابعد اس کے دل پر ایسی بے حسی کا عالم طاری ہوتا ہے کہ نہ اسے عیش میں مزہ ملتا ہے اور نہ مصیبت میں تکلیف ہوتی ہے، دربار بنی عباس کا شاعر " بحتری " کہتا ہے :" میں ایک دن متوکل علی اللہ عباس کی محفل عیش میں شریک تھا، زندہ دل ندیمان صحبت جمع تھے - اور بذلہ سنجیاں ہو رہی تھیں - اتنے میں تلواروں کا ذکر چھڑ گیا، اور لوگ اپنے اپنے تجربہ کے مطابق تلواروں کی خوبیاں بیان کرنے لگے، حاضرین میں سے کسی نے عرض کیا،" امیر المومنین تلوار تو بصریٰ میں فلاں شخص کے پاس ہے - ہندوستان کی بنی ہوئی ہے - فولاد ہندی کی ہے - اور تمام خوبیوں میں اپنی نظیر نہیں رکھتی - اس شمشیر آبدار کی تعریف سُنکر متوکل کو شوق ہوا - منشی دربار کو بلا کر اسی وقت والئی بصریٰ کے نام فرمان جاری کر دیا کہ " وہاں فلاں شخص کے پاس ایک بے نظیر تلوار ہے جس کی یہ صفتیں ہیں اس کو جس قیمت پر دے اس سے خرید لو - اور کمال احتیاط کے ساتھ میرے پاس روانہ کرو - والی نے فرمان خلافت پاتے ہی اس شخص کو بلوایا، اس سے تلوار منگوا کے دیکھی، جس طرح بنا سمجھا بجھا کر دس ہزار درہم کے معاوضے میں خرید لی - اور دوسرے دن معتمد لوگوں کے ہاتھ دربار خلافت میں بھیجدی -

(۲)

متوکل اس کو دیکھ کے بہت خوش ہُوا - جیسی صفت سُنی تھی اُسے ویسا ہی پایا اور اپنے وفادار وزیر فتح بن خاقان سے کہا " اب کوئی خوش رو، توانا، وتنومند اور بھروسے کا نوجوان جس کی وفاداری و شجاعت کا لوگوں پر رعب پڑتا ہو، میں اس کو اس خدمت پہ مقرر کروں گا - کہ اس بے نظیر تلوار کو اپنی کمر میں لگائے میرے پیچھے کھڑا رہا کرے - جب تک میں دربار میں رہوں، میری پشت پر حاضر رہے - اور جب کہیں جاؤں تو میرے ساتھ جائے حضور خلافت پناہ یہ الفاظ کہہ ہی رہے تھے، کہ باغر ترکی سامنے دکھائی دیا باغر نہایت ہی وجیہہ اور صورت دار ترکی غلام تھا، شجاعت میں مشہور تھا، اور سب سے بڑی بات یہ کہ متوکل کو اس پر بھروسا تھا، غرض متوکل نے اسے بُلا کر وہ شمشیر اس کی کمر میں باندھ دی، اور حکم دیا کہ " اس وقت تم میرے ایڈی کانگ ہو جب تک دربار میں بیٹھا رہوں میرے پیچھے اس تلوار کو کمر میں لگائے کھڑے رہا کرو اور جب کہیں جاؤں تو میرے ہمرکاب چلا کرو - باغر اس خدمت کو اپنی سرفرازی سمجھا - اور اس روز سے ایڈی کانگ کی وضع میں اپنے خلافت پناہ آقا کے ساتھ رہنے لگا -

(۳)

اس کے بعد بحتری کہتا ہے " خدا کی قسم یہ تلوار ہمیشہ میان میں ہی رہی، اور متوکل کی رحم دلی نے کبھی ایسا موقع نہ پیش آنے دیا کہ اس تلوار کی کاٹ کا امتحان بھی ہوتا " لیکن انجام میں یہ شمشیر آبدار میان سے نکلی اور خود متوکل اور اس کے وزیر خاقان کے قتل کرنیکے لئے -

یہ عبرت ناک انجام یوں ظاہر ہوا، کہ متوکل نے پہلے اپنے بڑے بیٹے محمد المنتصر کو ولیعہد خلافت مقرر کیا تھا - مگر چند روز بعد باپ بیٹوں میں مخالفت ہو گئی اور متوکل آمادہ ہُوا کہ ناخلف بیٹے کو ولی عہدی سے

محروم کرکے اس کے چھوٹے بھائی محمد المعتنر کو جو باپ کا لاڈلا اور فرماں بردار تھا وارث خلافت قرار دے۔ یہ خبر فوج میں مشہور ہوئی تو سپاہیوں اور سرداران فوج میں علی العموم ایک بددلی پیدا ہوگئی۔ اس لئے کہ اکثر ترک سپاہی المنتصر کو اچھا سمجھتے اور اسکے طرفدار تھے۔ آخر انھیں بددل سپاہیوں کا ایک نمک حرام گروہ المنتصر سے جاملا اور اس کے اشارے سے خلیفۂ وقت کی جان لینے کے درپے ہوگیا۔ ان لوگوں اور المنتصر میں جب خوب اچھی طرح عہد و پیمان ہوگیا، تو ان لوگوں نے اس باغر کو اس خطرناک خدمت دینے پر مامور کیا، اس لئے کہ وہ بھی اس سنگدل محسن کش گروہ میں شامل تھا۔

(۴)

ایک دن آدھی رات کو متوکل نشۂ صہبا سے بدمست ہوکے سوگیا تھا، اور وزیر فتح بن خاقان پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ناگہاں باغر دس ترکی سپاہیوں کے ساتھ محل میں آیا۔ مخمور خلیفہ کے برابر کھڑے ہوکے وہی اس کی دی ہوئی تلوار میان سے نکالی، اور ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ ایک ہی وار میں متوکل کی گردن کٹ کے جدا ہوگئی، وزیر فتح بن خاقان نے جو یہ حال دیکھا تو گھبرا کے جھپٹا اور کہنے لگا "کمبختو تم خلیفہ ربانی کو قتل کئے ڈالتے ہو" یہ الفاظ سنتے ہی دسوں قاتل اس پر بھی جھپٹ پڑے۔ ہر طرف سے وار کرنے لگے۔ یہانتک کہ اس کو بھی کاٹ کر ڈال دیا۔ اس کے بعد ان سفاکوں نے متوکل اور فتح کی لاشوں کو ایک دری میں لپیٹ کر محل کے اندر ہی کسی جگہ دفن کردیا اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ قصر خلافت میں اور اسکے ساتھ ساری دنیا میں کتنا بڑا انقلاب ہوگیا۔

(۵)

یہ مرقع ہائے عبرت ہیں جنکو دیکھکے ایک اگلے نکتہ رس شاعر عجم نے بآواز بلند کہدیا ع "اسپ و زن و شمشیر وفادار کہ دید"

یعنی تلوار بھی ان چیزوں میں سے جو ہمیشہ ایک کے پاس نہیں رہتی، اس مصرعہ کو اکثر ناواقف لوگ عورتوں کی بیوفائی کے ثبوت میں پیش کیا کرتے ہیں مگر یہ نہیں سمجھتے کہ شاعر کا مقصد عورتوں کو یہ الزام دینا نہیں ہے کہ وہ اپنے تقاضائے طبع سے اور اپنی فطرت بیوفائی کے جوش میں ایک چاہنے والے کو چھوڑ کر کے دوسرے چاہنے والے کے پاس چلی جاتی ہیں، نہیں ایسا نہیں ہے، اگلے دنوں معمول تھا کہ ایک قوم دوسری قوم پر فتحیاب ہوتی تو اس کے ملک اس کے اسلحہ و لباس، اس کے گھوڑوں اور مویشیوں کے ساتھ اس قوم کی عورتوں کو بھی پکڑ کر اپنے تصرف میں لاتی تھی، لہذا شاعر کہتا ہے کہ ایسا گھوڑا، ایسی عورت اور ایسی تلوار کس نے دیکھی ہے۔ جو ہمیشہ ایک ہی کے پاس رہیں۔ مقصد یہ کہ یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں جن کو فاتح ہمیشہ ایک دوسرے سے چھینتے رہتے ہیں اور ان کی نسبت کبھی اطمینان نہیں کیا جاسکتا کہ کس کے پاس کتنے دنوں تک رہیں گی۔ مگر متوکل کے اس تلوار کا واقعہ زیادہ عبرت خیز ہے، اس لئے کہ اس نے گویا خاص اپنے ہی قتل کے لئے تلوار مول لے رکھی تھی، اور اپنے ایک غلام کو خود ہی اس کام پر مامور کردیا تھا۔ فقط

غلام الثقلین
نانکپوری



ایک - دو - تین!

"مغربی محاذ پر سکوت مطلق" کے مصنف کا ایک جدید ترین کارنامہ!

"زمانہ جنگ کا ایک دردناک افسانہ!"

از جناب ظفر قریشی دہلوی

باب اول

گرجا ایک برف بستہ جنگل کے آخری کونہ پر تھی۔ سنسان اور بھیانک جنگل جہاں دور دور تک کسی انسانی آبادی کا نظر آنا محال تھا۔

چاند کی ٹھنڈی کرنیں گرجا کی سیاہ پتھروں کی دیواروں پر پڑ رہی تھیں، ہر طرف سکوت مطلق طاری تھا۔ گرجا کے پیچھے دیودار کے درختوں کا ایک مہیب جنگل دامن کوہ تک چلا گیا تھا۔ وہ بھی سائیں سائیں کر رہا تھا۔ برف بستہ ہوا نے جنگل کو کرۂ زمہریر بنا رکھا تھا۔

گرجا کے اندر سرد و سخت مرمر کی صلیب کے سامنے دو زانو تھا۔ ہاتھ سینہ پر اور چہرہ اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا، آنکھیں بند اور لب متحرک تھے ——— وہ ایک قدسی حالت سرمدی میں تھا ——— وہ دعا کر رہا تھا اپنے لئے اور تمام دنیا کی بہبود کے لئے ——— وہ ایک پاکباز راہب تھا، عابد و زاہد! اس کے چہرے سے آثار ریاضت و عبادت آشکارا تھے یہ بتا رہا تھا کہ اس نے برسوں اس جنگل میں زہد و تقویٰ کی زندگی گذاری ہے ——— دنیا سے منہ موڑ کر، لذائذ الفاق اور حوائج انسانی سے مجتنب ہو کر ——— ایک سخت و تکلیف دہ راہبانہ زندگی، بے کیف و شوریدہ!

اس راہب کا نام گستف تھا۔ لوگ "اسے باپ" کہتے تھے۔ کیونکہ وہ ان سب کی روحوں کا محافظ اور ان کے اخلاق کا مدبر تھا ——— ایک معصوم و بے ضرر ہستی، مقدس و قابل تکریم!

"گستف باپ" قربانگاہ کے سامنے دو زانو تھا اور ایک خشک گلے سے اپنی پرخشوع دعا دہرا رہا تھا۔ گرجا کی ساکت دیواروں میں اس کی آواز ——— ایک خفیف ارتعاش کے ساتھ گونج رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کا گلا پڑ جاتا تھا اور وہ دعا کرتے کرتے رک جاتا تھا اس وقت قربانگاہ کے سامنے والی کھڑکی میں سے ماہتاب کی ٹھنڈی کرنیں براہ راست نکل کر مہتریں ہیکل لاہوتی پر پڑ رہی تھیں اور وہ چمک کر مقدس پادری کے بے رونق چہرے پر منعکس ہوتی تھیں جس سے یہ معلوم تھا کہ اس وقت نزول اجلال و احترام، اور یہ خدا کا برگزیدہ بندہ ملکوتی درجہ سے بھی متجاوز ہو گیا ہے۔

پادری کھانسا۔

اور کھانستا رہا کئی لمحے تک ——— اس کی دعا میں رخنہ پڑ گیا۔

یکایک۔ گرجا کا دروازہ بہت ہی آہستہ سے کھلا۔

ہوا کا ایک تند و سرد جھونکا برقی سرعت و قوت کے ساتھ شور مچاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ قربانگاہ کے قریب رکھی ہوئیں شمعیں فوراً بجھ گئیں۔ کمرہ میں کسیقدر تاریکی ہو گئی ——— سوائے اس چمکیلی منو

کے جو ماہتاب کی کرنوں سے پیدا ہو رہی تھی۔

پادری اُٹھ کھڑا ہوا، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ محسوس کیا کہ کوئی شے اندر داخل ہوئی ہے، کوئی شخص چرچراتے ہوئے جوتے پہنے اندر آ رہا تھا، آہستہ آہستہ۔

پادری متعجب ہوا، اس معاملہ کو نہ سمجھ سکا۔ اسکا سانس زور زور سے چلنے لگا "تم کون ہو؟" وہ بالآخر بولا۔

"ایک مفرور، میرے باپ!" ایک گلوگیر آواز نے جواب دیا

"خوش آمدید! میرے مسافر، میرے مفرور بیٹے!"

راہب نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے شمعیں پھر روشن کیں۔ گرجا کا اندرونی حرم پھر جگمگا اٹھا۔ پادری نے دیکھا کہ ایک سیاہ پوش شخص لرزتا، کانپتا، نڈھال اور مضمحل اندر آ رہا ہے —— اس کی جانب امداد کے لئے بڑھتا یا نہ بڑھ رہا ہے۔

مفرور کے جسم پر سیاہ لبادہ تھا، پھٹا ہوا اور گیلا۔ پشت پر ایک بندوق اور کمر میں کارتوسوں کی ایک پیٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے لب کانپ رہے تھے۔ پیروں میں بھی رعشہ تھا، سفر اور فرار کی تھکن اور دہشت چہرہ پر ہویدا تھی۔ وہ نیلا تھا خوف سے اور ایک سنگدلی ظاہر کر رہا تھا۔ پیروں میں ایک بھاری چمڑے کا موٹا جوتا اور سر پر نرم بالوں کی سیاہ ٹوپی تھی —— وہ کوئی سپاہی معلوم ہوتا تھا۔

مفرور نے پادری سے کہا "باپ! کیا تم اس وقت مجھے کچھ پینے کو نہیں دے سکتے؟ میں سردی سے کانپ رہا ہوں، میرا دل جیا جا رہا ہے!"

"میرے پاس بیر کی تھوڑی سی شراب ہے، وہ حاضر ہے میرے بیٹے، تیری سردی اگر اس سے جاتی رہے تو میں ابھی لائے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر پادری اپنی اس جھونپڑی میں چلا گیا جو گرجا کی پشت پر تھی۔ اسی جگہ وہ گنہگاروں کے "اعترافات" بھی سنتا تھا اور ان کی مغفرت کے لئے دعا کرتا تھا۔ یہیں اس کی رہائش کا بھی انتظام تھا۔

مفرور سردی سے کپکپا رہا تھا۔ وہ ایک کھڑکی کے قریب پہنچا اور شیشوں میں سے جھانکنا شروع کیا، وہ پلٹ آیا اور قربانگاہ کی طرف بڑھا۔ ایک شمع کے گرد اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلایا پھر سکیڑا اور منجمد رگوں کو حرارت پہنچانے لگا۔

پادری شراب لے آیا اور سینگ کے ایک پیالہ میں انڈیل کر مفرور کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "لو! میرے بیٹے! یہ حاضر ہے، خدا تمہیں سیدھی راہ چلائے!"

آدمی نے شراب پیکر پوچھا "باپ! کیا آپ کے ہاں آگ بھی ہے؟"

"نہیں، میرے بیٹے افسوس ہے، یہاں آج نہیں ہے۔"

آدمی بہت دیر تک چپ کھڑا رہا پھر زیر لب بولا:-

"میرے باپ، میری روح کے محافظ! میں نے سنا ہے کہ اگر کسی پادری کے سامنے انسان اپنے گناہوں کا من و عن اعتراف نہ کرے تو وہ جنت میں —— آسمانی بادشاہت میں کبھی داخل نہیں ہو سکتا —— اس پر مسیح کی لعنت ہوتی ہے، وہ کتے کی موت مرتا ہے —— اس لئے میرے باپ، میں تیرے پاس ایک گناہ کا اعتراف کرنے آیا ہوں تو اس قربانگاہ کے سامنے میری مغفرت کی دعا کر، میرے عفو کے لئے خدا سے کہہ وہ پاکباز راہبوں کی سفارشیں سنتا ہے، میں نے ایک گناہ عظیم کیا ہے! میں نے موسیٰ کے "دس احکاموں" میں سے پانچویں حکم کو توڑا ہے —— میں نے ایک آدمی کو **قتل** کیا ہے! اف! میرا رونگٹا رونگٹا اس خیال سے کانپ اٹھتا ہے، "خدا مجھے معاف کرے میں اعتراف کرتا ہوں، آہ! میری ناسمجھی!"

"کوئی جھگڑا ہو گیا تھا؟" پادری نے پوچھا

"نہیں، میرے معصوم باپ! میں نے بلاوجہ قتل کیا ہے بغض نہ تھا، جوش کی حالت میں میں نے اسے قتل کر دیا۔"

"میرے عزیز! تمہارا نام کیا ہے، تم نے بتایا نہیں؟"

"مجھے دوبر کہتے ہیں میں ایک جرمن ہوں، اگر آپ کہیں تو میں ایک وجہ قتل بھی پیش کر سکتا ہوں اگر وہ آپ کے نزدیک قابل قبول ہو۔ میں جنگل میں گذر رہا تھا، آج کل فرانس اور انگلستان کی

جنگ ہو رہی ہے، میں انگریزی چھاؤنی کے قریب سے گزر رہا تھا کہ سپاہیوں نے مجھے پکڑ لیا اور بند کر دیا۔ میں بھی ایک سپاہی ہوں، وہ سمجھے جاسوس ہوں۔ خیر، ایک رات میں ان کے کیمپ میں تھا کسی بدمعاش سپاہی نے میرے روپوں کا بٹوہ بھی چرا لیا۔ مجھے اور بھی غصہ آیا۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ اور میں ان درندوں سے بچنے کی تدبیر کرنے لگا۔ دو راتیں گزر گئیں۔ ایک رات سپاہیوں نے ایک معمولی فتح کی خوشی میں بہت شراب پی اور مدہوش ہو کر سو گئے۔ میرا نگراں بھی پڑا خراٹے لے رہا تھا میں خیمہ میں سے نکلا اور چپکے چپکے اس کے قریب پہنچا۔ گردن پکڑ کر زور سے بھینچی اور گھونسہ مارا وہ تڑپ کر مر گیا۔ پھر میں نے اس کی بندوق لی اور اندھیرے میں غائب ہو گیا ——— دیکھو! یہ بندوق وہی ہے" (اس نے لوہے کی نالی پر انگلی زور سے بجائی)۔

"پھر میں نے اپنے دل میں یہ سوچا کہ تو نے برا کام کیا ہے، ایک پادری کے پاس چل کر پوچھنا چاہیئے کہ یہ قتل کی ذیل میں آتا ہے یا نہیں۔ کیا جان کا بچاؤ فرض ہے یا نہیں؟ اگر میں نے گناہ کیا ہے تو میرے عفو کی دعا کیجئے ——— مگر میں بہت بھوکا ہوں کئی میل پیدل چل کر آ رہا ہوں۔ جب تک میں کچھ کھا نہ لوں اور کسیقدر سو نہ جاؤں ایک انچ آگے بڑھنے کی قوت نہیں ہے، خدا کے واسطے مجھے کچھ کھلاؤ میں بھوک سے مر رہا ہوں۔ مجھے کہیں سونے کی جگہ بھی بتاؤ۔ صبح میں چلا جاؤں گا۔ کل میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا"

وہ دوزانو ہو گیا اور راہب کے سیاہ جبہ کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا، چوما اور سرد آہ بھری۔

باب دوم

پادری نے، آگ روشن کی اور چند کپڑوں اور کمبلوں کو جمع کر کے ایک چھوٹا سا نرم بستر دو بیر کے لئے بنایا۔

مفرور کھانا کھا کر اس نرم گدے پر سو گیا، بے خبر۔

پادری رات بھر گرجا کی حفاظت کرتا تھا، جاگتا رہتا تھا اور غلام گردش سے لے کر جھونپڑی کے دروازہ تک ٹہلتا رہتا تھا۔

بالآخر صبح ہوئی۔ سورج ——— ایک آتشیں کرہ کی مانند غضبناک ہو کر نکلا۔ جنگل میں ایک سنہری دریا بہہ پڑا آفتاب کی زرد کرنوں نے برف پر چمک چمک کر ایک مہیب سماں پیدا کر رکھا تھا

مفرور ابھی سو رہا تھا۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔

دوپہر کو جب سورج دیودار کے طویل و بالا اشجار پر پہنچ گیا تھا پادری نے جنگل میں ایک سرسراہٹ دیکھی، ایک غبار اور پتوں کی جنبش۔ وہ باہر نکلا اور دور جا کر دیکھا اور لرزتا ہوا اندر داخل ہوا اور کمرہ میں پہنچکر مفرور کا شانہ پکڑ کر ہلایا اور کہا "میرے عزیز بیٹے! اب اٹھ! سپاہی تیری تلاش میں سرپٹ آ رہے ہیں۔ تو پکڑا جائے گا ورنہ جلد بھاگ جا، میں تجھے راہ فرار بتاتا ہوں۔ سمجھو!"

"باپ"، مفرور نے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے کہا "میں نے ابھی خواب دیکھا ہے کہ میں جنت میں داخل ہو رہا ہوں، آپ نے میرے گناہ بخشے جانے کی دعا کی ہے، یہ اور دعا کیجئے کہ میرا یہ خواب سچا نکلے!"

"میں اس کے لئے بھی خدا سے دعا کروں گا مگر اب تم رخصت ہو جاؤ، دیکھو اس طرف سے جانا، بالکل محفوظ راستہ ہے"

یہ کہہ کر پادری نے ایک طرف اشارہ کیا اور راہ دکھائی۔

اس نے پادری کا ہاتھ چوما، بندوق کندھے پر رکھی اور اپنا سامان لے کر باہر نکلا، نہایت آہستگی سے وہ جنگل میں غائب ہو گیا۔ بڑی دیر تک پتے کانپتے رہے۔

باب سوم

پادری گرجا کے قربانگاہ کے سامنے پھر دوزانو تھا، وہ رو رہا تھا اور دعا کر رہا تھا، بہ گناہ گار کی مغفرت و درگذر کے لئے۔

وہ ابھی اسی حالت سرمدی میں محو تھا کہ گرجا کا دروازہ چرچ سے کھلا اور درجن بھر وحشی صورت سپاہی دیوانہ وار اندر داخل ہوئے۔

وہ رک گئے۔ وہ چیخ رہے تھے اور غل مچاتے ہوئے آ رہے تھے مگر قربانگاہ کے سامنے اس جھکی ہوئی شکل کو دیکھ کر وہ جھجک کر

پیچھے ہٹ گئے اور ساکت کھڑے رہے۔ ایک ایک کر کے انہوں نے اپنی ٹوپیاں اتاریں اور سر دل کو جھکا لیا۔ وہ ہکا بکا نظر آتے تھے۔

جب گستف پادری نے اپنی دعا ختم کر لی تو وہ کھڑا ہوا اور ان کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر مخاطب کیا:-

"تم کون لوگ ہو؟ کیوں اس طرح داخل ہوئے ہو؟"

ایک لمحے تک گرجا میں سکوت مطلق طاری رہا۔ پھر سپاہیوں کے افسر کولاص نے پادری سے کہا کہ وہ ایک مفرور جاسوس کی تلاش میں یہاں آئے ہیں وہ ان کے ایک رفیق کو قتل کر آیا ہے اور وہ اُسے تلاش کر رہے ہیں۔

سپاہیوں نے فرش پر پیر رگڑ کر افسر کو اپنی جانب متوجہ کیا اور اشارہ پا کر اس نے پادری سے پوچھا "کیا وہ مفرور یہاں ہے؟"

"نہیں" اس نے جواب دیا۔

"کیا وہ آپ کے پاس آیا تھا؟"

پادری نے جواب نہیں دیا۔

ایک سپاہی نے فرش پر پڑی ہوئی کوئی شے جھک کر اُٹھائی اور خوشی سے چلاتے ہوئے کہا "دیکھو! وہ یہاں ضرور آیا تھا، میں اس بٹوہ کو خوب پہچانتا ہوں یہ اسی کا ہے اور وہ چھوڑ گیا ہے۔"

"خوب!" کولاص نے چیخ کر کہا "اب ہمیں ثبوت مل گیا، پادری صاحب بتائیے کہ وہ کہاں ہے؟ جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہم قوم کے لئے لڑ رہے ہیں اس لئے آپ کو جاسوس کی پشت پناہی نہ کرنی چاہیے نیز ایک قاتل کو بچانا کسی مسلک میں فرض نہیں۔"

پادری خاموش کھڑا تھا، اس کا چہرہ خوف سے زرد تھا وہ ان انسانی درندوں سے کیونکر نبٹ سکتا تھا۔

ایک اور آدمی پیچھے سے آگے بڑھا اور افسر کو پیچھے ہٹا کر ...... پادری کو مخاطب کیا "وہ ایک قاتل ہے، ہم انصاف کرنا چاہتے ہیں وہ یہاں ضرور آیا ہے اور اس نے آپ کے سامنے اعتراف معصیت کی رسم ادا کی ہوگی پس آپ یہ بتا دیجئے کہ اس نے کیا کہا تھا، اور وہ کہاں گیا ہے؟"

پادری نے جواب دیا "میرے اور میرے روحانی بیٹے کے درمیان خدا کو حاضر و ناظر جان کر جو باتیں ہوئی ہیں اس پر اس کلیسہ کے حرم کی مقدس مہر ثبت ہو چکی ہے پس میں قانوناً کسی کو وہ بات نہیں بتا سکتا ہماری شریعت میں گناہ ہے کسی کے راز کا معلوم کر کے فاش کرنا، پس مجھ سے اس کی توقع مت رکھو۔"

"ٹھیک ہے، ! بیشک'!" کولاص نے غراتے ہوئے کہا

ایک سپاہی نے کہا "بیشک کولاص، ان کا یہ فعل بالکل حق بجانب ہے کیونکہ کلیسہ کے حرم میں اس قسم کی کوئی کارروائی کرنی جائز نہیں اور پادری صاحب بالکل صحیح رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں"

"چپ رہو!" کولاص نے اپنے وقار کو مجروح ہوتے دیکھ کر کہا اور چلایا "تمہیں میرے کام پر اعتراض کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔"

وہ سپاہی، ایک خدا ترس آدمی، خاموش ہو گیا۔ وہ افسر کے آگے بے بس رہ گیا۔

"باپ! صحیح بات بتا دیجئے کیونکہ اس کے بغیر ——" اسی سپاہی نے کہا مگر "خاموش!" کی آواز پھر کولاص کے منہ سے نکلی اور وہ چپ ہو گیا۔

کولاص نے غصہ میں بھر کر حکم دیا "ایک پیٹی کھول کر مجھے دو"

ایک سپاہی نے پیٹی دیدی۔

پھر پادری سے کہا "ہاتھ اوپر کرو!"

گستف پادری نے دونوں ہاتھ نہایت منکسرانہ انداز سے اُٹھا لئے گویا دعا ہی کے لئے اُٹھائے تھے

افسر نے پادری کے دونوں ہاتھ باندھ دئیے اور گرہ باندھ دی پھر اپنی تلوار کی چرمی میان نکال کر اس پیٹی کے ایک حلقہ میں پرو کر اسے پادری کی کمر کے گرد زور زور سے کس کر باندھنا شروع کیا۔ پادری کا نازک جسم لرز رہا تھا، آخر یہ ہے اس پر کہ چمڑہ کھال میں پیوست ہو گیا مگر اس نے اُف تک نہ کی۔ بعض جگہ تو خون بھی بہہ نکلا۔

"اب بھی بتا دو!" افسر نے کڑک کر پادری سے کہا۔

گستنف پادری نے کچھ زیرِ لب کہا مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آیا
افسر پھر بولا "کیا کہا؟"

پادری نے جواب دیا "میرے بیٹے! تم مجھے عقیدہ کی جنگ میں کامیاب نہیں ہو سکتے، میں جس چیز کو صحیح تصور کر رہا ہوں اس کے لئے جان دینی کیا مشکل کام ہے، میری زندگی ہیچ ہے اگر شریعت کلیسہ کو بدنام کروں"

افسر یہ سنکر اور بھی برافروختہ ہوا اور پادری کے سینہ پر ایک گھونسہ مارا جس سے وہ نڈھال ہو گیا۔ اور لڑکھڑایا۔

دو چار سپاہی جو اپنے افسر کی نسبت کم متشدد تھے۔ اسپر سخت معترض ہوئے اور بڑ بڑائے مگر کچھ نہ کر سکتے تھے۔ پادری کے جسم اور سوجے ہوئے ہاتھ میں کئی جگہ خون نکل کر منجمد ہو گیا تھا اور وہ سخت درد و کرب کی حالت میں آنکھیں بند کئے سر ہلا رہا تھا۔
افسر نے کہا "اگر تم نے ہمارے سوال کا جواب نہیں دیا تو گولی مار دی جائے گی"

"میں نہیں بتا سکتا" گستنف پادری نے مضمحل انداز میں کہا
"باہر لے چلو" افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا۔
پادری کو باہر لایا گیا اور ایک درخت سے باندھ دیا گیا۔
آسمان لرز اٹھا۔ ایک طرف ملکی خدمت کا اندھا دھند جوش تھا اور دوسری طرف دانشمندی کا تقاضہ، بے گناہ پادری کی معصومیت پھر مصلحت وقت اور آئین جنگ تھا ساتھ ہی ساتھ کلیسہ کا احترام تھا۔

وہ نڈھال درخت سے بندھا کھڑا تھا۔
شام ہو چلی تھی۔ آسمان پر بادل آرہے تھے۔ جنگل میں ایک بھیانک تاریکی اور دہشتناک خموشی پھیل رہی تھی۔ ہوا۔ درختوں میں سیٹیاں بجاتی ہوئی گزر رہی تھی۔
پادری نے آنکھیں کھولیں اور دنیا پر ایک نگاہِ آخریں ڈالیں۔ آہ! وہ دنیا جس کی لذتوں سے جس کی آرامیدہ آسائشوں سے اپنے آپ کو ہمیشہ جدا رکھا تھا، ایک راہبانہ زندگی بسر کی تھی۔ عبادت و ریاضت، کی بے کیف زندگی۔

باب چہارم

پادری نے اپنے نحیف ہاتھ سر کے اوپر اٹھائے اور آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا کر کئی منٹ تک دیکھا اور پھر مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے چہرہ پر ایک طلسمی انقلاب نظر آرہا تھا ایک ملکوتی نور، ایک قدسی ضوفشانی، تابناکی اور سرخی!
سپاہیوں میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ بعض سخت ناراض نظر آرہے تھے۔

"کیا اب بھی صحیح واقعہ سے ہمیں مطلع کر سکتے ہو؟" افسر نے پھر پادری سے پوچھا۔

"میں کیونکر بتا سکتا ہوں! میرے عزیز!"

افسر نے پھر اس کے منہ پر طمانچہ مارا۔ سپاہیوں میں بغاوت پیدا ہونے کی کچھ دیر نہ تھی ہر ایک کا دل اس تھرا دینے والے نظارہ سے بیٹھ رہا تھا وہ سمجھ رہے تھے کہ ان پر قہر نازل ہوگا۔

ایک بہادر آدمی نے آگے بڑھ کر کہا "پادری صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ ایسے مواقع پر آپ اگر بتا دیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ بتا دیں"

گستنف پادری نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ حکم ہوا۔ سپاہی ۴،۴ کی قطار میں کھڑے ہوئے اور افسر کے حکم سے مختلف فاصلوں پر پادری کی "صلیب" کے گرد جمع ہو گئے۔ اور کندھوں پر بندوقیں رکھ لیں،

پادری نے آنکھیں کھولیں اور پھر بند کر لیں۔
افسر نے حکم دیا "جب میں "تین!" کہوں سب گولی چلا دیں!!!"
"**ایک!**" افسر نے چیخ کر کہا اور پھر پادری کا شانہ ہلا کر کہا "اب بھی بتا دو!"

معلوم نہ ہو سکا کہ پادری نے یہ حکم امتناعی سنا بھی یا نہیں۔
———— "دو!" ———— "بولو؟"
پادری کا سر ایک جھٹکا کھا کر سینہ پر گر پڑا اور وہ کچھ کہنے لگا۔ شاید دعا کر رہا تھا۔

افسر پیچھے جا کھڑا ہوا

"ٹھہرو!" کسی گلوگیر آواز نے جنگل کی خاموشی کو توڑا۔ ٹھہرو! ٹھہرو! میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں، میں مفرور ہوں، میرا نام دو تیر ہے، پادری کی جان کیوں لیتے ہو؟"

"تین!" افسر نے آواز کی طرف توجہ نہ کرتے ہوئے کہا۔ سپاہیوں نے حکم سنتے ہی بندوقیں داغ دیں۔ گویا ایک ہی آواز تھی۔ تمام جنگل گونج اٹھا — اور پہاڑوں میں کئی منٹ تک ہوا اور آواز بازگشت گھومتی رہی۔ منظر حد درجہ المناک تھا۔ دوتیر اس بوچھاڑ کی زد میں آ چکا تھا۔ وہ لڑکھڑایا اور پادری کے قریب آ کر گر پڑا — مضمحل اور سرد — مردہ

باب پنجم

افسر نے مردہ مفرور کی لاش کو ٹھکراتے ہوئے کہا میں نہیں سمجھ سکتا اسے جنگل میں نکلنے کی کیا ضرورت تھی، ہم تو مایوس ہو ہی چکے تھے! اگر یہ نہ نکلتا اور خود اپنی قضا نہ بلاتا تو ہمیں کیا ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی! پتہ نہیں اس نے پادری کے بچانے کے لئے کیوں اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالا! — پادری کے جسم کو کھول کر گرجا میں رکھو — مجھے خدا معاف کرے! میں اسے صرف دھمکانا چاہتا تھا کہ وہ بتا دے۔ مگر اس نے نہ مانا، بیوقوف تھا سمجھا نہیں خدا اسکی بھی مغفرت کرے اور مجھے بھی معاف کرے۔ میرا ارادہ اسے چھوڑ دینے کا تھا۔ "جوزف! دو قبریں کھودنے کا انتظام کرو!"

روحِ ظرافت!

مرتبہ

منشی محمد ہادی علی صاحب کوثر وارثی رامپوری

گڑ میں ملا کے مجکو وہ زہر دے رہے ہیں ❊ اے دوستو! بتاؤ میں کھاؤں یا نہ کھاؤں		کہوٹا میرٹھی
مار ڈنڈ ولہ چھوڑ دیتا عشق کے اظہار پر ❊ شکر کر مجنوں کہ لیلیٰ کا کوئی بھائی نہ تھا		حکیم لکھنوی
ہم نے کتنے تاجروں کا بوجھ ہلکا کر دیا ❊ وہ ہوا دیوالیہ جس کے منیجر بن گئے		سامری غازیپوری
باپ ماں فاقہ سے تھے جس روز میں پیدا ہوا ❊ بس اسی اک بات سے کہتے ہیں رمضانی مجھے		کہوسٹ جالندھری
پیشہ لیا تھا عمر سے ہم نے چمار کا ❊ پھر بھی نہ ٹانکنے کو ملا بوٹ یار کا		آبرار
حاضر ہوا نہ حشر میں اچھا نبٹ گیا ❊ اس غیر حاضری میں مرا نام کٹ گیا		وجاہت جھنجھانوی
اعمال نامہ میرا فرشتوں سے کھو گیا ❊ صد شکر ہوگا حشر میں کیونکر حساب اب		لا اعلم
دفعہ ۳۴ میں چالان ہوا خوب پٹے ❊ پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانے سے		حکیم لکھنوی
بفضلِ خدا ہوں میں ایسا دلیر ❊ سمجھتا ہوں بلی کو مانندِ شیر		لا اعلم
کوئی تدبیر وصلِ یار بھی لکھتے تو ہم کہتے ❊ چچا سعدی نے سب کچھ لکھ دیا اپنی گلستاں میں		سٹریٹ بدایونی
باہم شب وصال غلط فہمیاں ہوئیں ❊ مجکو پری کا شبہ ہوا اُن کو بھوت کا		لا اعلم
کسے لگاؤ گے تم تیر مر گیا عاشق ❊ وہ فاختہ نہ رہی اب غلیل خاں کیلئے		ذکی لکھنوی
عشق میں پہلے نظر آتی تھی آسانی مجھے ❊ مشکلیں ایسی پڑیں یاد آ گئی نانی مجھے		کہوسٹ جالندھری
چرائیں ہمیں گھانس بھی ہمیں لائیں ❊ ہمیں یاد تیری گدھیا نے مارا		باٹپ بدایونی
لاش پر سادہ مزاجوں نے ملا کا فور ہے ❊ نہ آغ بگلا بن گیا میت پہ ڈھیروں لگ رہی		زاغ بدایونی
مجرد سب سے اعلیٰ ہے ❊ نہ جورو ہے نہ سالا ہے		مجرد رامپوری



حادثہ شام کی [illegible]

۷۲

جناب پروفیسر محمد یوسف صاحب سلیم بی اے کے نقطۂ نظر سے میر کے ۷۲ نشتروں کا انتخاب

(خاص برائے عالمگیر سالانہ نمبر)

تمہید مدت سے آرزو تھی کہ میر کے ضخیم دواوین کا انتخاب کروں اور اس انتخاب میں سے (۷۲) ایسے اشعار الگ جمع کروں جن پر نشتروں کا اطلاق وارد ہو سکے۔ خدا کا شکر ہے کہ امسال یہ آرزو پوری ہوگئی۔ انتخاب کلام کے ساتھ ایک مبسوط مقدمہ شامل کرنا چاہتا ہوں، اس لئے اس کی اشاعت میں تو ابھی کچھ دیر لگے گی لیکن اس "دو آتشہ" کے لئے مقدمہ کا التزام چنداں ضروری نہیں معلوم ہوتا، اسی لئے خدا کا نام لے کر یہ اشعار اُن ارباب ذوق کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جنکے سینے پر میر کے نشتروں کو چُن چُن کر جگر میں رکھ لینے کے لئے ہمیشہ بیتاب رہتے ہیں۔ ع گر قبول افتد زہے عز و شرف

اگرچہ میر کے کلام میں ایسے اشعار جنہیں "نشتر" سے تشبیہ دی جاسکتی ہے بہتر سے کہیں زیادہ ہیں، لیکن میں اس معاملہ میں "سلف صالحین" کے نقش قدم پر چلنا پسند کرتا ہوں اور کسی "بدعت" کا مرتکب ہونا نہیں چاہتا۔ گویا تعین تعداد کا جواز "تقلید سواد اعظم" میں مضمر ہے وَکُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ

یہ ضروری نہیں کہ میرا انتخاب ہر شخص کو پسند آئے ابتک جسقدر انتخابات شائع ہو چکے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کے متعلق اعتراضات وارد نہ کئے گئے ہوں اسپر نہ حیرت ہے نہ شکایت کیونکہ ہر شخص کا مذاق جداگانہ ہوتا ہے، علاوہ بریں ایک ہی شے مختلف افراد پر مختلف تاثرات پیدا کرتی ہے۔ انتخاب کلام عموماً انتخاب کرنے والے ہی کے مذاق سخن کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

بہرکیف اس کوشش سے میر کی عظمت شاعری ضرور پیش نظر ہو جاتی ہے کیونکہ جب تک کسی شاعر کے کلام میں غیر معمولی جاذبیت نہ ہو، اسے مسلسل توجہ نصیب نہیں ہوسکتی۔ دلدادگان شعر و سخن، ابتدا ہی سے میر کے کلام میں سے "نشتر" منتخب کرتے چلے آئے ہیں، متعدد انتخابات شائع ہو چکے ہیں لیکن دلچسپی کا ہنوز وہی عالم ہے۔

ممکن ہے بعض نکتہ سنج یہ فرمائیں کہ جب "نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ" تو انتخاب شائع کرنا چہ معنی دارد؟ ہر شخص میر کے دواوین سے "بقدر ظرف" بہرہ اندوز ہوسکتا ہے" اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ فرمانروایان اقلیم سخن کے حضور میں خراج تحسین ادا کرنے کا ایک مناسب طریق یہ بھی ہے کہ مختلف افراد اپنی اپنی استعداد کے موافق اُن کے منتخب کلام کو ارباب علم و فضل کے سامنے پیش کریں۔ اسطرح شعراء کی خوبیوں کے مختلف پہلو نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔

ذکر میر میر محمد تقی نام میر تخلص غالباً ۱۱۲۵ھ میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ تذکروں میں والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے لیکن "ذکر میر" میں میر صاحب نے اس امر کی تصریح نہیں کی ہے صرف اسقدر بیان کیا ہے کہ "میرے والد نے جو میرے دادا کے چھوٹے بیٹے تھے درویشی اختیار کی اور ترک دنیا کر کے بیٹھ رہے۔ شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی سے علوم ظاہری و باطنی حاصل کئے۔ جوان صالح اور عاشق پیشہ تھے علی متقی کے عرف سے مشہور ہوئے"

میر کے دادا آگرہ میں فوجداری کے عہدہ پر ممتاز تھے اور چونکہ خاندانی لحاظ سے سید تھے اس لئے شہر میں کافی عزت تھی، میر نے اس خاندانی وجاہت کی طرف اشارہ بھی کیا ہے:-

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

جبکہ میر کی عمر صرف دس سال کی تھی، ان کے والد کا انتقال ہوگیا، گویا ہوش سنبھالتے ہی "دنیا" کا شکار ہو گئے اور تمام عمر اس پیرزال کے افسوں سے رہا نہ ہو سکے۔ ان کے بڑے بھائی حافظ محمد حسن نے ان کے ساتھ "برادران یوسفی" کا سا برتاؤ کیا، باپ کے ترکہ میں سے ایک حبہ نہ دیا۔ کچھ دنوں تک میر صاحب بھائی کے ٹکڑوں پر بسر کرتے رہے لیکن رفتہ رفتہ انہیں اپنی ذلت کا احساس ہوا اور یہیں سے ان کی "الم دوستی" کا آغاز سمجھنا چاہیئے یہ سچ ہے کہ بعض خصائص، انسان اپنی ماں کے پیٹ سے لیکر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ماحول اور حوادث روزگار کا بھی اس کی طبیعت پر بڑا اثر ہوتا ہے اور کسی ذکی الحس انسان کو بدوشعور کے بعد پے درپے بعض مصائب کا سامنا کرنا پڑ جائے، تو وہ عموماً (pessimish) الم دوست اور یاس مشرب ہو جاتا ہے، مشہور جرمن فلسفی شوپنہار (Schopeuheur.) اس نظریہ کی زندہ مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔

القصہ میر صاحب نے ترک وطن کو مناسب خیال کیا اور ۱۱۵۰ھ کے لگ بھگ دلی آگئے۔ یہاں ایک دوست کی وساطت سے نواب صمصام الدولہ کی سرکار میں ملازمت مل گئی لیکن یہ تو مقدر ہی نہ تھا کہ میر صاحب چین اور آرام کے ساتھ زندگی بسر کرتے؟

دور ہے چین سے اک لحظہ ہمیں شک ہے تسلیم
ترک بیداد تو اس شوخ کا شیوہ ہی نہیں

۱۱۵۱ھ میں خدا کا قہر نادر شاہ کی صورت میں ہندوستان کی صورت پر نازل ہوگیا۔ نواب موصوف مقابلہ کے لئے نکلے اور پہلے ہی مقابلہ میں قید حیات سے آزاد ہوگئے

میر صاحب دوبارہ یتیم ہوگئے۔ دلی خود یتیم تھی وہ کیا کسی یتیم کی پرورش کا بار اٹھاتی؟ مجبوراً میر صاحب آگرہ واپس چلے گئے اور چند سال جوں توں کر کے وہاں گزارے غالباً اسی زمانہ، قیام میں حضرت عشق علیہ الرحمہ نے ان کی نوجوانی پر ترس کھا کر انہیں اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا ہوگا۔ حکیم اسپنوزا (Spinoza.) ناکام ہو کر فیلسوف ہوگیا، میر صاحب اس مرتبہ پر پہونچکر شاعر ہو گئے۔ یوں کہئے کہ شاعر اور فلسفی دو مختلف الفاظ ہیں لیکن فی الحقیقت دونوں کا مرتبہ ایک ہے۔ دونوں "اپنی زبان" میں اہل دنیا سے "کچھ" کہتے ہیں اور اسی کو مدعائے حیات سمجھتے ہیں۔

جب درسیات عشق سے فراغت پائی تو ان کے "علم و فضل" کا گلی کوچوں میں شہرہ ہونے لگا، لہذا جیسا کہ ماہرین فن کا دستور ہے، "تلاش معاش کے پردہ میں" "دیار حبیب" سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے، اور ایسے نکلے کہ پھر جانا نصیب نہیں ہوا۔

ملا کی دوڑ مسجد تک، پھر دلی آگئے اور اس مرتبہ خان آرزو کے یہاں مقیم ہوئے۔ چند روز گذرے ہوں گے کہ ان کے بڑے بھائی کو جو شقاوت قلبی میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا یہ حال معلوم ہوا اس نے خاں صاحب کو لکھا کہ حضرت آپ کا خون اسقدر سفید ہوگیا کہ میرے سگے بھائی کے ساتھ آپ ایسی محبت سے پیش آتے ہیں شاید ایام جاہلیت میں ایسا ہوتا ہو "کلجگ" میں تو یہ طریق عمل مناسب نہیں ہے" اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خانصاحب بھی بیچارے میر کے درپے آزار ہوگئے

اس کج خلقی اور غیر متوقع سرد مہری نے میر صاحب کی طبع نازک پر بہت برا اثر ڈالا، مہینوں دیوانوں کی سی حالت رہی اور ملنا جلنا بلکہ باہر نکلنا سب یک لخت موقوف ہوگیا۔ سچ ہے جب اپنے پرائے ہو جائیں تو پھر کس پر اعتماد کیا جائے؟

کچھ عرصہ کے بعد جب طبیعت کو ذرا سکون ہوا تو قوت لایموت کی خاطر ایک رئیس رعایت خاں نامی کی مصاحبت اختیار کر لی لیکن یہ سلسلہ بھی ناپائیدار ثابت ہوا، کسی بات پر ناراض

ہوکر ملازمت ترک کردی اور دوبارہ خانہ نشین ہوگئے۔ اس واقعہ کے تھوڑے دنوں بعد یعنی سنہ ۱۱۷۰ھ کے قریب احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا سلسلہ شروع ہوا، اس کے ساتھ ساتھ مرہٹوں اور جاٹوں نے دلی اور اس کے گرد و نواح میں لوٹ مار شروع کردی ان آفات کی وجہ سے دلی ویران ہوگئی اور ہزاروں خاندان خانماں برباد ہوگئے۔ میر صاحب نے فلک کج رفتار کی نیرنگیوں کا یہ تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس دہر فانی کی بے ثباتی کا نقشہ دل پر جم گیا۔

سنہ ۱۱۹۰ھ میں جبکہ ان کی عمر ۶۰ سال کی تھی مجبور ہوکر ترک وطن پر آمادہ ہوئے یہ افتاد میر سے مخصوص نہ تھی، دلی میں جسقدر باکمال تھے سب یونہی منتشر ہوگئے تھے۔ لکھنؤ شاہان اودھ کی فیاضی کی وجہ سے مرجع خلائق بنا ہوا تھا۔ آصف الدولہ نے بہت قدردانی کی اور ہمیشہ ان کے حال پر عنایت فرماتے رہے"

لکھنؤ آکر اگرچہ اُن کے سوز دروں میں کمی نہیں ہوئی لیکن ایک حد تک آسودگی ضرور نصیب ہوگئی۔ پیری و صد عیب ایک مشہور مثل ہے لیکن جن لوگوں کی جوانی پریشانی میں گذرتی ہے ان کی پیری "قابل دید" ہوتی ہے چنانچہ میر صاحب نے اپنی حالت بدیں الفاظ بیان کی ہے۔ "اس زمانہ میں میرا مزاج ناساز رہتا ہے یاروں کی ملاقات ترک کردی ہے۔ بڑھاپا آ پہونچا اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں کچھ دنوں آنکھ کے درد کی تکلیف اُٹھائی، ضعف بصر سے عینک لگائی دانتوں کے درد کا کیا ذکر کروں، دل کڑا کر کے ایک ایک کو جڑ سے اکھڑوا دیا غرضکہ ضعف قویٰ پیدا ہے۔ ناتوانی دل شکستگی اور آزردہ خاطری سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہوں گا اور زمانہ بھی رہنے کے قابل نہیں رہا ہے اسقدر آرزو ہے کہ خاتمہ بالخیر ہو"

شاعری میر صاحب کا مشغلۂ حیات تھا، محویت کا یہ عالم تھا کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر رہتے تھے چنانچہ آزاد کہتے ہیں کہ لکھنؤ کے ایک نواب، میر صاحب کو مع عیال و اطفال اپنے گھر لے گئے۔ اور محلسرا کے پاس ایک معقول مکان رہنے کو دیا۔ نشست کے مکان میں کھڑکیاں باغ کی طرف تھیں لیکن کئی برس تک وہ کھڑکیاں اُسی طرح بند رہیں کبھی کھول کر باغ کی طرف بھی نہ دیکھا ایک دن کوئی دوست آئے انہوں نے کہا جناب اسی لئے تو نواب صاحب آپ کو یہاں لائے ہیں کہ سیر باغ سے آپ کا دل بہلتا رہے" یہ سنکر میر صاحب نے غزلوں کے مسودوں کی طرف اشارہ کر کے کہا حضرت میں تو اس باغ کی سیر میں ایسا لگا ہوا ہوں کہ اس کی خبر بھی نہیں"

میر صاحب نے سنہ ۱۲۲۵ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا ناسخ نے تاریخ وفات کہی "واویلا مرد شہ شاعراں" ان کا مزار عیش باغ لکھنؤ میں عرصہ تک زیارت گاہِ خاص و عام رہا لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد "زائرین" کا رخ مقابر سے "دفاتر" کی طرف پھر گیا مجبوراً بی این ڈبلیو ریلوے نے میر صاحب کی خاک کو اپنی نگرانی میں لے لیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج نشان قبر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ ہلاک حسرت پابوس کے لئے، پامال راہ ہونا مقدر تھا وہی ہوکر رہا۔ میر کی قبر سلامت رہتی تو تعجب کی بات تھی!!!

ہنرمندوں کو اس کی ضرورت بھی نہیں کہ ان کا نشان قبر سلامت رہے۔ صاحبان کمال کا مزار تو سینہ ہائے عارفاں میں ہوتا ہے۔ جبتک اُردو زبان زندہ رہے گی میر کا نام بھی زندہ رہیگا۔ وہ تو خود ہی فرما گئے ہیں:-

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

انداز میر جس طرح ہندوستان کے گویوں میں کسی راگنی کے سروپ پر اتفاق آراء بہت مشکل سے ہوتا ہے اور راگنیوں کی "چال" کے متعلق ہمیشہ آپس میں جنگ رہتی ہے اسی طرح طبقہ شعراء میں کسی خاص شاعر کے متعلق تمام اساتذۂ فن کا متفق الرائے ہونا نوادرات میں سے ہے لیکن میر کی استادی میں کسی کو کلام نہیں سب نے انہیں "خدائے سخن" اور غزلگو شعراء کا امام تسلیم کیا ہے۔ ذیل میں بعض مسلم الثبوت شعراء کے خیالات ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں:-

غالب:۔ ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

سودا:۔ سودا تو اس زمیں میں غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھکو میر سے استاد کی طرح

اثر:۔ بے شک کوئی ولی تھا اثر میر نکتہ سنج
سب شاعروں سے خاص ہے اس باخدا کا رنگ

رند:۔ تیرا کلام کتنا مشابہ ہے میر سے
عاشق ہیں ہم تو رند اسی بول چال کے

شیفتہ:۔ نرالی سب سے ہے اپنی روش اے شیفتہ لیکن
کبھی دل میں ہوائے شیوہ ہائے میر پھرتی ہے

حالی:۔ حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

جلال:۔ کہنے کو جلال آپ بھی کہتے ہیں وہی طرز
لیکن سخن میر تقی میر کی کیا بات ؟

مصحفی:۔ اے مصحفی تو اور کہاں شعر کا دعویٰ
پھبتا ہے یہ انداز سخن میر کے اوپر

ذوق:۔ نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ میر کے کلام میں وہ کون سی بات ہے جس نے اُسے خدائے سخن بنادیا؟ اور سودا و مصحفی غالب و ذوق سبکو اس کی تحسین میں رطب اللسان کردیا؟ ذوق کے نزدیک وہ چیز "انداز بیان" ہے، یہ انداز یا اسلوب کسی کو نصیب نہ ہوا - اسمیں شک نہیں کہ انداز بیاں یا اسلوب بیان ہی وہ چیز ہے جو سننے والے کو تڑپا دیتی ہے اور نظم کو نثر سے ممتاز کرتی ہے - انداز کی مختلف صورتیں یا قسمیں ہیں اور ہر شاعر کا انداز جداگانہ ہوتا ہے چنانچہ دیکھ لیجئے غالب کا انداز بیاں اور ہے - ذوق کا انداز بیاں اور ہے مومن کا انداز بیان اور ہے - میر کا انداز بیان اور ہے - غالب اور میر کے انداز بیان ہی میں اختلاف کی وجہ سے غالب کے بیشتر اشعار پڑھکر ان فرہنگ انجمن آرا یا شرح اشارات کی ورق گردانی پر مائل ہوتا ہے اور میر کے بیشتر اشعار پڑھکر بے اختیار سر دُھننے لگتا ہے - غالب کے یہاں خیال بندی، دقت پسندی، فارسی تراکیب، نازک خیالی مضمون آفرینی اور استعارہ سے کام لیا گیا ہے اور انہی کے مجموعہ کا نام غالب کا انداز بیان ہے - میر کے یہاں سوز و گداز درد و غم، کرب والم، واردات قلب، معاملہ بندی، محاکات اور عاشقانہ جذبات کا دور دورہ ہے اور انہی کے مجموعہ کا نام میر کا انداز بیان ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو شے میر کے کلام کو جملہ شعرا کے کلام سے ممتاز کرتی ہے وہ یہی سوز و گداز ہے جو بقول علامہ شبلی شاعری اور علی الخصوص غزل سرائی کی جان ہے میر کے علاوہ اور شعرا نے بھی سوز و گداز کے مضامین باندھے ہیں لیکن بقول ذوق میر کا سا انداز کسی کو نصیب نہ ہوا اسی لئے اشعار میں وہ تاثیر پیدا نہ ہوسکی -

ذوق اس لئے شعر کہتے ہیں کہ انہیں کوئی محاورہ باندھ کر دکھانا ہے مثلاً:-

اشک کے قطرے جو مژگاں پر اکٹھے ہو گئے
خوشۂ انگور کے بھی دانت کھٹے ہو گئے

ظاہر ہے کہ یہ شعر جذبات عاشقانہ کا آئینہ دار نہیں محض محاورہ کا عملبردار ہے

نصیر اس لئے شعر کہتے ہیں کہ کسی سنگلاخ زمین کو پامال کرنا ہے غیر مانوس قوافی استعمال کرکے فریق ثانی پر اپنی شاعری کا سکہ جمانا ہے مثلاً:-

"خال پشت لب شیریں ہے عسل کی مکھی
اُڑ ح نسر طائر سیٹ ہن کے جبل کی مکھی"

فی الجملہ ان اشعار سے مکھیاں اُڑانے کے سوائے اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا -

انشا اس لئے شعر کہتے ہیں کہ بادشاہ وقت کا تقرب مدنظر ہے اور مصحفی پر چوٹ کرکے ہنگامہ گرم کرنا مقصد حیات ہے - مثلاً

توڑوں گا خم بادۂ انگور کی گردن
رکھ دوں گا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن

باب عقل جانتے ہیں کہ یہ شاعری نہیں بلکہ قافیہ پیمائی ہے
سخ اس لئے شعر کہتے ہیں کہ ثقیل الفاظ کو شعر میں کھپانا چاہتے
یا مثلاً :-

مل گیا ہے عشق کا آزار قسمت سے مجھے
ہوں جو عیسیٰ بھی ارادہ نہ ہو استعلاج کا

ں شعر کو پڑھ کر اس کے سوائے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ استعلاج
خاطر یہ تکلیف مالا یطاق برداشت کی گئی ورنہ کہاں عیسیٰ کہاں مرض عشق
اناسخ ؟

لیکن میر اس لئے شعر کہتا ہے کہ جذبۂ دل اسے شعر کہنے
مجبور کرتا ہے۔ ذوقِ، صبا، جرأت اور غلیل وغیرہ کی شاعری،
شاعروں اور درباروں یا سامعین کی "واہ واہ" "سبحان اللہ"
ے دم سے قائم تھی : نمونہ ملاحظہ ہو :-

ریر :- لڑائی وصل میں اس کا بدن سے ہونے والی ہے
کٹاری گلبدن کے پائجامے سے نکالی ہے
رنگ کندن سا تمہارا ہے عجب کیا ہے اگر
طوطیٔ سبزۂ خط سونے کی چڑیا ہو جائے
تبا :- ملتا ہے گلرخوں سے دل اس لور کے لئے
ہر پھول میں مٹھاس ہے زنبور کے لئے
کہتی ہے روح بیاب افلاک دیکھ کر
اس ہفت خواں سے ہے گزر پستانِ نسرین

یکن میر اس وقت بھی شعر لکھتا اگر کوئی بھی سننے والا یا داد دینے
ا ہوتا۔ ان بزرگوں نے آرائشِ محفل کے لئے شاعری کے کوچے
ں قدم رکھا میر نے واردات قلبی کے بیان کرنے کی خاطر شعر
،، یہ لوگ زبان کو مانجھتے تھے۔ میر سوز دردِ دل کا اظہار کرتا تھا،
ں کے لئے شاعری ذریعۂ افتخار تھی میر کے لئے مشغلۂ حیات،

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

میرے ہموطن اور غائبانہ مشفق بابو سیام موہن لعل جگر
بی اے نے کیا خوب لکھا ہے کہ "وہ بات جس سے میر کو یہ مرتبہ
حاصل ہوا صرف تاثیر ہے۔ جو اہل نظر شاعری کو ترجمانِ عاشقی اور
تاثیر کو شاعری سمجھتے ہیں میر کو شعرائے اردو کا سرتاج مانتے ہیں۔
تاثیر ایک وسیع لفظ ہے جس کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں۔ کلام میر کا
مطالعہ اس حقیقت کو ذہن نشین کر دیتا ہے کہ تاثیر خستگیٔ دل سے
پیدا ہوتی ہے نہ کہ دماغی سعی و کاوش سے اور یہ بات مسلم ہے
کہ خوشی کو غم میں وہ درجہ حاصل نہیں جو غم کو ہے۔ بزم سرور
اک سامانِ مسرت ضرور ہے لیکن اس مسرت کا اثر اتنا گہرا اور
شدید نہیں ہوتا جتنا کسی دلگداز سانحہ کا کسی شخص کو بیٹے کی ولادت
پر اسقدر خوشی حاصل نہیں ہوتی جتنا غم اس کی جوانا مرگی پر ہوتا ہے
میر خود فرماتے ہیں :-

شادی و غم میں جہاں کے ایک سے دس کا ہے فرق
عید کے دن ہنسیئے تو دس دن محرم روئیے

غم میں یہ اثر اس لئے ہے کہ کارساز عالم نے تہذیب نفس و
تزکیۂ باطن کی مصلحتیں اس میں پوشیدہ رکھی ہیں۔ میر کی رگ
رگ میں زہر غم ساری تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ سوز و غم نے میر کے
قالب میں جنم لیا تھا تو زیادہ مبالغہ نہیں :

کیا کروں شرح خستہ جانی کی
میں نے مر مر کے زندگانی کی

یہی باعث ہے کہ میر کے نشتر بے پناہ ہیں۔

وہ الفاظ کے لئے خیال نہیں پیدا کرتے بلکہ جذبات و تاثرات
کے لئے الفاظ چنتے ہیں، اور ترکیب و ترتیب میں وہ اسلوب
پیدا کرتے ہیں جو ایک طرف شعر کو مؤثر اور دوسری طرف موسیقی
سے ہم آغوش کر دیتا ہے۔ مثلاً

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

میر کے کلام کی ممتاز خصوصیتیں درد، سادگی، صفائی، لوچ اور گھلاوٹ
ہیں درد محبت کا، سادگی احساس عبودیت کا، صفائی استعداد

فطری کا، اور لوچ اور گھلاوٹ موسیقی کا کرشمہ ہیں۔ یہ اُن کے سکون دماغی کا فیض تھا کہ وہ اپنے عمیق سے عمیق خیالات کو اور نازک سے نازک جذبات کو بآسانی سمجھ لیتے تھے اور نہایت سادہ پیرایہ میں بیان کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اد ہر میر کا شعر سُنا، اد ہر دل میں نشتر چُبھا" (ماخوذ از کلام میر مطبوعہ زمانہ ماہ جولائی ۲۹ء)

نہ دردمندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ
قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد

اس کی وجہ یہ ہے کہ آنکھ کھول کر مصیبت ہی مصیبت دیکھی۔ دس سال کی عمر میں باپ کا انتقال ہوا۔ بڑے بھائی نے برادرانِ یوسفی کا سا برتاؤ کیا۔ مجبوراً عنفوانِ شباب ہی میں تلاش معاش کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ دلی میں جبتک رہے ایک نہ ایک مصیبت لاحق حال رہی۔ خانِ آرزو نے بھی اچھا سلوک نہ کیا۔ روزی کا مستقل ٹھکانا نہ تھا آج گھر میں اناج تو کل نانِ شبینہ کو محتاج۔ بعض اوقات فاقوں کی نوبت پہونچ جاتی تھی :-

نامرادانہ زیست کرتا تھا ؛ میر کی وضع یاد ہے ہمکو
بہت سعی کیجے تو مر رہئے میر ؛ بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

پھر دلی کی بربادی، شرفا اور نجبا کی تباہی، آئے دن کے انقلاب مرہٹوں اور جاٹوں کی دستبرد، یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور قلم سے لکھا۔

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

اس پر طرہ یہ ہوا کہ ان کے دل پر ابتدا ہی سے عشق کا چرکا لگ چکا تھا اور عمر بھر یہ زخم مندمل نہ ہوا۔ اگرچہ یہ ایک ایسا راز ہے کہ عام طور پر مشہور نہیں لیکن صاحب بہار بےخزاں نے اس کو کسی حد تک فاش کر دیا ہے؛

"بشہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ تعشق طبع و میل خاطر داشت۔ آخر عشق او خاصۂ مشک پیدا کردہ میخواست کہ بخیہ بجا رسوے رسوائی می کند و حسن بے پردہ بجلوہ گری درآید، از ننگ افشائے راز وطن اقربا با دل بغل پرورده حسرت و حرماں و با خاطر ناشاد و دست دگریباں قطع رشتۂ حب وطن ساختہ از اکبرآباد بعد از خانہ بر انداز بیا لبشہر لکھنؤ رسید و ہمیں جا بعد حسرت جانکاہِ جلا وطنی و حرماں نصیبی از دیدار یار و دیار، جاں بجہاں آفریں داد تا بقید رشتۂ حیات بود طوقِ محبت بگردن و سلسلہ دیوانگی بپا داشت از کلام عاشقانہ و اشعار درد انگیزش پیدا است کہ صد ہزار آرزو بخاک بُردہ" میر صاحب کے بعض اشعار سے بھی اس واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ان کے بعض اشعار سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے فن شعر کو اپنی عاشقانہ جذبات کے اظہار کے لئے اختیار کیا تھا، جو رفتہ رفتہ ان کا مستقل مشغلہ حیات بن گیا۔

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
وہی آخر کو ٹھیرا فن ہمارا

میر صاحب کے سوز و گداز کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ایک تو انہوں نے طبیعت ہی دردمند پائی تھی، دوسرے عشق کا چرکا لگ گیا گویا

"سمند ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا"

اگر میر کے دواوین کو اس نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوسکتا ہے کہ عشق و عاشقی میں، ایک انسان کے دل پر جو کیفیات وارد ہوسکتی ہیں وہ سب اشعار کے پردہ میں بیان کر دی گئی ہیں ان کی بدولت ایک سمجھدار آدمی، عاشقوں کی زندگی کا نفسیاتی مطالعہ بآسانی کر سکتا ہے۔ مُشتے نمونہ از خروارے یہ بھی سہی:-

(۱) میر نے دل لگا کر کبھی سُکھ نہ پایا، کوئی گھڑی راحت کی نصیب نہ ہوئی

لگا نہ دل کو کہیں کیا سُنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا
پہونچا تو ہوگا سمع مبارک میں حال میر
اس پر بھی جی میں آئے تو دل کو لگائیے

(۲) اگرچہ ساری عمر فراق یار ہی میں بسر ہوئی لیکن راز" افشا

نہیں کیا۔ اللہ رے سمائی!! یہاں تو کیفیت ہے کہ جب تک حالِ دل احباب سے بیان نہ کرلیں، چین نہیں پڑتا۔

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میرؔ کو وصلِ جاناں نصیب نہ ہوا دنیا سے ناشاد نامراد ہی گئے:

نامرادی کی رسم میرؔ سے ہے ✦ طور یہ اس جوان سے نکلا

اگرچہ میرؔ کو اپنے محبوب کی لگن لگی رہتی تھی لیکن جانتے تھے کہ ہر دم یاد کرنے سے اسکا خیال اس طرح رگ و پے میں سرایت کر جائیگا کہ پھر اُسے دل سے بھلا دینا، ناممکن ہو جائے گا

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان! پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

تنگ آ کر میرؔ بانیِ رسمِ عاشقی کو بد دعا دینے لگتے ہیں، یہ بات بھی عین فطرت کے مطابق ہے۔

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

ہوش سنبھالتے ہی میرؔ کسی کی زلف پیچاں کے اسیر ہو گئے تھے اور بقیہ عمر اسی اضطراب میں گذری

نمود کرکے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میرؔ بھی اک بلبلہ تھا پانی کا

دل دینے کے بعد اک طرفہ مصیبت کا سامنا ہوتا ہے، انسان (عاشق) چونکہ اس مصیبت کا خوگر نہیں ہوتا اس لئے ابتدا میں بہت گھبراتا ہے لیکن آگے چل کر اسقدر مصائب درپیش ہوتے ہیں کہ ان کا معرضِ بیان میں لانا دشوار ہے:

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھنا ہوتا ہے کیا؟

عاشق کی کوئی مراد پوری نہیں ہوتی، کم از کم میرؔ تو نامراد ہی گئے

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا

عاشق کی زندگی مسلسل آہ و زاری کی ایک المناک داستان ہوتی ہے

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا!

عاشق اگر مندر یا مسجد میں جاتا ہے تو وہاں بھی خیالِ یار سے غافل نہیں ہوتا:۔

طوفِ حرم میں بھی میں بھولا نہ تجھکو اے بُت
آتا تھا یاد تو ہی میرا خدا ہے شاہد

عاشق کی نظر میں، موت، اس کی محبت کو ختم نہیں کر سکتی:۔

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

عاشق اکثر حسرتِ دیدار اپنے ساتھ قبر ہی میں لے جاتا ہے:۔

ہوا جس کے لئے اس کو نہ دیکھا
نہ سمجھے میرؔ کا کچھ مدعا ہم

عاشق پہلے تو آرزوئے وصال میں جینے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ لیکن جب ایک مدت تک پے در پے صدمے اُٹھاتا ہے تو بے اختیار کہتا ہے کہ دل لگاتے ہی موت آجاتی تو اچھا ہوتا:۔

ہوتا نہ دل لگانا یہ سرانجام عشق میں
لگتے ہی جی کے مر گئے ہوتے بلا سے ہم

عاشق کو چار آنسو بہانے سے تسکین نہیں ہوتی بلکہ اور مضطرب ہوتا ہے وہ چاہتا ہے کہ خوب روئے تاکہ دل کی بھڑاس نکل جائے اور یہ بالکل قدرتی بات ہے:۔

متصل روتے ہی رہئے تو بجھے آتشِ دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

محبت میں، عاشق کو سمجھانا غضب ہے، جسقدر سمجھاؤ اسیقدر اشتیاق زیادہ ہوتا ہے:۔

کہنے سے میرے اور بھی ہوتا ہے مضطرب
سمجھاؤں کب تک اس دلِ خانہ خراب کو

عاشق، ایک مدت تک روتے رہنے یا اس کی یاد میں تڑپنے یا اس کے خیال سے باتیں کرنے کی بدولت پھر ان باتوں کا خوگر ہو جاتا ہے اور ان باتوں سے اس کا دل بہلنے لگتا ہے۔

کر لیجئے بہ رو رو کے تو اوقات کیونکر گذر سکے
رہتا ہے مشغلہ سا بارے غم و الم سے

عاشق بہرحال انسان ہے اور انسان بالطبع جویائے راحت ہے اس لئے مسلسل صدمے اور پیہم تکالیف اُٹھانے کے بعد کہیں خوگرِ جفا ہوتا ہے۔

کیا کیا تعب اُٹھائے کیا کیا عذاب کھینچے
تب دل ہوا ہے اتنا خوگر ترے ستم سے

عاشق کو کبھی کبھی عشق میں چپ سی لگ جاتی ہے، زبان کسی سے بات نہیں کرتا۔

نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایت
کہو میر جی آج کیوں ہو خفا سے

عاشق کی حالت زار دیکھ کر دوسروں کا دل بھر آنا بالکل قدرتی بات ہے:

میر صاحب رلا گئے سب کو
کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

عاشق کے سامنے اگر کوئی شخص اس کے محبوب کا نام لیتا ہے تو وہ سنتے ہی تڑپ جاتا ہے اور اس کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگتی ہے، بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

کٹے ہے دیکھئے یوں عمر کب تک اپنی
کہ سنئے نام ترا اور چشم تر کر لے

عاشق وصال یار کی ہر چند کوششیں کرتا ہے لیکن کامیابی درکنار امید بھی نظر نہیں آتی۔

بہت سعی کیجے تو مر رہئے میر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

عاشق جب بہت آشفتہ حال ہو جاتا ہے، جب مدتوں تک مورد آفات و بلیات رہتا ہے تو کبھی کبھی گھبرا کر کہنے لگتا ہے کہ:۔

پژمردہ اسقدر ہیں کہ ہے شبہ ہم کو میر
تن میں ہمارے جان کبھی تھی بھی یا نہ تھی

عاشق کو خواہ کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہونچے لیکن وہ یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ دفع تکلیف کا ایسا پہلو اختیار کرے جس میں اغیار کو

محبوب سے قربت نصیب ہو جائے۔

ہنگامہ میری نعش پہ تیری گلی میں ہے
لیجائیں گے جنازہ کشاں یاں سے کب مجھے!

عاشق حد درجہ شکی مزاج ہوتا ہے، وہ اپنے معشوق کو خدا کی بھی سپرد نہیں کرنا چاہتا۔

غیروں کا ساتھ موجب صد وہم ہے بتاں
اس باب میں خدا بھی کہے تو نہ مانئے

عاشق مرنے سے جان نہیں چُراتا لیکن محض امید وصال کی وجہ سے زندگی کا خواہشمند ہوتا ہے

اس آرزوئے وصل نے مشکل کیا جینا مرا
ورنہ گزرنا جان سے اتنا نہیں دشوار ہے

میں نے صرف ایک دیوان سے سرسری طور پر اسقدر اشعار پیش کر دیئے، اگر مزید کاوش کی جائے تو ایک مستقل مضمون اسی مضمون پر لکھا جا سکتا ہے۔

میر نے اپنے اشعار میں تمام تر اپنے ہی سوز دروں کا اظہار کیا ہے۔

جہاں سے دیکھئے اک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیوان میں

میر نے اپنا جگر خون کر کے اشعار کہے ہیں:۔

مصرع کوئی کوئی کبھی موزوں کروں ہوں میں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

میر تلاش سکون کی خاطر شہر بشہر پھرلئے لیکن "اداسی" ہر جگہ ساتھ رہی

لکھنؤ، دلی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اداس
میر کو سرگشتگی نے بیدل و حیراں کیا

میر نے جوانی میں کوئی صدمہ ایسا کاری اپنے دل پر اُٹھایا تھا کہ مدۃ العمر اس کا اثر زائل نہ ہوسکا۔

کچھ رنج دلی میر جوانی میں کھنچا تھا
زردی نہیں جاتی مرے رخسار سے اب تک

میر کی زندگی ہی میں ان کے اشعار کی قدر ہو گئی تھی لوگ ان میں سے اپنی اپنی پسند کے موافق انتخاب مدون کر لیتے تھے، انتخاب بہرکیف قبول عام کی دلیل ہے:۔

اشعار میر سب نے چن چن کے لکھ لئے ہیں
رکھیں گے یاد ہم بھی کچھ باتیں چیدہ چیدہ

میر کے کلام کی شہرت انکی زندگی ہی میں ہو گئی تھی:

دکھن اُتر پورب پچھم ہنگامہ ہے سب جاگہ
اُدھم میرے حرف و سخن نے چاروں اور مچایا ہے

میر کو اپنے کلام کے پُرتاثیر ہونیکا یقین تھا کہ وہ اسی کلیہ سے واقف تھے کہ "آنچہ از دل می خیزد بر دل می ریزد"

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سُنئے گا
پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیروں سر کو دُھنئے گا

میر کو صدمات ہجر نے "بیدماغ" اور "زود رنج" بنا دیا تھا۔

گل نے بہت کہا کہ چمن سے نہ جائیے
گلگشت کو جو آئیے آنکھوں پہ آئیے
میں بیدماغ کر کے تغافل چلا گیا
وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اُٹھائیے؟

میر کو شہرت نصیب ہوئی لیکن حسب لخواہ انکے کلام کی قدر نہ ہوئی:۔

مربوط کیسے کیسے کہے ریختے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

انداز بیان جی چاہتا ہے کہ ناظرین، میر کے انداز بیان سے بخوبی واقف ہو جائیں اس لئے ذیل میں چند اشعار ایسے نقل کرتا ہوں، جن کے مطالعہ سے میر کے انداز بیان کا نقشہ نگاہوں میں پھر جائے۔ طوالت ہوگی، لیکن بقول آزاد "پیارے کی ہر بات پیاری ہوتی ہے"

مژہ پہ رکھا ہے رنگ اب تلک ✤ ہزار آفریں چشم خونبار کو
عشق میں ہم نے جانکنی کی ہے ✤ کیا محبت نے دشمنی کی ہے
لوگوں نے پائی راکھ کی ڈھیری مری جگہ ✤ اک شعلہ میرے دل سے اُٹھا تھا، چلا گیا

* غالب:۔ اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھکو بعد قتل ✤ میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے۔
مومن:۔ غیر آ کر قریب خانہ رہا ✤ شوق اب تیرے آنے کا نہ رہا۔

دیکھیں کب تک رہے ہے یہ بھنڈ ✤ گالیاں کھائیے دُعا کریئے
اجڑے نگر کو دل کے دیکھو تعجب کیوں ہو ✤ اب پھر بسیگی ایسی بستی خراب کیونکر
شہر میں گھر خراب ہے اپنا ✤ آتے ہیں یاں اب اس نشاں سے لوگ
مبارک تمہیں میرؔ ہو عشق کرنا ✤ بہت ہم تو پچھتائے دل کو لگا کر
وفا لوگ آپسمیں کرتے تھے آگے ✤ یہ رسم کہن آہ تم نے اُٹھا دی
رہتے ہو تم آنکھوں میں پھرتے ہو تمہیں دل میں ✤ مدت سے اگرچہ یاں آتے ہو نہ جاتے ہو
بلبل کو موا پایا کل پھولوں کی دکان پر ✤ اس مرغ کے بھی جی میں کیا شوق چمن کا تھا؟
وہ دن گئے کہ اٹھکر جاتے تھے اس گلی میں ✤ اب سعی چاہیئے ہے بالیں سے سر اُٹھاتے
آگ تھی ابتدائے عشق میں ہم ✤ اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ
ایک سب آگ ایک سب پانی ✤ دیدۂ و دل عذاب میں دونوں
منصور کی حقیقت تم نے سنی ہی ہوگی ✤ جو حق کہے ہے اسکو یاں دار کھینچتے ہیں
جنوں تیری منت ہی مجبیر کہ تو نے ✤ نہ رکھا مرے سر پہ بار گریباں
مقصود کو تو دیکھیں کبتک پہنچتے ہیں ہم ✤ بالفعل اب ارادہ ہے تا گور ہے ہمارا

ان اشعار کے ملاحظہ سے بخوبی ثابت ہوسکتا ہے کہ میرؔ کے یہاں محض آہ و بکا، گریہ و زاری یا نوحہ خوانی نہیں ہے بلکہ بات کے کہنے کا ڈھنگ ایسا دلپذیر ہے کہ سنتے ہی شعر دل میں اُتر جاتا ہے یعنی سوز و گداز کے ساتھ ساتھ اسلوب بیاں بھی ایسا دلکش ہے کہ غالب اور مومنؔ بھی اس باغ کے خوشہ چین نظر آتے ہیں۔

بہتر نشتر اب ہم میرؔ صاحب کے بہتر نشتر، اپنی پسند کے موافق، ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:-

ہر ذرہ خاک تیری گلی کا ہے بیقرار ✤ یاں کون سا ستم زدہ ماٹی میں مل گیا
یک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا ✤ قصہ یہ کچھ ہوا دل غفراں پناہ کا
دلکی ویرانی کا کیا مذکور ہے ✤ یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
پوشیدہ رازِ عشق چلا جائے تھا سو آج ✤ بیطاقتی نے دلکی وہ پردہ اٹھا دیا
دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے ✤ پچھتاؤگے سنو ہو! یہ بستی اُجاڑ کر
دم آخر ہے، بیٹھ جا، مت جا ✤ صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں
متصل روتے ہی رہیئے تو بجھے آتش دل ✤ ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں
عشق کیا کیا ہمیں دکھاتا ہے ✤ آؤ تم بھی تو اک نظر دیکھو

ہائے اس زخمی شمشیر محبت کا جگر ٭ درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو
حسرت وصل و غم ہجر و خیال رخ دوست ٭ مر گیا میں پہ مرے جی میں رہا کیا کیا کچھ
یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم ٭ جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے
نہ رکھی مری خاک بھی اس گلی میں ٭ شکایت مجھے ہے نہایت صبا سے
سحر پائے گل بے خودی ہم کو آئی ٭ کہ اس سست پیماں میں بو تھی کسو کی
اپنی خبر بھی ہمکو اب دیر پہنچتی ہے ٭ کیا جانئے یار اسکو کب تک خبر کرینگے؟
شاید کہ خون دلکا پہنچا ہے وقت آخر ٭ تھم جاتے ہیں کچھ آنسو رہ رہ کے آتے آتے
جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے ٭ اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے؟
آئے بھی ترے عشق سے کھینچے تھے درد و غم ٭ لیکن ہماری جان پہ ایسی بلا نہ تھی
کہاں تلک شب و روز آہ درد دل کہیے ٭ ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے؟
پہنچا تو ہوگا سمع مبارک میں حال میر ٭ اس پر بھی جی میں آئے تو دلکو لگائیے
دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا ٭ ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے
چاک پر چاک ہوا جوں جوں سلایا ہم نے ٭ اس گریباں ہی سے اب ہاتھ اٹھایا ہم نے
مصائب اور تھے پر دل کا جانا ٭ عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے
تھی چشم دم آخر وہ دیکھنے آوے گا ٭ سو آنکھوں میں دم آیا پر وہ نہ نظر آیا
روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات ٭ اب یہی روزگار ہے اپنا
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے ٭ دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا ٭ سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
ہوئیں رسوائیاں جسکے لئے چھوڑا دیار اپنا ٭ ہوا وہ بے مروت بے وفا ہرگز نہ یار اپنا
سب گئے ہوش و تاب و صبر و تواں ٭ دل سے اک داغ ہی جدا نہ ہوا
کس طرح جی سے گذر جاتے ہیں آنکھیں موند کر ٭ دیدنی ہے دردمندوں نے بھی مرنے کی طرح
جدائی کے حالات میں کیا کہوں ٭ قیامت تھی اک ایک ساعت کی ماند
پوچھیں ہیں شور گریہ کو تیں جو مجھ سے لوگ ٭ کیا دیکھتے نہیں ہیں سب اس بے وفا کا رنگ
تربت میر پہ چلے تم دیر ٭ اتنی مدت میں واں رہا کیا خاک
یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے ٭ سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم
اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے ٭ دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں
چمن میں جاکے بھرو تم گلوں سے جیب و کنار ٭ ہم اپنے دل ہی کو ٹکڑوں سے خوں لبالب ہیں
پر خوں ہے یہ دل سے کہتی ہے تو شاید ٭ شاید کلی تجھے بھی اس گل کی آرزو ہو
ہمیشہ چشم ہے نمناک ہاتھ دل پہ رہے ٭ خدا کسی کو بھی ہم سا نہ دردمند کرے

آغاز تو ہے یہ کچھ سوتے ہیں خون ہر دم ٭ کیا جانئے عاشقی کا یارو مآل کیا ہے
چھاتی جلا کرے ہے سوز دروں بلا ہے ٭ اک آگ سی لگی ہے کیا جانئے کہ کیا ہے
ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن ٭ سینہ میں جیسے کوئی دلکو ملا کرے ہے *
عشق آدم میں نہیں کچھ چھوڑتا ٭ ہولے ہولے کوئی کھا جاتا ہے جی
جو خواہش نہ ہوتی تو کاہش نہ ہوتی ٭ ہمیں جی سے مارا تری آرزو نے
پھر اس سال سے پھول سونگھا نہ میں نے ٭ دیوانہ کیا تھا مجھے تیری بو نے
دیدنی ہے شکستگی دل کی ٭ کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
عشق بھی ہم ہیں لئے تصرف کیسے کیسے کرتا ہے ٭ دلکو داغ جگر کو زخمی آنکھوں کو خونبار کیا
بھرے رہتے ہوں کہ ہم پھول ہی جیسے گریباں میر ٭ وہ کیا جانیں کہ گری میں جگر کے تیر دامن میں
کیسی وفا و الفت کھاتے عبث ہو قسمیں ٭ مدت ہوئی اٹھا دیں تم نے یہ ساری رسمیں
رہا تھا دیکھ ادھر میر چلتے ٭ عجب اک ناامیدی تھی نظر میں
قصور اپنی ہی طول عمر کا تھا ٭ نہ کی تقصیر اس نے تو جفا میں
ہے دور ادب سے تم کفر میں یاں کشیدہ ہو ٭ مت آئیو جنازے کی میرے نماز کو
پہلے دیوانے ہوئے پھر میر آخر ہو گئے ٭ ہم نہ کہتے تھے کہ صاحب عاشقی تم مت کرو
کڑھتے ہمیشہ رہتا دل کو بغیر اس کے ٭ کیا روگ عاشقی نے جی کو لگا دیا ہے
جب کہ کچھ ہو جاتے ہو آنکھیں بھر بھر لاتے ہو ٭ میر گزرتی ہے کیا جی پر کچھ تو کہو ہوا کیا تم
دل کی کچھ تقصیر نہیں ہے آنکھیں اس سے لگ گئی یاں ٭ میر کہو کیوں مجھکو کس ظالم سے جا لڑیاں
ہم فقیروں کو کچھ آزار تمہیں دیتے ہو ٭ یوں تو اس فرقہ سے سب لوگ دعا لیتے ہیں
جان جہان سے گذرا میں میر جنکی خاطر ٭ تیغیں نکلتی ہیں وے میرے مزار سے بھی
دل کی نہیں ہماری ایسی تمہیں ہوا میسر کبھی ٭ کیا سنبھلیگا میر ستمکش وہ تو غم کا مارا ہے
فرصت ہے کم یہاں کی یاں بات نہیں کچھ کہنی ٭ آنکھیں کھولو کان جو کھولو بزم جہاں افسانہ ہے
خواہش دل ہے جی کی تاب گئی ٭ آنکھیں اس سے لگیں سو خواب گئی
اسے ڈھونڈنے میر کھوئے گئے ٭ کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف
دیکھی تھیں ایک روز تری مست انکھڑیاں ٭ انگڑائیاں ہی لیتے ہیں جب سے خمار میں
کافر کا بھی رویہ ہوتا نہیں ہے ایسا ٭ ٹھوکر لگا کے چلنا کس دین میں روا ہے

* شیفتہ :- شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ ٭ اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی
حالی :- عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید ٭ خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا
سودا :- عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف ٭ دلکو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے

تیرے بندے ہم ہیں خدا جانتا ہے ✦ خدا جانے تو ہمکو کیا جانتا ہے
وہ بیوفا نہ آیا بالیں پہ وقتِ رفتن ✦ سو بار ہمنے دیکھا سر کو اُٹھا اُٹھا کر
اُس سے گھبرا کے جو کچھ کہنے چلا آتا ہوں ✦ دل کی پھر دل میں لئے چپکا چلا جاتا ہوں
بیتابئ دل نہ دفن ہوا کاش میرے ساتھ ✦ رہنے نہ دیگا نعش کو کوئی دن مزار میں
گھر کو اس کے خراب ہی دیکھا ✦ جس کے یہ چشم و دل مشیر ہوئے
لب پہ مرے آکر بارہا پھر پھر گئی ✦ جان کو یہ اضطراب دیکھئے کبتک رہے
آنے کی وقت تم تو کہیں کے کہیں رہے ✦ اب آئے تم تو فائدہ؟ ہم ہی نہیں رہے
وہ دن گئے کہ آٹھ پہر اس کے پاس تھے ✦ اب آگئے تو دو رسی کچھ غم سُنا گئے
راہ آنسو کی کب تلک تکیئے ✦ خون دل ہی کا اب مزہ چکھئے

خاتمہ ان اشعار کو پڑھکر معلوم ہوتا ہے کہ میر نے "اپنی غزلوں میں زور کہیں نہیں مارا"، زبان کی سادگی مصرعوں کی بندش، اور طرزِ ادا، سب باتیں یہ بتاتی ہیں، کہ میر نے شعر کے پردہ میں سوز دروں اور کیف باطنی کا اظہار کیا ہے، جس کے لئے کسی کاوش کی ضرورت نہیں اور بقول بابو شیام موہن لعل صاحب جگر "زور مارنا" ہی انداز میر کے منافی ہے، زور تو وہ مارے جس کے دل میں کچھ نہ ہو، یا اگر ہو تو اس میں لب تک آنے کی قابلیت نہ ہو، میر کے یہاں نہ لفظوں کا طلسم ملیگا نہ صنائع و بدائع کا انبار، کیونکہ ان کے پاس جذبات کا وہ ذخیرہ ہے، جو بذاتِ خود دلوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے "آپ بیتی" بیان کرنے والے کو آرائشِ کلام کی احتیاج نہیں ہوتی، کیونکہ دل سے نکلی ہوئی ایک بات طلسم لفظی کے انباروں سے زیادہ وقیع اور موثر ہوتی ہے۔ ع

حاجتِ مشاطہ نیست روئے دلآرام را

فقیر یوسفؒ سلیم عفی عنہ

"کوئی"

از جناب شاہد مرزا کیانی

ہوش کی کچھ دوا کرے کوئی
بات سمجھے خدا کرے کوئی

موت سر پر ہے سامنے وہ ہیں
اب بتاؤ تو کیا کرے کوئی

موسم گل میں دست ساقی سے
پھول لیکر پیا کرے کوئی

کیا بڑی بات ہے بُرا کرنا
ہو سکے تو بھلا کرے کوئی

ہیں ہزاروں خدا زمانے میں
کسکے آگے جُھکا کرے کوئی

ذہن سے دل میں وہ اُتر آئیں
فکر کو یوں رسا کرے کوئی

ہم بنیں گے کسی کے کیا دشمن
اپنا دشمن ہوا کرے کوئی

اُن کا محفل میں بیٹھنا یہ ہے
درد بنکر اُٹھا کرے کوئی

آرزو ہے تو بس یہی اپنی
ہم مریں اور جیا کرے کوئی

اپنی حالت بگڑ چکی اب تو
رحم کھائے خدا کرے کوئی

ہم تو بندے رضا کے ہیں شاہد
ظلم ہم پر کیا کرے کوئی

صرف خریداران عالمگیر کیلئے

بجائے تین روپے بارہ آنے کے ایک روپیہ آٹھ آنے میں!

علامہ ابن القیم کی معرکتہ الآرا عربی تصنیف کا اردو ترجمہ!

حجم پونے آٹھ سو صفحات

منیجر رسالہ عالمگیر لاہور کی طرف سے ایک ضروری اعلان

علامہ ابن القیم کا مرتبہ علم و ادب میں جسقدر بلند ہے۔ اس سے تمام دنیائے اسلام بوجوہ احسن واقف ہے مسئلہ تقدیر جیسے اہم اور ضروری مسئلہ پر آپنے عربی زبان میں ایک بلند پایہ اور ضخیم کتاب کتاب التقدیر کے نام سے لکھی، جسکا اردو ترجمہ لاہور کے ایک نامور پبلشر مولوی کرم بخش صاحب میونسپل کمشنر مرحوم نے بڑے اہتمام سے بصرف زر کثیر کرایا۔ کتاب طبع ہونے پر شائقین اور مرتبہ دان علامہ ابن القیم نے ہزاروں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ خریدی، افسوس کہ مولوی صاحب برضائے الٰہی راہی ملک بقا ہوئے۔ اسکے بعد اس کتاب کا کسی نے اشتہار نہ دیا اب ہمارے پاس صرف دو ہزار کے قریب اسکی جلدیں موجود ہیں، اور ہمنے اسکو جلد از جلد فروخت کردینے کیلئے اسکی قیمت پونے چار روپے کی بجائے صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصولڈاک کردی ہے ورنہ اسکا اشتہار اس سے پیشتر بھی سوا تین روپے اور پونے چار روپے کا عالمگیر میں شائع ہوچکا ہے۔ یہ رعایتی یا برائے نام قیمت

صرف عالمگیر کے مستقل خریداروں اور ان اصحاب کیلئے ہے، جو رسالہ عالمگیر کو ایجنٹ حضرات سے خریدتے ہیں
چونکہ کتاب کی یہ رعایتی قیمت **بالکل مفت کے** برابر ہے، اسلئے اسکا بہت تھوڑے عرصہ میں ختم ہوجانا یقینی ہے، اگر آپ
بھی اس قابل دید کتاب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی فرمائش خریداری بھیجدیجئے، ہمیں یقین ہے کہ اس کتاب
کو وہی **خوش قسمت اصحاب** حاصل کرسکیں گے، جو اعلان ہذا ملاحظہ فرماتے ہی فرمائش خریداری بھیجدینگے
ورنہ ختم ہونے کے بعد دس روپیہ میں بھی ہم اس کو نہ بھیج سکیں گے۔

واضح رہے، کہ کتاب نہایت دلچسپ ہے، اور ایسے عمدہ پیرایہ میں لکھی گئی ہے، کہ آپ کو ختم کئے بغیر چین نہ آئیگا، اور جو
لوگ علامہ ابن القیم کی بلند پایہ شخصیت و قابلیت سے واقف ہیں، وہ تو جانتے ہی ہیں، کہ جو کتاب علامہ ممدوح کے
زور قلم سے لکھی گئی ہو، وہ موتیوں سے تول کر لینے کے قابل ہے، یہ سطور محض ان حضرات کیلئے لکھی گئی ہیں، جن
کی نظروں سے علامہ ممدوح کی کسی تصنیف کا کوئی اردو ترجمہ نہیں گذرا،

یقین جانئے کہ اس گرانقدر کتاب کے **پونے آٹھ سو صفحات** میں ایسے گراں قیمت اور بیش بہا موتی بکھرے
پڑے ہیں جن کی قیمت کا اندازہ صرف مرتبہ دان علامہ ابن القیم ہی لگا سکتے ہیں،

آج سب سے پہلی فرصت میں کتاب کی خریداری کیلئے کارڈ بھیجکر اس لاجواب اور
ہنگامہ پرور کتاب حاصل کیجئے اور اس بڑی بھاری رعایت سے فائدہ اٹھائیے ورنہ

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی!

جلد بندھی ہوئی کتاب کی قیمت دو روپے

علاوہ محصول ڈاک

نیازمند

مینیجر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور

ایک طبع زاد افسانہ

بیوی کا فوٹو

از جناب سعید احمد صاحب اکبرآبادی مولوی فاضل منشی فاضل فاضل دیوبند

جمیل کو اپنی بیوی جمیلہ سے محبت تھی اور ہونی بھی چاہئے تھی، درحقیقت جمیلہ چیز ہی ایسی تھی کہ جمیل نہ صرف محبت بلکہ اس کی پرستش کرتا اور اس کی بارگاہ حسن وجمال میں عشق ومحبت کے تحائف بھیجا کرتا۔ وہ چاند جیسا حسین و دلفریب مکھڑا، غزالان ختن کی سی بڑی بڑی آنکھیں، صہبائے سرور سے مخمور و مدہوش، شرم وحیا کے کاجل سے سرگین، اور شباب کی چمک سے برق فشاں لعل ویاقوت کو شرما دینے والے لب، پھول کی پنکھڑی سے زیادہ نرم ونازک بلوریں گردن، چوڑی اور کشادہ پیشانی، کالی اور ناگن کی طرح سوسوبل کھانے والی زلفیں، گھٹا کو گھٹا دینے والے سیاہ بال، رنگ ایسا صاف کہ دیکھے سے میلا ہو جسم ایسا سڈول کہ دیکھتے رہنے کو ہی جی چاہے، الغرض جمیلہ اپنے حسن و شباب کی پرکیف رعنائیوں اور ناز وادا کی لطف افروز رنگینیوں کے باعث ایک مجموعۂ رنگ وبو، ایک پیکر حسن ولطافت، اور ایک مجسمۂ زینت وجمال تھی اور پھر اس حسن خداداد کے ساتھ باطنی محاسن بھی اسمیں کم نہ تھے، لائق و فائق، بامروت باحیا، عصمت انتما، عفت مآب، مطیع و فرماں بردار، اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مشرقی خصوصیات کی پوری پوری علمبردار تھی۔

جمیل اور جمیلہ کو رشتۂ ازدواج میں بندھے ہوئے ایک سال ہوچکا ہے، شادی کے دن سے آج تک وہ ایک دن کیلئے جمیلہ سے جدا نہیں ہوا۔ آج اس کیلئے یہ پہلا موقع ہے کہ وہ جمیلہ اپنے دل کی مالک اور اپنی جان سے زیادہ پیاری جمیلہ سے جدا ہو رہا ہے اور شاید زیادہ دنوں کیلئے! علی گڈھ سے ایف۔اے پاس کرنے کے بعد جمیل کا داخلہ لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں ہوچکا تھا، آج اسکو اپنے وطن اجمیر سے لکھنؤ کیلئے روانہ ہونا ضروری ہے کیونکہ پرسوں اس کی حاضری قطعی ہے۔ جمیل کا دل تو گرفتار جو ہجر وفراق کی جانکاہیوں اور شبہائے فرقت کی صبر آزما بے چینیوں سے بیگانہ محض تھا، جمیلہ کی اس غیر متوقع جدائی کی تاب کس طرح لاسکتا تھا، وہ بادیدۂ گریاں و دل بریاں جمیلہ کے پاس گیا، اور اس کو اپنی آغوش محبت میں جذب کرکے کہنے لگا کہ لکھنؤ جانا ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر میرا مستقبل تاریک ہوا جاتا ہے۔ وہاں اتنے دنوں تم کو دیکھے بغیر کس طرح صبر کرسکونگا لاؤ اپنا ایک فوٹو کھنچوا لینے دو، کہ نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی۔ اسے میں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا، جب کبھی تمھاری یاد آئیگی اسے دیکھ دیکھ کر دل بہلاؤنگا اور اس طرح اپنے قلب فرقت زدہ کیلئے کچھ سامان تسکین مہیا کرسکوں گا۔

جمیلہ کی مشرقی فطرت وطبیعت نے فوٹو کھنچوانے کو گوارا نہ کیا اور اس نے جمیل کی التجا کا جواب بصورت انکار دے دیا، جمیل بھلا کب ماننے والا تھا، اس نے بیحد اصرار کیا، اور یہاں تک کہا، کہ اگر تم اپنا فوٹو نہیں دوگی تو میں لکھنؤ کا ارادہ ملتوی کردوں گا، اس کا انجام خواہ کچھ ہی ہو، بالآخر جمیلہ کو بادل نخواستہ اس پر رضامند ہونا پڑا، جمیل اپنے کسی دوست کا کیمرہ لے آیا، اور جمیلہ کو ایک اندازِ خاص کے ساتھ بٹھاکر اس کا فوٹو لے لیا، خود ہی اس کو دھویا، صاف کیا، اور پھر سفری بکس کی تہ میں بڑی احتیاط سے اس کو رکھ دیا۔

لکھنؤ پہونچکر جمیل اپنی تعلیم میں مصروف ہوگیا، چونکہ آدمی تھا ملنسار اسلئے کالج کے اکثر طلبا اس کے شناسا ہوگئے، لیکن سب سے زیادہ جن سے بے تکلفی اور دل لگی تھی وہ گنتی کے صرف تین تھے، خلیل، انوار، شاکر ایکدن کا ذکر ہے کہ جمیل کپڑے بدلنے کے ارادہ سے بکس کھولے بیٹھا تھا کہ

مسکراتی ہنسنے والی مصری عورت

اچانک اس کا حد درجہ کا بے تکلف اور ہم پیالہ و ہم نوالہ دوست شاکر کمرے میں داخل ہوا، اور آتے ہی جمیل کے پاس ایک کرسی پر آسن جما کر بیٹھ گیا اور ایک نگاہِ غلط انداز کے ساتھ جمیل کے بکس کی چیزوں کو دیکھنے لگا چیزوں کی الٹ پلٹ میں ناگاہ اس کی نظر ایک دخترِ چہاردہ سالہ کی تصویر پر پڑی اُسے دیکھتے ہی وہ بکس کی طرف جھکا، اور ایک اضطراری حرکت کے ساتھ اسے بکس میں سے نکال کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا، ہاتھ میں لیتے ہی اس کی زبان سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

شاکر ——— اخاہ جمیل ——— فرمایئے یہ کس کا فوٹو ہے؟ "

جمیل نے جو پائجامہ میں کمربند ڈالنے میں مصروف تھا یہ آواز جو سُنی تو ایکدم چونک پڑا اور شاکر کی طرف دیکھنے لگا، کیا دیکھتا ہے کہ جمیلہ کا فوٹو شاکر کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس کو ایک عجب تمنا آفریں نگاہ سے دیکھ رہا ہے یہ دیکھتے ہی جمیل غصہ سے بپھرے ہوئے شیر کی طرح اُٹھا اور جھٹ فوٹو کو اس کے ہاتھ سے چھین کر کہنے لگا۔

——— بس شاکر بس ——— دیکھو یہ ٹھیک نہیں ہے، ایسے ......

جس وقت جمیل نے یہ الفاظ ادا کئے اس کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں جن سے اس کے عمیق اضطراب اور نہایت درجہ تشویش و ملال کی پردہ کشائی ہوتی تھی، شاکر جمیل کی اس پریشانی کا مطلب بالکل نہ سمجھ سکا کیونکہ یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ یہ فوٹو اس کی بیوی کا ہوگا اس کا خیال تھا کہ فوٹو یا تو کسی مشہور فلم ایکٹرس کا یا کسی لائق و قابل بے پردہ خاتون کا ہوگا جس کا جمیل کے ساتھ کوئی تعلق ہوگا، شاکر کو جمیل کی انتہا درجہ کی بے تکلفی سے اس بات کا پورا اطمینان تھا کہ اگر جمیل کا اس خاتون کے ساتھ کوئی غیر ازدواجی تعلق ہوتا، تو جمیل اس کا ذکر ضرور کرتا شاکر جمیل کی اس بے سبب سراسیمگی کا عقدہ حل نہ کر سکا تو از راہِ مزاح کہنے لگا،

——— کہو بھئی جمیل - ایمان سے کہنا، یہ کس کا فوٹو ہے، واللہ غضب ہے آج تمھاری پارسائی کا بھانڈا بالآخر پھوٹ ہی گیا؟ خدا کی قسم چھپے ہوئے رستم نکلے ہو۔ ہم اس شرابِ حسن سے میخانہ بردوش بت کا ماجرا کو ضرور دیکھینگے، ضرور دیکھینگے، تم خفا ہو، ناراض ہو، لاکھ بگڑو، ہم اس جلوۂ عریاں کا نظارہ کریں گے۔

جمیل ——— خبردار شاکر۔ منہ سنبھال کر بولو، کچھ خبر بھی ہے یہ کس کا فوٹو ہے یہ کسی عصمت فروش بازاری عورت اور کنجری کا تو ہے نہیں جو تم اس قدر نامہذب اور نا ملائم الفاظ بول رہے ہو، نہیں نہیں "جلوۂ عریاں" "میخانہ بردوش" "بت کا فرماجرا"، کیا کہا۔ ذرا پھر کہنا۔ (غصہ سے بے قابو ہوکر اور منہ میں جھاگ لاکر) مزہ چکھا دوں گا، جناب کچھ پتہ بھی ہے یہ میری بیوی کا فوٹو ہے جو سخت پردہ نشین ہیں، ان کی شان میں آپ پھر کچھ اول فول بک رہے ہیں، پہلے پوچھ تو لیا ہوتا! پھر ہی زبان کھولی ہوتی، ——— اسی قباحت کی وجہ سے وہ مجھکو فوٹو دینے سے انکار کرتی تھیں......

جمیل کی زبان سے بیوی کا لفظ سنکر شاکر اپنی حرکت پر مارے شرم کے پانی پانی ہوگیا اس کی جبینِ اعتراف عرقِ انفعال سے تر ہوگئی اور اس نے سراپا انفعال بنتے ہوئے کہا ——— جمیل مجکو معاف کرو، واللہ مجھکو اسکا تو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یہ فوٹو ہماری بھابی صاحبہ کا ہوگا، ورنہ ایسے نامناسب کلمات میں کبھی استعمال نہ کرتا، تمہاری بیوی میری حقیقی بھابی کے برابر ہیں ان کیلئے میں کب اس طرح کے الفاظ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں"، معافی مانگ کر شاکر نے اس وقت جمیل کی شعلہ زن آتشِ غضب کو بجھا تو دیا، لیکن چونکہ شاکر طبعاً مشرقی فطرت کا انسان تھا، اور اس وجہ سے وہ پردہ وغیرہ کے معاملہ میں کٹر ملا تھا، اس لئے اس نے اپنے دل میں اس بات کا عزم بالجزم کر لیا کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ جمیل کو اس کی اس نازیبا حرکت (بیوی کا فوٹو کھنچوانے) کا مزہ ضرور چکھائیگا، اور اُسے بتلا دیگا کہ مشرقی تخیل سے بیوی کا فوٹو کھنچوانا کیوں بُرا ہے؟۔

———•:•———

اس واقعہ کے بہت دنوں بعد جب جمیل کے ذہن سے اس واقعہ کا نقش بالکل مٹ گیا تھا اور وہ فوٹو کی حفاظت میں کسی قدر سست ہو چلا تھا، ایک روز جمیل کسی خاص ضرورت سے کمرہ سے باہر گیا ہوا تھا اتنے میں شاکر کمرہ میں آگیا، کیا دیکھتا ہے کہ جمیل کا بکس کھلا ہوا ایک کونہ میں رکھا ہوا ہے، اس نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور چپکے سے فوٹو نکال رومال میں لپیٹ اور لے چمپت ہوگیا، یہاں سے وہ سیدھا چوک پہونچا اور وہاں ایک مشہور فوٹو گرافر عبدالصمد خاں کو وہ فوٹو دے کر کہا کہ از راہِ کرم اس کی چار کاپیاں آپ جلدی تیار کر دیجئے جس قدر جلدی آپ کر سکتے ہوں اس سے دریغ نہ کیجئے، اتفاق کی بات کہ آج ہی جمیل کو ایک ضرورت سے

کانپور جانا ہوگیا، اور اس بنا پر وہ روز صبح کو اٹھ کر سب سے پہلے جمیلہ کے فوٹو کی زیارت کیا کرتا تھا، اگلے دن نہ کر سکا یعنی اس کو یہ بھی پتہ نہ چلا کہ بکس میں سے فوٹو غائب ہوگیا ہے دوسرے دن شاکر فوٹو گرافر کے ہاں سے چار کاپیاں اور ایک اصل دونوں لے آیا، اور جمیل کی کانپور سے واپسی پر موقعہ پاکر اصل فوٹو کو تو جوں کا توں اسی طرح بکس میں لے جا کر رکھدیا اور رہ گئیں وہ چار کاپیاں انہیں وہ اپنے ساتھ گھر لے آیا۔

گھر آکر اس نے شیروانی اور بوٹ جوتہ پہن کر چوک کا رخ کردیا چوک پہونچکر اس نے دیکھا کہ ایک لڑکا تصویروں کی ایک چھوٹی سی دوکان لگائے بیٹھا ہے اور ان تصویروں میں اکثر فوٹو ہندو کانگرس کارکن خواتین کے ہیں وہ سیدھا اس دکان پر آیا، اور لڑکے کو جمیلہ کے فوٹو کی تین کاپیاں دیکر کہنے لگا کہ میرے بھئی لڑکے، یہ تین کاپیاں بھی رکھ لے، فی کاپی ار تیرا کمیشن ہوگا دیکھ چار آنے سے کم ہرگز ایک کاپی کی قیمت نہ لیجیو، لڑکے نے فوٹو دیکھ کر خوشی خوشی تینوں کاپیاں رکھ لیں اور لگا انھیں بیچنے، اب رہ گئی ایک کاپی اس کے متعلق شاکر نے یہ کیا کہ اُسے باندھ بوندھ سیدھا اڈیٹر ریاست دہلی کے نام بھیجدیا اور اس کے نیچے یہ عبارت لکھدی:۔

"مسز جمیل جو آئندہ نمائش حسن کے موقعہ پر ہندوستان کی طرف سے نمایندہ بنکر جانے کی امیدوار ہیں، امید کی جاتی ہے کہ آپ مس انڈیا ثابت ہونگی"

دوسرے دن جمیل معہ اپنے چند دوستوں کے جن میں شاکر شامل نہیں تھا ٹہلتے ہوئے چوک سے گذر رہا تھا کہ ناگاہ اس کی نظر تصویر فروش لڑکے کی دکان پر پڑی، اچھے اچھے فوٹو دیکھکر وہ دوکان پر چلا آیا، ایک ایک فوٹو کو بغور دیکھتا جاتا اور اپنے دوستوں سے کہتا جاتا تھا، "کہو بھئی انوار! کوئی پسند ہے؟ ذرا دیکھو تو کیا نفیس فوٹو ہے! اف ساری کے پہننے کا انداز کس غضب کا ہے؟ ہلو خلیل! لیلوان میں سے ایک ایک، دیکھا کرنا تنہائی میں، دیکھ دیکھ کے روز جیا کرنا اور روز مرنا، تسکین روح کا اچھا سامان ہے نکالو دام جیب سے اور خرید لو اُسے"

جمیل ابھی یہ کہہ ہی رہا تھا، کہ اتنے میں جمیلہ کا فوٹو انوار کی نظروں کے سامنے آگیا، اس نے فوراً اُسے اٹھالیا اور بہ نگاہ شوق و تمنا اُسے دیکھنا شروع کردیا جمیلہ کا حسن و جمال اور پھر اس پر اس کی ادائے شرمگین دیکھکر انوار پھڑک اٹھا اور لگا جمیل سے کہنے! "لو بھائی ہم تو یہ لیں گے" جمیل ذرا دیکھنا خدا کی قسم کس غضب کا حسن ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقلیم جمال کی ملکہ اپنا تخت مرصع چھوڑ کر صفحۂ قرطاس پر آبیٹھی ہے بس میں تو یہ لونگا، ہاں لڑکے بول کیا قیمت ہے، "ہم ... لے پھر ہم"۔ انوار کے متوجہ کرنے پر جمیل نے مُڑ کر فوٹو جو دیکھا تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی، ایک مجنونانہ کیفیت اس کے دل و دماغ پر چھاگئی، مارے غصہ کے تھر تھر کانپنے لگا، مگر پھر اُسے خیال ہوا کہ فوٹو شاید جمیلہ کا نہ ہو، اس کی کسی ہم شکل کا ہو، اس لئے اس نے اُسے پھر دیکھا اور بار بار دیکھا، اور طرز نشست، صورت شکل، کلائی کی گھڑی بکرسی وغیرہ دیکھکر اس کو کامل یقین ہوگیا کہ فوٹو کسی اور کا نہیں اس کی بیوی جمیلہ کا ہی ہے تو اس یقین کے ساتھ فوراً اس کے دل میں یہ خیال بھی آگیا کہ لڑکا فوٹو چُرالایا ہے، طیش و غضب کی مجنونانہ حالت میں اس خیال کے آتے ہی اس نے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر زور سے اس کو زمین پر لا پٹخا، اور پھر لات پر لات گھونسہ پر گھونسہ مارنا شروع کردیا۔

"حرام زادہ، الو کا پٹھا، چور زمانہ بھر کا، چوری کھل گئی چمڑی ادھیڑ دونگا، ابھی یہیں ذبح کر ڈالونگا، پھر معمولی چوری نہیں ہے۔ بلاؤ سپاہی کو، لے چلو کوتوالی میں جیلخانہ میں سڑ سڑوا کے مروادونگا، سمجھ کیا رکھا ہے دیکھ تو سہی، ابھی معلوم ہوا جاتا ہے، تہذیب و شائستگی کے سانچہ میں ڈھلے ہوئے یہ وہ الفاظ تھے، جو عالم بے خودی میں جمیل کی زبان سے بار بار ادا ہو رہے تھے، اس کے دوست انوار اور خلیل دونوں کیلئے اس جوش غضب کی وجہ بالکل نامعلوم تھی، دونوں اس کی اس حرکت پر انگشت بدندان اور سخت حیران و پریشان تھے، اس ہنگامہ کو دیکھکر ادھر اُدھر سے بھی کچھ لوگ آگئے اور جمیل سے کہنے لگے "ارے صاحب! وجہ تو بتلائیے، آخر اس غریب لڑکے نے آپ کا قصور کیا کیا ہے، جو آپ اس بے دردی کے ساتھ اسے یوں زدوکوب کر رہے ہیں" اب جمیل بڑی کشمکش میں تھا، کہ لوگوں کو مارنے کی وجہ کیا بتائے اگر وہ یہ کہتا ہے کہ لڑکا میری بیوی کا فوٹو چرالایا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں، کہ وہ اتنے بڑے مجمع میں اپنی بیوی کو رسوا کرنا چاہتا ہے اور جن لوگوں نے اس کے فوٹو کو محض ایک عورت کا سمجھکر دیکھا ہے انھیں بتلانا چاہتا ہے کہ وہ فوٹو میری بیوی کا ہے اور اگر وہ دوسری شق کو اختیار کرے یعنی ان لوگوں کے جواب میں کچھ نہ کہے تو پھر وہ لوگ اس کی جان کھا جائیں گے

اور کہینگے کہ لڑکا بالکل بے قصور تھا اسے بے خطا مارا ہے اور اگر یہ نہیں تو کم از کم جمیل کی دماغی حالت کی درستی میں شک تو ضرور کرنے لگیں گے الغرض جمیل سخت ادھیڑبن میں تھا اور سوچ رہا تھا، کہ اب کہے تو کیا کہے اور نہ کہے تو لوگوں سے پیچھا کیونکر چھڑائے، وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں لڑکے کا باپ، چچا، اور بھائی لٹھ لئے ہوئے چلے آئے، قریب تھا کہ وہ جمیل پر حملہ کریں، کہ دہشت وخوف کی وجہ سے اس کی زبان سے بیساختہ نکل گیا "یہ لڑکا میری بیوی کا فوٹو چرا لایا ہے جو سخت پردہ نشین ہیں اور پھر بے پردہ خواتین کے فوٹوؤں کے ساتھ اس کو سربازار فروخت کر رہا ہے، آپ لوگ خود خیال کیجئے کہ کیا اس سے زیادہ میری توہین کوئی اور ہوسکتی ہے؟ ایک شریف اور پردہ نشین بی بی، اور اس کا فوٹو یوں غیروں کے کمروں کی زینت بنے اور اس پر"........ جمیل اسی قدر کہنے پایا تھا کہ اس پر بعض لوگوں نے ایک "فرمائشی" قہقہہ لگایا، اور ان میں جو بعض دل چلے تھے وہ تو یہاں تک کہہ اُٹھے کہ "صاحب اگر لڑکے نے آپکی حرم محترم کے فوٹو کو سربازار بیچکر کسی اخلاقی معصیت کا ارتکاب کیا ہے تو گستاخی معاف، آپ نے شارع عام پر اتنے بڑے مجمع میں اس کی تشہیر کرکے اس سے زیادہ بُرا کام کیا ہے، اب دیکھئے نا ہر شخص اس فوٹو کو دیکھنے کی تمنا کر رہا ہے، خلاصۂ کلام یہ کہ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ جتنے منہ اتنی باتیں، ان میں جو بعض سمجھدار تھے کہہ اٹھے کہ اس لڑکے کے پاس تین کاپیاں ہیں یہ تینوں آپ لے جائیے اور لیجا کر پھاڑ دیجئے اسکی کاپیاں آپکے پاس تین ہی تھیں نا؟ دیکھئے ابھی تک کوئی کاپی بکی نہیں ہے

اگر یہ بات یہیں پر رفت گذشت ہوجاتی تو کچھ بھی نہ تھا، اس سے بھی زیادہ برا یہ ہوا، کہ ایک ہفتہ کے بعد جمیل کو اپنی بیوی جمیلہ کا خط ملا، اس نے اس کو حسب عادت بڑے اشتیاق وتمنا کے ہاتھوں سے کھولا اور پڑھا، وہ ابھی ایک سطر ہی پڑھنے پایا تھا، کہ اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا، ایک رنگ آتا تھا، دوسرا چڑھتا تھا، خدا جانے خط میں کیا لکھا تھا؟ بالآخر اس نے ان الفاظ کو زور سے پڑھنا شروع کردیا جن کے باعث اس کی یہ حالت ہوئی تھی، اس میں لکھا تھا،

"کل شام بیٹھی ہوئی میں ایک کتاب پڑھ رہی تھی، کہ اتنے میں بھائی اختر بازار سے غصہ میں بھرے ہوئے آئے، ان کے ہاتھ میں دہلی کے اخبار ریاست کا تازہ پرچہ تھا، آتے ہی اس کو میرے سامنے دے پٹخا، اور کہنے لگے "مبارک ہو امی جان اب تو آپ کی صاحبزادی جمیلہ بیگم نمائندہ حسن بنکر یورپ جا رہی ہیں، یہ دیکھئے ان کا فوٹو بھی چھپ گیا ہے آپ جانتی ہیں یہ قصہ کیا ہے؟ میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ جمیل صاحب جمیلہ کا فوٹو لے گئے تھے وہ اتفاق سے ان کے کسی دوست کے ہاتھ آگیا ہے اور اس نے یہ مذاق کیا ہے، دیکھو اسی وجہ سے میں اس رشتہ کے خلاف تھا، پہلے میں کہتا تھا کہ جمیل علی گڈھ کا پڑھا ہوا ہے اس کے خیلات آزاد ہوں گے، ہائے افسوس ابا نے ایک نہ مانی، اب بتاؤ آگ اور پانی کا اجتماع کیونکر ہوگا" بھائی جان کی اس تقریر سے مت پوچھئے کہ میرے دل کی کیا کیفیت ہوئی، وہ فوٹو جو ریاست میں چھپا ہے واقعی میرا ہی ہے، آپ لکھئے کہ اصل قصہ کیا ہے؟ میں سخت پریشان ہوں، دیکھئے ان ہی قباحتوں کی وجہ سے میں فوٹو کھنچوانے سے انکار کرتی تھی۔ فقط والسلام۔

آپکی کنیز، جمیلہ از اجمیر،

اس خط کو پڑھکر گرتا پڑتا جمیل ریڈنگ روم گیا اور وہاں ریاست کا تازہ پرچہ دیکھنے لگا، صفحات تصاویر میں اس نے دیکھا کہ دراصل اس کی بیوی جمیلہ کا فوٹو چھپا ہے اور اس کے نیچے عبارت بھی لکھی ہوئی ہے۔

"مسز جمیل جو آئندہ نمائش حسن کے موقعہ پر ہندوستان کی طرف سے نمائندہ بنکر جانے کی امیدوار ہیں امید کی جاتی ہے کہ آپ مس انڈیا ثابت ہونگی"

اسے پڑھکر وہ فرط غضب سے دیوانہ ہوگیا، بےقراری کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا، کہ کسی نے اس میں بجلیاں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہیں، یا کوئی آتش فشاں پہاڑ اس کے سینہ میں پھٹ پڑا ہے اس نے ارادہ کیا کہ اڈیٹر کے نام ایک نوٹس دے اور اس کے خلاف قانونی کارروائی کرے، مگر پھر اس کو خیال ہوا کہ اس نے اگر ایسا کیا تو یہ مقدمہ "ممتاز بیگم اور باولا" کے مقدمہ سے زیادہ شہرت پکڑ جائیگا، اور اس میں خواہ مخواہ جمیلہ کی اور تشہیر ہوگی! اب جن لوگوں نے اس فوٹو کو دیکھا ہے اور میری بیوی کی صورت سے واقف نہیں ہیں انہیں کیا خبر کہ یہ جمیل میں ہی ہوں اور یہ مسز جمیل میری بیوی جمیلہ کا فوٹو ہے، اس خیال کے آتے ہی وہ دم بخود ہوکر بیٹھ رہا، اور اپنے کمرہ میں آکر بحر تفکر وتردد میں غوطہ زنی کرنے لگا، اتنے میں شاکر بھی کمرہ کے کواڑ کھول جھٹ*

* اندر آدھمکا، جمیل کو اس حالت میں دیکھکر وہ تمام قصہ از اول تا آخر سمجھ گیا، کیونکہ وہ ابھی ابھی ریاست دیکھکر آرہا تھا، اس سے ہنسی ضبط نہ ہوسکی لاکھ ضبط سے کام

سلطان محمود غزنوی رح

از جناب میر نذر علی صاحب درد کاکوروی

دنیا میں جس طرح اورنگ زیب رح کے متعلق بہت سے غلط قصے مشہور ہیں اسی طرح محمود غزنوی کی بابت بھی غلط واقعات مشہور ہیں صرف یہی نہیں بلکہ مدرسوں کی تاریخیں بھی انہی غلط واقعات سے بھری پڑی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہندو طالب علم ان غلط واقعات کو پڑھکر خواہ مخواہ مسلمانوں کی طرف سے بدگمان ہو جاتے ہیں، اور اس کے باعث ۱؎ اے مارسڈن صاحب ۲؎ لیتھر برج صاحب ۳؎ سی اے لن صاحب ۴؎ ملکم صاحب انگریز مؤرخین ہیں دیکھئے تاریخ آئینہ حقیقت نما صفحات ۱۶۰ - ۱۶۱ -

قبل اس کے کہ ہم محمود غزنوی کا حال لکھیں یہ بتا دینا ضروری جانتے ہیں کہ قرامطہ کیا چیز ہیں، کیونکہ یہی سب سے پہلی مصیبت تھی جس سے غزنوی عہدِ حکومت کو دوچار ہونا پڑا تھا۔

بغداد میں جب عباسی حکومت زور شور پر تھی، اسی زمانہ میں چند ایرانی شریر اور چالاک لوگوں نے عباسی حکومت کے خلاف شورش برپا کی، یہ لوگ اپنے کو علوی بھی ظاہر کرتے تھے، تاکہ شیعہ فرقہ ان سے مخالفت نہ کرے، رفتہ رفتہ ان کی قوت اس درجہ بڑھ گئی، کہ یہ کعبہ سے حجر اسود اکھاڑ لائے جو ۲۲ سال تک مقام ہجر میں رہا ۵؎ اس عرصہ میں انھوں نے اور بھی ظلم کئے، حاجیوں کو قتل کیا، اموی خاندان والی مسجد کو نمازیوں کے لئے بند کر دیا، اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے مگر درحقیقت ان کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا، کیونکہ انھوں نے خود اپنے ہم خیالوں کو (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) تمام اسلامی فرائض سے آزاد کر دیا تھا، چونکہ یہ لوگ اسلام میں سخت فتنہ برپا کر رہے تھے، اس لئے اس وقت جتنے اسلامی حکمران تھے سب کو اس کی فکر تھی، کہ کسی طرح ان کی سرکوبی کی جائے، یہی لوگ قرامطہ کے نام سے مشہور تھے، کوئی اسلامی حکومت اپنے حدود سلطنت میں ان کے رکھنے کی روادار نہ تھی، اس لئے اکثر قرامطہ ہندوستان چلے آئے تھے، ہندوستان سے غزنی حکومت قریب تھی اس لئے ان کی سرکوبی اس کے فرائض میں تھی، جس کی تفصیل آگے آئے گی، پہلے ہندو مسلم کے خوشگوار یا ناخوشگوار تعلقات پر صحیح رائے قائم کرنے کے لئے غزنوی حکومت کے ابتدائی حالات سن لیجئے۔

غزنوی سلطنت کی ابتدا

الپتگین ۶؎ نامی غزنی میں ایک با اثر بہادر شخص تھا، جب ۳۶۵ھ میں اس کا انتقال ہو گیا تو ابو اسحاق اس کا بیٹا اس کی جگہ بیٹھا، لیکن وہ بھی بہت جلد انتقال کر گیا رعایا نے ایک اور شخص کو بادشاہ بنا لیا لیکن اس کی عمر نے بھی وفا نہ کی، بالآخر رعایا نے الپتگین کے غلام سبکتگین کو اپنا بادشاہ بنا لیا سبکتگین نہایت ہی جری شخص تھا، رفتہ رفتہ اس نے اپنی طاقت یہاں تک بڑھائی کہ اچھی خاصی سلطنت کا مالک ہو گیا۔

یہ امر قابل غور ہے کہ جب اس کو کسی قدر اطمینان ہوا، تو اس غزنی بادشاہ نے کبھی ہندوؤں کو نہ ستایا، نہ کسی ہندو کو زبردستی مسلمان بنایا، بلکہ وہ سب سے پہلے قرامطہ کے نیست و نابود کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا مگر قسمت نے اتنا موقع نہ دیا، اور ہمارے ہندو بھائیوں نے خود پیش قدمی کی یعنی راجہ جے پال جو اس وقت تمام ہندو راجاؤں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا اس نے خود ہی ابتدا کی۔

جے پال مہاراجہ پنجاب کی پیشقدمی

جس وقت سبکتگین طوس میں دشمنوں سے لڑ رہا تھا، اور محمود بھی نیشاپور سے سبکتگین یعنی اپنے باپ کے پاس مدد کے لئے پہنچ گیا تھا یہاں میدان خالی پاکر پنجاب کے راجہ جے پال نے سلطنت غزنی پر خود بخود حملہ کر دیا اور

۵؎ تاریخ آئینہ حقیقت ص۱۳۵ ۶؎ مملکت غزنی سلطنت سامانی اسلامی کا ایک حصہ تھا اور الپتگین اس کا ایک سردار تھا۔

اور سبکتگین کو اطلاع ہوئی کہ پنجاب کا راجہ اب شہر غزنی کو فتح کرنے کے قریب ہے سبکتگین مجبوراً اس کے مقابلے کیلئے گیا، قصہ مختصر یہ کہ پنجاب کے راجہ کو شکست ہوئی اور سلطان سبکتگین نے فتح پائی۔

سبکتگین کا رحم

پنجاب کے راجہ نے درخواست معافی پیش کی کہ اس دفعہ میرا قصور معاف فرمایا جائے، آئندہ ہرگز ایسا قصور نہ ہوگا آپ اپنے چند آدمی میرے ساتھ کر دیجئے میں ان کے ہاتھ آپ کی خدمت میں مختلف قسم کے قیمتی تحفے بھیجوں گا اور آپ کا ہمیشہ فرماں بردار رہوں گا۔

سلطان کے فوجی افسروں کو یہ صلح بالکل نہ پسند تھی کہ قبضے میں آئے ہوئے دشمن کو چھوڑ دیا جائے، لیکن سبکتگین کو دیکھئے کہ اس نے راجہ جے پال کی درخواست منظور کر لی، اور اپنے چند آدمی اس کے ساتھ کر دئے اور اسکو شاہانہ اعزاز کے ساتھ رخصت کر دیا۔

جے پال کی بیوفائی یعنی پہلا حملہ

جے پال پنجاب کا راجہ اپنے عہد پر قائم نہ رہا، اس نے دریائے سندھ عبور کرتے ہی ہندو ریاستوں کے تمام راجاؤں کو یہ یقین دلایا کہ سبکتگین عنقریب پنجاب پر حملہ کرنے والا ہے اگر مجھ سے اس کی مدافعت نہ ہو سکی، تو پھر آپ لوگوں کی بھی خیر نہیں، اس واسطے اس وقت سب کو مل کر مسلمانوں سے مقابلہ کیلئے طیار ہو جانا چاہئے، اس طرح جے پال نے صرف قنوج، اجمیر کے راجہ کو لڑائی کیلئے تیار نہیں کیا، بلکہ گجرات اور کالنجر کے راجاؤں تک کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔

لاہور پہونچنے پر سلطان سبکتگین کو حسب وعدہ نہ سونا چاندی بھیجا اور نہ کوئی تحفہ بلکہ جن آدمیوں کو ساتھ لایا تھا ان کو قید کر دیا، اگرچہ بعض منصف مزاج ہندوؤں نے (جو اس کے درباری تھے) منع کیا کہ ایسی بد عہدی نہیں کرنا چاہئے، مگر جے پال نے ایک نہ سنی[۱] سلطان سبکتگین کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اس کو بالکل یقین نہیں آیا، اس نے خیال کیا کہ پنجاب کا اتنا بڑا راجہ کیسے بد عہدی کر سکتا ہے؟ مگر اس کا خیال غلط نکلا، تب مجبوراً اس نے ارادہ کیا کہ جے پال سے مقابلہ کر کے کسی طرح اپنے معتمدوں کو چھڑائے لیکن دفعتاً خبر آئی کہ اس نے ان مسلمان آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔

اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد راجہ جے پال ۲۳ لاکھ فوج اور بہت سے ہاتھی لیکر چڑھ آیا، یہ خبر سنتے ہی سبکتگین غزنی سے مجبوراً مدافعت کیلئے چلا، جلال آباد کے قریب میدان جنگ قرار پایا، سبکتگین کے پاس سولہ ہزار سے زیادہ فوج نہ تھی، اس نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر دشمن کی فوج کو دیکھا اور نہایت استقلال سے مقابلہ کیا، آخر کار پنجاب کے راجہ جے پال کو شکست ہوئی، اور وہ دریائے سندھ کی طرف بھاگ گیا۔

مگر ایسا گھبرا کر بھاگا، کہ بہت سا ساز و سامان میدان جنگ میں چھوڑ گیا، جس سے سبکتگین کے جنگی اخراجات نکل آئے، سبکتگین کی اس فتح کا تمام ہندوستان میں شہرہ ہو گیا، کیونکہ اس جنگ میں پنجاب کے راجہ جے پال نے بڑی کوشش سے ہندوستان کے ہر راجہ کی فوج شامل کی تھی جب ہارے ہوئے سپاہیوں نے اپنے اپنے مقام پر جا کر سبکتگین کی فتح کا حال بیان کیا تو تمام ہندی حکمرانوں کو سخت حیرت ہوئی اور اس طرح ان کے دلوں پر اسلامی فتح کا سکہ بیٹھ گیا۔

اس کے بعد ناصر الدین سبکتگین شمال کی جانب سامانی سلطنت کے چند پیچیدہ امور کو سلجھانے کے لئے گیا اور اس مہم سے واپس نہیں ہوا تھا کہ بلخ کے قریب ۳۸۷ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

محمود غزنوی

سبکتگین کے دو لڑکے تھے ۱۔ محمود ۲۔ اسماعیل، بلخ کے سرداروں نے اسماعیل کو بادشاہ بنا دیا، کیونکہ محمود نیشاپور میں تھا، مگر چھ مہینے کے عرصہ میں محمود نے باپ کی سلطنت حاصل کر لی اور چھوٹے بھائی کو قلعہ میں نظر بند کر دیا۔

یہاں بھی یہ امر قابل غور ہے کہ محمود غزنوی ۳۸۷ھ میں تخت نشین ہوا، مگر ۳۹۱ھ یعنی پانچ سال تک اس نے ہندو راجاؤں سے کچھ تعرض نہیں کیا، اگر اس کو بلاوجہ ہندوستانیوں کو ستانا منظور ہوتا تو تخت پر بیٹھتے ہی سب سے پہلے ہندوستان کی طرف رخ کر دیتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ وہ خراسان اور ہرات کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گیا اور بالآخر اسمیں کامیاب ہوا،

لفظ "سلطان" کی تاریخ

سیستان کرمان میں صفاری خاندان کا ایک شخص خلف بن احمد نامی حکومت کرتا تھا، رعایا اس کے مظالم سے تنگ تھی، محمود غزنوی کو لفظ

[۱] دیکھئے تاریخ فرشتہ

سلطان سے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا، محمود کو یہ لفظ بہت اچھا معلوم ہوا اس دن سے محمود نے سلطان کا لقب اختیار کرلیا،

حلیف قرمطی غزنی میں چار سال تک قید رہا، اسی سال سلطان محمود نے تاتاریوں اور ویلمیوں سے محفوظ رہنے کیلئے ملک خان سے مصالحت کرلی اس کے بعد اپنے ہم عصر بغداد کے خلیفہ قادر باللہ عباسی کی خدمت میں درخواست بھیجی اور اطاعت کا اقرار کرتے ہوئے حکومت کی سند چاہی بغداد کے خلیفہ نے سلطان محمود کو نہایت ہی قیمتی خلعت بھیجا، اور امین الدولہ یمین السلطنت کا خطاب بھی دیا۔

جے پال کی دوسری بیوفائی یعنی دوسرا حملہ

۳۹۱ھ میں اسکو نیشاپور کے گورنر کے ذریعہ اطلاع پہنچی کہ پنجاب کا راجہ جے پال عظیم الشان فوج سے غزنی سلطنت پر حملہ کرنے والا ہے محمود یہ خبر سنتے ہی اس کے مقابلہ کو روانہ نہیں ہوا، بلکہ اس فکر میں تھا کہ کسی طرح یہ خبر غلط ثابت ہو جائے، اور فضول جنگ نہ ہو، تاہم اس کے نزدیک یہ خبر کچھ زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی، یہی وجہ ہوئی کہ جب تک جیپال دریائے سندھ کے بالکل قریب نہ آگیا محمود نے قدم آگے نہ بڑھایا۔

جے پال کو جب سبکتگین کے انتقال کی خبر اور محمود کی تخت نشینی کی اطلاع ملی تو وہ اس کو ایک نوجوان ناتجربہ کار سمجھ کر جنگ کیلئے پھر از سر نو تیار ہوگیا جے پال تمام راجاؤں میں نہایت نامور اور بڑا مشہور اور مغرور تھا، اس مرتبہ اپنے غرور میں اور راجاؤں کی مدد کے بغیر مقابلہ کیلئے آنکلا، اس وقت جے پال کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار پیدل اور ڈیڑھ لاکھ سوار اور تین سو جنگی ہاتھی تھے، رام چندر صاحب مؤرخ کا بیان ہے کہ کچھ سرحدی قبائل بھی شریک تھے، بہر حال اس نے دریائے سندھ عبور کیا ادھر سے محمود غزنوی روانہ ہوا، دونوں کا مقابلہ ہوا، تمام مورخین کی رائے ہے کہ محمود کے ہمراہ دس ہزار فوج تھی، جس میں پیدل سوار سب شریک تھے لڑائی شروع ہوئی بالآخر جے پال محمود کے لشکر کا مقابلہ نہ کرسکا، اس کی کچھ فوج لاہور بھاگ گئی جس کے ساتھ انند پال راجہ کا بیٹا بھی تھا، باقی فوج نے پندرہ سرداروں اور جے پال راجہ پنجاب کو گرفتار کرادیا جیپال کے ساتھ جو فوجی سردار تھے ان میں اس کا نواسہ سکھ پال بھی تھا جسنے بخوشی اسلام قبول کرلیا اور غزنی ہی میں رہنے بسنے لگا، غرض محمود غزنوی نے ۸ محرم ۳۹۲ھ مطابق ۱۵ اگست ۱۰۰۱ء نیشاپور کے میدان میں فتح پائی۔

محمود کا باپ سبکتگین جے پال کے پہلے حملہ پر قصور معاف کرچکا تھا اور جب اس نے خود ہی دوسرا حملہ کیا، اس وقت بھی سبکتگین فتح حاصل کرچکا تھا، اس لئے محمود نے راجہ پنجاب سے کہاکہ آخر تمہارا مطلب کیاہے تم کیوں بار بار ہم کو ستاتے ہو۔

جے پال نے اپنی غلطی کا اقرار کیا اور کہا اس دفعہ اور میری خطا معاف کر دی جائے اب کبھی تابعداری سے انکار نہ کروں گا، اور پنجاب کو غزنی سلطنت کا ایک صوبہ سمجھکر حکومت کرونگا، اور سالانہ محصول ادا کرتا رہوں گا۔

محمود غزنوی کی نیکی

باپ کی طرح محمود نے بھی قصور معاف کردیا، اور شعبان ۳۹۲ھ مطابق مارچ ۱۰۰۱ء جے پال کو رخصت کردیا، اس طرح ۸ مہینے جیپال محمود کے یہاں رہا، اگر محمود زبردستی مسلمان کرلیا کرتا تھا، تو اس نے جیپال کو مسلمان کیوں نہ بنالیا یا اگر محمود ہندوؤں کو قتل کردیا کرتا تھا، تو اس نے جے پال کو گرفتار کرکے کیوں قتل نہیں کیا، باوجود اس کے کہ جے پال محمود کے معتمدوں کو پہلے قتل کرچکا تھا،

انند پال

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جے پال کا لڑکا انند پال لڑائی سے بھاگ گیا تھا اب اس کی حکومت اور جے پال کے انتقال کا حال سنو۔

انند پال لڑائی سے بھاگ کر اپنے ملک پنجاب میں پہونچا اور اپنے ملک کے انتظام میں مصروف ہوگیا، جب جے پال لاہور پہنچا تو اس نے انند پال کو برسر حکومت پایا، انند پال نے چاہاکہ باپ کیلئے تخت خالی کردے، مگر باپ نے حکومت کرنے سے انکار کردیا، اور بیٹے کو تاکید کی، کہ محمود کی کبھی مخالفت نہ کرنا، بلکہ ہمیشہ سالانہ خراج بھیجتے رہنا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے بعد جے پال اپنے اس مذہبی عقیدے کی بنا پر کہ "جو راجہ دشمن کے ہاتھ گرفتار ہوجائے اس کو آگ میں جل کر مرجانا چاہئے" آگ میں جل کر مرگیا۔

مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جے پال پہلے بھی دشمن کے ہاتھ

گرفتار ہوچکا تھا، پھر پہلے ہی کیوں نہ جل مرا، اور اب کیوں جلا، یہ کچھ نہیں اصل بات یہ ہے کہ جے پال نے سوچا ہوگا، کہ میں ایک ممتاز راجہ ہوں شکست کھاکر جینے سے مرنا بہتر ہے اس لئے مرگیا ہوگا،

انندپال پر اس طرح جے پال کے مرنے کا بہت اثر ہوا، بلکہ ایسی موت نے انندپال کی تحریک پر رعایا میں دوبارہ مقابلہ کی آگ کو اور بھڑکا دیا ہوگا۔

برہمنوں کا نیا مذہب اور قرامطی مذہب والے

انندپال نے بڑے بڑے برہمنوں اور مذہبی آدمیوں کو محمود غزنوی سے نفرت دلاتے ہوئے اتفاق کرنے کے بعد پھر جنگ پر آمادہ کیا، صرف یہی نہیں بلکہ برہمنوں نے وشنومت ایک نیا مذہب نکالا، اور بودھ مذہب اور برہمن مذہب سبکو جمع کرلیا، بظاہر محمود کو انندپال خراج بھیجتا رہا اور اندرونی طور پر رفتہ رفتہ غزنی سلطنت کے مقابلہ کے لئے طیار ہوتا رہا، مذہبی لوگ تو اس نئے مذہب کے مقابلہ کیلئے آمادہ ہی تھے صرف راجاؤں کو ہموار کرنا باقی تھا، ان کو بھی ہموار کرلیا گیا، اتفاق سے قرامطی مذہب والے سندھ کے راجہ کی سلطنت میں آئے، چونکہ یہ لوگ محمود کے دشمن تھے، اور محمود ان کا دشمن، اس لئے سندھ کے راجاؤں نے ان لوگوں کو ملا لیا، اور خفیہ طور پر انندپال بھی اس میں شریک تھا، اتفاق سے محمود کو اس کی اطلاع ہوگئی، ۳۹۵ھ میں محمود غزنوی نے جس ریاست میں قرامطی موجود تھے، اس کو لکھا کہ تم ہمارے دشمنوں (قرامطیوں) کو پناہ نہ دو ورنہ ہماری تمہاری لڑائی ہوجائیگی۔

نبجے رائے والی ریاست نے نہایت سخت لب ولہجہ میں جواب دیا، محمود نے بھی ترکی بترکی جواب دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ چھڑ گئی، رائے نبجے رائے مقابلہ کی تاب نہ لاسکا، قرامطی لوگوں نے بھی اس کی مدد کی مگر کچھ نہ ہوا، رائے نبجے راؤ گرفتار ہوگیا، اور جے پال کا وہ نواسہ جو مسلمان ہوگیا تھا، محمود نے اس کو اس ریاست کا حکمران بنادیا۔

نبجے راؤ اپنی ریاست کھونے اور گرفتار ہونے کے بعد زیادہ دن زندہ نہ رہ سکا، قید ہی میں چند روز کے بعد مرگیا، قرامطی لوگ بھی مارے گئے جو کچھ باقی بچے وہ ملتان بھاگ گئے وہاں انھوں نے بہت فساد برپا کیا، اور وہاں کے حکمراں کو بھی اپنا ہم خیال بنالیا۔

انندپال کی بیوفائی

قرامطی لوگوں کی سرکوبی کیلئے محمود ملتان جانا چاہتا تھا، اس نے ارادہ کیا کہ انندپال کے حدود ریاست میں ہوکر خراسان جائے، چنانچہ وہ غزنان چلا، اور انندپال کے علاقہ سے گذرا۔ انندپال جواب تک محمود کا تابع فرمان تھا، اور نہ ہزاروں وعدے کرچکا تھا، باپ کی بھی وصیت تھی، کہ محمود کے خلاف نہ ہونا، آج اس کی نیت بدل گئی، آج وہ اپنے وعدوں سے پھر گیا اور باپ کی وصیت کی بھی اس نے کچھ پرواہ نہ کی، اور جس وقت سلطان محمود اس کے علاقہ سے گذر رہا تھا، تو وہ خلاف امید سلطان محمود سے مقابلہ کیلئے تیار ہوگیا،

محمود کو جب اس کی خبر ہوئی تو بہت تعجب ہوا، کہ یہ کیسا آدمی ہے جو اپنے قول فعل پر قائم نہیں رہتا، چونکہ انندپال نے خود ابتدا کی تھی، اس لئے محمود کی فوج کو چار وناچار انندپال سے مقابلہ کرنا پڑا، محمود کے ساتھ جو کچھ فوج تھی، اس نے انندپال کی فوج کو دریائے سندھ سے بھگا دیا، انندپال نے بھاگی ہوئی فوج کو پھر اکٹھا کرکے مقابلہ کیا لیکن دوسری بار بھی مقابلہ کی تاب نہ لاسکا، اور بھاگا ہوا سیدھا لاہور آیا، یہاں اسکو معلوم ہوا کہ سلطان محمود نے بے خوف وخطر راستہ طے کرلیا، اور دریائے جہلم کو عبور کرکے دریائے چناب پر آگیا ہے یہ سنتے ہی فوراً لاہور چھوڑ کر کشمیر چلا گیا، جب محمود غزنوی کو یہ معلوم ہوا، کہ انندپال لاہور سے کشمیر چلا گیا تو وہ بھی کشمیر گیا، مگر جب یہ اطلاع ملی کہ وہ پہاڑوں میں جا چھپا تو وہ ملتان واپس چلا آیا۔

محمود کی نیکی

یہاں یہ امر خاص طور قابل ذکر ہے کہ اگر محمود کو زبردستی ہندوؤں کو ستانا لوٹنا منظور ہوتا، تو لاہور میں جتنی ہندوؤں کی مذہبی عمارتیں تھیں سبکو لوٹ لیتا اور نیست ونابود کردیتا اور لوگوں کو زبردستی مسلمان بنالیتا، مگر اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ جس نے بے وفائی کی تھی اُسی کا پیچھا کیا، اور جب وہ نہ ملا تو واپس چلا آیا، اس کی گرفتاری کے لئے کوئی فوج متعین نہیں کی، حالانکہ دشمن سے بے خبر رہنا سیاست کے خلاف ہے۔

محمود کا مخالف (قرامطی مذہب والا) داؤد بن نصر بھی انندپال سے

سے ملا ہوا تھا، جب اس کو یہ خبر ملی کہ انند پال محمود کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر کشمیر بھاگ گیا ہے تو وہ بھی ڈرا اور مع ساز و سامان دکن کی طرف بھاگ جانے کا ارادہ کرلیا، محمود کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے ایک جرار لشکر بھیج کر داؤد کو گرفتار کرالیا، داؤد بن نصر نے گرفتار ہوکر محمود سے عاجزانہ معافی چاہی اور قرامطی مذہب سے بھی توبہ کی اور اس بات کا وعدہ کیا کہ دارالسلطنت غزنی کو تیس ہزار درہم سالانہ دیا کروں گا۔

انند پال کی بیوفائی

جے پال کا نواسہ سُکھ پال جو ۳۹۶ھ میں بخوشی خود اسلام لایا تھا اور جس کو سلطان محمود نے ملتان کی حکومت سپرد کرتے ہوئے داؤد بن نصر (قرامطی) کا نگران بھی بنا دیا تھا، اسکو انند پال نے مخفی طور پر بہکایا اور محمود کے خلاف اُبھارا، آخر دو سال بعد ۳۹۸ھ میں سکھ پال (نو مسلم) نے اعلان جنگ کردیا، دیکھو داؤد بن نصر بھی اس کا شریک نظر آرہا ہے پہلے کی طرح تمام راجے اس کے شریک ہیں، مورخ سجان رائے کی تاریخ سے ہم کچھ راجاؤں کی فہرست دیتے ہیں جو اس جنگ میں شریک تھے :-

نمبر	نام ملک	نام راجہ
۱	نندنہ	اندر بھیم
۲	بھلواڑہ	پرم دیو، (اسی بڑی زبردست فوج دیتی)
۳	بھنٹہ	پرم دیو (ثانی)
۴	دھرودن	راجہ رام
۵	سونی پت	دِی پال
۶	برن	ہردت
۷	مہابن اور متھرا	کلچندر
۸	رسونی (ضلع فتحپور)	چندیل بھور
۹	شروا (بندیل کھنڈ)	چندروے
۱۰	سرسور گڈھ	بھیم پال
۱۱	قنوج	کنور رائے (کورہ)
۱۲	اُجین	راجہ (نام معلوم نہیں)
۱۳	گوالیار	راجہ "
۱۴	اجمیر	راجہ (نام معلوم نہیں)
۱۵	دہلی	راجہ "
۱۶	تھانیسر	راجہ "
۱۷	نگر لوٹ	راجہ "
۱۸	کشمیر	راجہ "
۱۹	مالوہ	راجہ منج
۲۰	میرٹھ	راجہ دھرم دت

اب تم اندازہ کرسکتے ہو کہ مسلمانوں کے لئے یہ جنگ کس قدر سخت اور خطرناک تھی، اگر صرف انہیں راجاؤں پر نظر کی جائے تو ادہر گجرات سے بہار تک اور اُدھر کشمیر سے قنوج تک تمام راجہ مسلمانوں کے لئے ہاتھ میں تلوار لئے ہوئے تھے، سب سے بڑھکر پنڈتوں اور برہمنوں کی سازشیں، امیر عورتوں نے اس جنگ میں زیور سے اور غریب عورتوں نے سوت کات کات کر شرکت کی۔

اس طرح متفق ہوکر محمود غزنوی پر چڑھائی کی جاتی ہے، محمود کو جب اسکی اطلاع ملتی ہے کہ انند پال اپنے عہد سے پھر گیا اور پشاور کی طرف روانہ ہوچکا، تو اس کو یقین ہوجاتا ہے کہ جے پال کی بغاوت اس شکل میں رونما ہوئی ہے۔

خیر وہ بھی اپنی موجودہ فوج لے کر پشاور روانہ ہوتا ہے دیکھتا ہے کہ تمام ہندوستان کے راجہ خیمہ زن اور مقابلہ کے لئے تیار ہیں، یہ رنگ دیکھکر محمود گھبرایا، مگر اس نے ہمت و استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیا خود حملہ کی ابتدا کرنا اچھا نہ سمجھا اس طرح اسکو چالیس دن گذر گئے البتہ اس نے اتنا ضرور کیا کہ اپنے لشکر کے گرد خندقیں کھدوادیں لیکن یہاں ہندو فوج روز بروز ترقی کررہی تھی، کوئی دن ایسا خالی نہ جاتا تھا جس دن کوئی نیا دستہ آکر شریک نہ ہوتا ہو جب زیادہ وقت گذرنے اور دشمن کی فوج میں روزانہ اضافہ ہونے کی کوئی انتہا نہ رہی تو اس نے تیراندازوں کے ایک ہزار دستے کو اس غرض سے آگے بھیجا تاکہ وہ صرف تیراندازی کرے اور اس طرح فوجوں کو ہٹاتے ہوئے اپنی خندقوں کے قریب لے آئیں، تاکہ اسلامی لشکر ایک دم دشمنوں کے محاصرے میں نہ آجائے۔

اننّد پال سمجھا کہ حملہ کی ابتدا ہے اس نے تیس ہزار فوج سے محمودی لشکر پر دوسری جانب سے پہلے خود ہی حملہ کردیا، پھر کیا وجہ تھی کہ تیر انداز خاموش رہتے اُنھوں نے بھی باضابطہ لڑائی شروع کردی، ادھر یہ تیر انداز لڑ رہے تھے اُدھر ان گھکڑوں کی فوج محمود کے کیمپ میں داخل ہوگئی، اس طرح ہندوؤں کی تیغ بے دریغ سے پانچہزار مسلمان شہید ہوگئے۔

محمود کو بہت صدمہ ہوا، وہ خود اُٹھا اور اس نے خود اپنے ہاتھ میں فوج کی کمان لی، اور اس بہادری سے لڑا کہ دشمن کی فوج کو اپنے لشکر سے بھگا دیا، پھر بھی ابھی دشمن کی فوج بہت تھی، جو محمودی لشکر سے خندقوں کے سامنے برسر پیکار تھی، مسلمان نہایت دلیری سے مذہب پر نثار ہوکر جام شہادت پی پی کر جوش بڑھا رہے تھے، کہ اتنے میں سلطان محمود (شاہی کیمپ لوٹنے والی فوج کو بھگا کر) آپہونچا، محمود کے آتے ہی اسلامی بہادروں کے کلیجے ہاتھ ہاتھ بھر کے ہوگئے۔

جس کا نتیجہ ہوا، کہ ہندو جن کو آج یقین کامل تھا کہ ہم فتح و نصرت کی کلغی اپنے سر پر سے جائیں گے، کامیاب نہ ہوسکے۔

آفتاب غروب ہونے کے قریب جب اننّدپال کی فوج کا سپہ سالار اسلامی لشکر کے مقابلہ سے مایوس ہوکر کسی قدر پیچھے ہٹا، تو وہ ہندو سپاہی جو مسلمانوں سے مقابلہ کر رہے تھے، میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ گئے بعض مؤرخوں کا بیان ہے کہ ہاتھی بے قابو ہوگیا اسلئے اننّدپال پیچھے ہٹا تھا ہندو لشکر یہ سمجھا کہ ہمارا سپہ سالار شکست کھا کر بھاگ رہا ہے ملکم صاحب کا بیان ہے کہ ہاتھی توپ کی آواز سے بھاگا، مگر اُس زمانہ میں توپیں کہاں تھیں اگر تھوڑی دیر کے لئے اننّدپال کا بھاگنا اتفاقی طور پر ہی تسلیم کرلیا جائے تب بھی اس امر سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صبح سے برابر لڑائی ہورہی تھی، دونوں طرف کے سپاہی اپنے اپنے حوصلے اچھی طرح نکال چکے تھے۔

غرض خدا نے مسلمانوں کو عظیم الشان فتح دی ہندوستان کی وہ مجموعی طاقت جو برسوں سے مسلمانوں کے مقابلہ کیلئے تیار کرگئی تھی بیکار ثابت ہوئی۔

حقیقت یہ ہے

سلطان محمود کو ملک گیری کا شوق نہ تھا، نہ ہندوؤں کو مسلمان بنانا نہ یہ مقصد تھا، کہ مندروں کو توڑے، بلکہ قرامطی مرکزوں کو نیست و نابود کرنا منظور تھا، یہاں ہندوستانی راجاؤں کو اپنی پیشقدمی نے سلطان محمود کو حملوں پر مجبور کردیا۔

ہندوستان کے بعض حکمرانوں نے اسلام کے مخالف قرمطی مذہب والوں کو اپنے یہاں پناہ دی تھی، نہ صرف پناہ بلکہ کافی مدد دیکر شرارت پر بھی آمادہ کیا تھا، ان وجوہ سے سلطان محمود کو مدافعت کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

درمیانی واقعات سے ظاہر ہے کہ جے پال اور اننّدپال نے کتنی مرتبہ بدعہدی کی مگر سلطان محمود برابر چشم پوشی سے کام لیتا رہا، یہی بدعہدیاں اور مذہبی رہنماؤں (پنڈتوں، برہمنوں) کی پوشیدہ سازشیں بھی محمود کے حملوں کا باعث ہوئیں، برہمنوں کی سازشوں کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ سنہ ۴۰۰ھ میں نگرکوٹ کی فتح پر نگرکوٹ کے راجہ نے سلطان محمود سے معافی چاہی اور اس کے ساتھ ہی برہمنوں کی سازش سے آمادۂ جنگ ہونے پر اظہار افسوس بھی کیا، اننّدپال نے بھی معافی چاہی محمود کی نیکی دیکھئے کہ اس نے بلا پس و پیش قصور معاف کردیا، اس کے بعد سلطان محمود نے کشمیر، قنوج، متھرا، کالنجر وغیرہ پر حملے کئے اور سب سے آخر سومنات پر حملہ کیا، کیونکہ سوم جگ اور سومنات دونوں جگہیں برہمنوں اور پنڈتوں کی مخفی سازشوں کا مرکز تھیں

فوج میں ہندوؤں کی بھرتی کیلئے سلطان محمود کا اعلان

سنہ [illegible]ھ میں سلطان محمود نے اعلان کردیا کہ جو ہندو ہماری فوج میں نوکری کرنا چاہے وہ خوشی سے کرسکتا ہے اور ہر ہندو کو وہی حقوق دئے جائیں گے جو ایک مسلمان کو دئے جاتے ہیں، ہندوؤں نے بخوشی منظور کرلیا اس طرح دس ہزار ہندوؤں کی بھرتی ہوکر ہندوستانی فوج مرتب ہوگئی، ایک اسلامی بادشاہ کے تحت یہ سب سے پہلی ہندوستانی فوج تھی۔

سوم جگ اور سوم ناتھ

سوم جگ (تھانیسر) کے بُت کے متعلق ہندوؤں کا یہ عقیدہ تھا کہ اس کے سامنے جو کوئی خودکشی کرلے اس کی نجات ہے، اس طرح ہزاروں لاکھوں جانیں برابر ضائع ہوتی تھیں، اور ہوچکی تھیں سلطان محمود نے لوگوں کو نہ صرف اس جہالت کے عقیدے سے بلکہ مخلوق خدا کو خودکشی

سے نجات دینے کیلئے یہ تدبیر سوچی کہ سومنگ کا بت اپنی جگہ سے اٹھالیا جائے، آخر اس نے ایسا ہی کیا کہ بت کو اٹھا کر غزنی لے گیا۔

سومنات کے بت کے متعلق سجان رائے مورخ نے لکھا ہے کہ وہ پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں خانۂ کعبہ سے یہاں لایا گیا تھا اس کے علاوہ سومنات کا یہ وہ مندر ہے جہاں پانسو لڑکیاں ہر وقت موجود رہتی تھیں، اس مندر میں پجاری برہمن دو ہزار تھے جس سے ان برہمنوں کے کیرکٹر اور مرکزی سازشوں کے متعلق کافی اندازہ کیا جا سکتا ہے

دیکھو! جب سلطان محمود کے پاس خالص مسلمانوں کی فوج تھی اس وقت تک اس نے نہ کسی مندر کو ڈھایا، نہ کسی بت کو توڑا، مگر جب اس کے پاس دس ہزار ہندوؤں کی باقاعدہ فوج ہو جاتی ہے تب اس کو سازشی مرکزوں کا صحیح طور پر پتہ چلتا ہے اور تب ہی وہ ایسے خاص خاص مقامات کی طرف رخ کرتا ہے۔

ناچیز فرد کاکوروی

رازہائے جنگِ عظیم!

از بریگیڈیر جنرل ایف پی کروزیر

زمانۂ جنگ میں فوجی جرائم پر سپاہیوں کے قتل کی سزا کے متعلق دارالعوام کے اندر اور باہر بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ میں حیران ہوں کہ کتنے لوگ یہ جانتے ہیں کہ فوجی قتل کیا ہوتا ہے؟

جنگِ عظیم کا زمانہ تھا، سنہ ۱۹۱۵-۱۶ء کے موسم سرما میں میں ایک لشکر کی کمان کر رہا تھا، اس وقت حالات بہت پریشان کن تھے، لیکن سپاہی بے چون و چرا مردانہ وار مقابلہ کرتے تھے۔

بدقسمتی سے ان حالات میں میرے آدمیوں میں سے ایک نے (جس نے سنہ ۱۹۱۴ء میں اپنے آپ کو بطور رضاکار پیش کیا تھا) بزدلی سے صف کو چھوڑ دیا، لیکن اسے بوتون کے مقام پر فوجی پولیس نے پکڑ لیا، اور سپاہی اُسے گرفتار کر کے لشکر میں واپس لے آئے، میدان چھوڑنے کے جرم میں میرے سامنے اسے پیش کیا گیا، میں نے اسے فوجی عدالت کے سپرد کر دیا، مقدمہ چلا جرم ثابت ہو گیا، اور قتل کی سزا دے دی گئی۔

چونکہ سزائے موت تھی اس لئے یہ صرف کمانڈر انچیف کی منظوری سے دی جا سکتی تھی، دس روز کے عرصہ میں عدالت کے تمام کاغذات میرے پاس واپس آ گئے، جن کے ساتھ سر ڈگلس ہیگ کی طرف سے سزائے موت کی منظوری بھی آ گئی۔

اس کا یہ مطلب تھا کہ میری سپاہ کو سزائے موت میرے منہ سے سننے کیلئے مجرم کے سامنے میرے زیرِ قیادت مربع شکل میں پریڈ کرنی ہوگی، مجرم کو ننگے سر اپنے ساتھیوں کے سامنے دہشتناک الفاظ سننے کے لئے کھڑا ہونا ہوگا، لیکن اس کا مطلب اس سے بھی زیادہ تھا، یعنی اگلی صبح طلوعِ آفتاب کے وقت سخت سردی میں فرانس کے ایک گاؤں کے قریب تمام سپاہ کی قواعد ہوگی، تاکہ ہمارے ساتھی کو گولی کا نشانہ بنتے دیکھیں اور اس کی دردناک آواز سنیں۔

چونکہ مجھے فوجی قتل کا پہلی دو لڑائیوں میں تجربہ ہو چکا تھا، اور میں تمام مشکلات کو جانتا تھا، اس لئے مجھے بذاتِ خود فائر کرنے والے گروہ کی نگہبانی کرنی تھی، اور زمین میں کھمبے کے گاڑے جانے کا بھی معائنہ کرنا تھا، جس کے ساتھ بدقسمت مجرم کو مضبوطی کے ساتھ باندھنا تھا، اور قتل گاہ سے چند گز دور کسی اچھے مقام کا بھی بندوبست کرنا تھا جس میں وہ بے چارہ آخری رات آرام سے گذار سکے۔

اس کے بعد میں نے پادری کو آدھ گھنٹہ کا وقت دیا تاکہ وہ ہمارے بے کس سپاہی کے ساتھ اس یاس انگیز حالت میں گفتگو کرے، لیکن پیشتر اس کے کہ اس کو اس کی کمپنی کے کمانڈر کے حوالے کیا جاتا، میں نے بذاتِ خود چند منٹ کیلئے اس سے باتیں کیں۔

آگ جلا دی گئی، ایک آرام کرسی، کتابیں، کاغذ، اور کھانے پینے کا سامان مہیا کیا گیا، وہسکی کی بوتل رم اور کیک اس کی میز پر رکھ دیئے گئے اور اس کو مکان میں اپنے حال پر تنہا چھوڑ دیا گیا۔

اگلی صبح تمام سپاہ میرے زیرِ قیادت سڑک پر چلنے لگی، مجرم کو خفیہ طور پر اس کی آخری آرام گاہ سے نکال لیا گیا، اور کھمبے کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا گیا، اردگرد کے حالات کے متعلق وہ بالکل اندھا اور بے خبر تھا، میں نے خاص طور پر ایک افسر کو فائر کرنے والے گروہ کی کمان سپرد کی اور اس کو آگاہ کیا کہ بڑے بڑے نشانہ باز بھی صبح کی سردی میں نشان کھو دیتے ہیں اس لئے تمہیں اپنا پستول بھرے تیار رہنا چاہئے، تاکہ اگر ضرورت پڑے تو ملزم کا جلدی خاتمہ کر دیا جائے۔

میں نے یہ فیصلہ کیا کہ فائر کرنے والے گروہ کو کوئی نفلی حکم نہ دیا جائے،

سپاہ کو "متوجہ" (Attention) کیا، اور میں نے دیکھا، کہ فائر کرنے والے گروہ کے افسر نے ایک سفید رومال اوپر کو اٹھایا، یہ فائر کرنے کا اشارہ تھا، جب اس نے اپنا بازو نیچے کیا تو ایک دھماکے کی آواز آئی۔

گو فاصلہ چند گز کا تھا، لیکن میرے خیال کے مطابق کئی گولیاں نشانہ پر نہ لگیں، ڈاکٹر نے معائنہ کر کے کہا، "ابھی جان نہیں نکلی"، فائر کرنیوالے گروہ کے افسر نے اپنے ریوالور سے اس کا خاتمہ کر دیا۔

ہم نے اپنے مردہ سپاہی کو چھوٹے سے قبرستان میں دفن کیا اس کی قبر کی صلیب پر اس کا نام اور موت کی تاریخ کندہ کر دی، ہم نے اپنے کسی نزدیکی کو بھی اس کی موت کے حالات نہیں بتائے لیکن اس کے بعد مجھے یہ پتہ چلا کہ تمام حالات حکومت کی طرف سے شائع کئے گئے، اگر یہ سچ ہے تو میں اسے بے ضروری ظلم اور بے دلی کا کام خیال کرتا ہوں، مجھے بتایا گیا کہ حالات شائع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ نہ کیا جاتا، تو اس کے پس ماندگان پنشن کے حق دار تھے، کیونکہ ان کا روٹی کمانیوالا "میدان جنگ میں مرا تھا"

کیا یہ دلیل درست ہے؟ اس کی بیوہ اور اس کے بچوں کو ایسے حالات میں کیوں پنشن نہ دی جائے؟ جنگ میں قسمیں مختلف ہوتی ہیں، کچھ تو ہیرو بن جاتے ہیں، اور کئی ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی قبروں پر بزدلی کی صلیب نصب کی جاتی ہے، لیکن پس ماندگان دونوں کے ہوتے ہیں۔

تمام اقسام کے آدمی کرنیل سے لے کر معمولی سپاہی تک جو میدانِ جنگ میں کام آئے، نقصانات کی فہرست میں شامل کئے گئے اس طرح ان کے پس ماندگان زیادہ سے زیادہ پنشن کے حقدار ہیں، لیکن یہ ایک غیر دانشمندانہ اور غیر منطقانہ بات ہے کہ جو شخص قانونی طور پر قتل کیا گیا ہو اس کے پس ماندگان کو پرورش سے محروم کیا جائے،

ایک لڑائی میں ایک کرنیل نے دوسرے کرنیل کو گولی کا نشانہ بنا دیا تاکہ حالات کو درست کیا جائے، اور بورن وڈ کی لڑائی میں میرے کرنیلوں میں سے ایک نے لشکر کے کسی دستے کے کئی آدمیوں کو گولی سے مار دیا تاکہ موقع کو بچایا جائے۔

جنگ میں بزدلی بمشکل ثابت کی جا سکتی ہے قانونی طور پر ثابت شدہ بزدلی (جو کہ ایک افسر سے سرزد ہوئی) کا ایک واقعہ دورانِ جنگ میں میری اطلاع میں آیا، فوجی عدالت نے افسر کو پایا، لیکن کسی وجہ سے جو کہ جنرل ہیڈ کوارٹر کے قانون دان ہی جانتے ہیں اسکو بالکل بری کر دیا گیا۔

اگر بزدلی "حالات کی دلیر فتح" کا نام ہے، تو مجھے ایک جرنیل کی بابت علم ہے جس پر بلاشک و شبہ بزدلی کے ارتکاب کا مقدمہ چلنا چاہئے تھا، لیکن سزا کی بجائے اسے ترقی دی گئی۔

جتنا اونچا مرتبہ ہوگا اتنی ہی ذمہ داری زیادہ ہوگی، ایک سپاہی (میرے ذہن میں ایک مخصوص واقعہ ہے جہاں ایک آدمی کو بزدلی کے لئے سخت سزا دی گئی) اپنی بری مثال سے اپنے ارد گرد کے سپاہیوں پر خواہ کتنا ہی برا اثر ڈالے، لیکن اگر ایک جرنیل مقابلہ کے وقت جنگ اور اپنے سپاہیوں کا دل میں خیال لائے بغیر بزدلی سے میدان چھوڑ دے تو ذمہ داری کا بوجھ سب سے زیادہ اس کے کندھوں پر ہوگا، لیکن بزدل دونوں ہی ہیں۔

میرا ایک ماتحت افسر ایک جنگ میں بلاشبہ بزدلی کا مجرم تھا لیکن میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر فوجی عدالت میں اس پر مقدمہ چلا، تو ممکن ہے وہ بری ہو جائے اور اس حالت میں وہ شاید عزت حاصل کر لے، لیکن اس نے استعفا دے دیا۔

۱۲ اپریل ۱۹۱۸ء کو ایک لڑائی میں مجھے تمام فوج کی کمان دی گئی وہاں جنگ کی حالت ہمارے برخلاف جا رہی تھی، مجھے حکم ملا کہ افسروں کو یہ فرمان سنا دوں:

"کوئی افسر اگر پیچھے ہٹے گا، تو وہ فوجی عدالت میں اپنے عمل کیلئے جواب دہ ہوگا"

لیکن میں نے یہ حکم نہیں دیا کیونکہ حالات کے مطابق یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بڑا سخت حکم تھا، میں اپنے افسروں کو جانتا تھا، کہ وہ مقامی حالات کو احکام صادر کرنے والے افسروں کی نسبت زیادہ سمجھ سکتے تھے،

میرے خیال میں بزدلی پر فوجی قتل کا سوال وضاحت طلب ہے کیا یہ معمولی سپاہی اور جرنیل پر یکساں عائد ہوتا ہے؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ بعض اوقات دونوں میدان چھوڑنے کے مجرم ہوتے ہیں اگر قانون دونوں بزدلوں پر یکساں عائد نہیں ہوتا تو اس کو ہمیشہ کیلئے منسوخ کر دینا چاہئے، ہم اسے دونوں طریقوں پر نہیں رکھ سکتے۔

باغی سپاہی کا قتل اس سے مختلف عنوان کے تحت آتا ہے کیونکہ

غدر عموماً غفلت یا بدانتظامی کی وجہ سے رُونما ہوتے ہیں، بغاوت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہی معاف کیا جاسکتا ہے بلکہ رفع کیا جا سکتا اور دبایا جاسکتا ہے

۲۷ سال قبل مغربی افریقی رجمنٹ کی بغاوت کے سرگروہوں کے قتل سے مجھے بہت افسوس ہوا کیونکہ وہ دو یا تین آدمی جو اپنے فرض سے غافل رہے بغاوت کا سبب ہوئے، لیکن باغیوں کے ساتھ قتل نہیں کو گو اس طرح التوائے جنگ کے بعد بہت سی بغاوتیں جو فرانس اور دیگر مقامات پر ہوئیں، رفع کی جاسکتی تھیں اگر افسران خیال رکھتے اور قابل آدمیوں کو جو جس عہدے کے اہل تھے، اسی عہدے پر مقرر کیا جاتا۔

التوائے جنگ کے بعد مجھے ان بغاوتوں کے فرو کرنے پر مامور کیا گیا اس عرصہ میں جتنی بغاوتیں ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہ تھی، جو بغیر کسی معقول وجہ کے ہوئی ہو، ایک بغاوت کی وجہ یہ تھی کہ سپاہیوں کو بدانتظامی اور رسد کی کمی کی وجہ سے پیٹ بھر کر کھانا بھی نہ ملتا تھا، دوسری میں سپاہیوں کو گھوڑوں سے بھی پہلے برطرف کر دیا گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک سپاہی کو گھوڑوں کی خبر گیری بھی کرنی پڑتی تھی اور یہ ایک سخت غلطی تھی۔

ایک فوجی قتل جس کا میرے ساتھ گہرا تعلق ہے، کانوسو کوٹو کی لڑائی میں بمقام کونو واقعہ شمالی نائیجیریا ۱۹۰۳ء میں ہوا، ایک دیسی سپاہی نے کسی دیسی سوداگر کی چوری کی اور اسے کانو کی مارکیٹ میں قتل کر دیا۔ اس جرم کی پاداش میں اس پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا، اور گولی سے اڑا دیا گیا۔ بجائے اس کے کہ دیسی سپاہیوں کی پارٹی کے نشانے پر اعتبار کیا جاتا مجرم کو نزدیک سے میکسم گن کے فائر سے ختم کر دیا گیا۔

میں فرانس کے تجربہ کی بنا پر جبکہ ایک مجرم کو افسر نے گولی کا نشانہ بنایا یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ فوجی قانون میں یہ فقرہ لکھ دیا جائے "جب کبھی بھی موقع آئے قتل مشین گن کے فائر سے کیا جائے"

یہ ذرا اچھا معلوم نہیں دیتا کہ سپاہیوں کو ایسے خوفناک کام کی انجام دہی کیلئے مقرر کیا جائے، بلکہ اس زمانہ میں مشین پر اعتبار نہ کرنا کوتاہ اندیشی اور بے رحمی ہے۔

اگر زیادہ توجہ اس طرف دی جائے کہ صرف قابل اور لائق افسروں کو ہی ترقی ملے اور قابلیت کو ہی ترقی کا معیار مقرر کیا جائے اور رجمنٹوں کے افسروں کو سٹاف افسر اس وقت تک نہ بنایا جائے جبتک وہ لائق اور قابل ثابت نہ ہوں اور افسر اس صفت کے مالک ہوں کہ اپنے اعلیٰ خیالات کو عملی صورت میں پیش کر سکیں تو بہت سے اسباب جنکی وجہ سے مجرم سپاہیوں کو گولی کا نشانہ بنایا جاتا ہے دور ہو سکتے ہیں، اور سزائے موت کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے جو فوجی جرائم پر دی جاتی ہے۔

کیا ہی بہتر ہو کہ جہاں تک فوجی قتل کا تعلق ہے بہترین سپاہی فیلڈ مارشل سر ولیم رابرٹسن کی نصیحت پر عمل کیا جائے وہ فرماتے ہیں:-

"ہر ایک مرد اور عورت کا فرض ہے کہ وہ ان تمام کوششوں کی تائید کریں جو جمدانہ اور عقلمندانہ طریق پر بین الاقوامی نزاع کا فیصلہ کرنے کیلئے کی گئی ہوں بجائے اس کے کہ تباہ کن اور بے کار طریقے اختیار کئے جائیں جن پر بے فائدہ اب تک بھروسہ کیا جارہا ہے"

اس وقت تک ہم کو اپنی تمام توجہ ان اسباب کی طرف دے دینی چاہئے جن کی وجہ سے فوجی قتل کئے جاتے ہیں اس لئے کہ ان کا اثر بہت کم ہو جائے۔

(مترجمہ محمد لطیف جعفری بی۔ اے)

خط و کتابت کے وقت

اپنے نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا کیجئے بغیر اس کے ارشاد تعمیل میں بہت دقت پیش آتی ہے۔ مینیجر



سیّاح عورت کی ڈائری!

یا

(سیّاح عورت کا خط اپنی سہیلی کے نام)

از مس حجاب امتیاز علی صاحبہ

سمجھکر ہوتی ہے تسکین یہ پیاری تحریر
نسخۂ دردِ جگر ہے نہ تمہاری تحریر

پیاری جسوتی!

ع زندگی کی بہار دیکھو تم

پیار - تمہارا پچھلا خط مجھے بندرگاہِ عباس پر ملا تھا، مگر جی نہیں چاہتا، کہ اس کا شکریہ ادا کروں، وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کا شکریہ ادا کیا جائے! کڑوی کڑوی باتیں اور نامعقول جملے لکھے ہیں تم نے! شاید تم نے جلے دل اور جلی صورت سے یہ خط لکھا ہے جبھی تو اس کا یہ حال ہے! سے

رُو ٹھتے وقت ذرا آئینہ لے کر دیکھو
منہ بنانے سے بگڑ جاتی ہے صورت کیسی

میں تمکو خط نہیں لکھتی؟ ٹال دیتی ہوں؟ اچھا یہ خیال ہے تمہارا!! تو تم سمجھتی ہو کہ میں بھی تمہاری طرح خلیفۂ بغداد ہوں اور سلطان کے محلوں کی چار دیواری میں عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہی ہوں؟ وہ زندگی اب میرے لئے خواب و افسانہ ہوگئی - دیوانی لڑکی! تم کو کیا خبر کہ زندگی اور اس کی کشمکش کیا چیز ہے؟ - آہ جسوتی! ہم سیاحوں کی زندگی بجائے خود، ایک جادو بھرا خواب ہے جس کی تعبیر تعجب خیز ہے، اک عجیب و غریب کتاب ہے جس کا ہر ورق عبرت انگیز، ہر سطر سبق آموز ہوا کرتی ہے، جسوتی! تم اک گھریلو نازپروردہ بلبل ہو، جو محلسراؤں کے پائیں باغوں میں شمشاد سرو کے درختوں پر بیٹھا رازِ عشق کے ترانے الاپا کرتا ہے مگر مجھ سیاح لڑکی کی مثال اک وحشی ہرنی کی ہے جو دُنیا کے مختلف صحراؤں، ویران بیابانوں میں اپریل کے بے قرار بادلوں کی طرح بھاگتی پھرتی ہے!

جسوتی! آہ ... تم کو کیا خبر، کہ ہماری زندگی کا اک اک دن اور دن کا اک اک لمحہ، کن بے قراریوں، بے چینیوں اور شورشوں میں کٹتا ہے! میں ذیل میں اپنی ڈائری کا ایک صفحہ نقل کروں گی، تاکہ تم کو اندازہ ہو جائے، کہ ہم سیاحوں اور افسانہ نویسوں کی زندگیاں اگرچہ لاابالی ہوتی ہیں مگر اس کے ساتھ ہی کس قدر دلچسپ اور کس قدر "رومانوی" —— (Romantic) ہوا کرتی ہیں، لو خدا حافظ - آئندہ پھر میری شکایت نہ کرنا! خبردار —

تمہاری، تمہاری، تمہاری

ہندوستان ۱۱ - اپریل ۱۹۳۰ء کی ڈائری

دن گرم ہوتے آتے ہیں، چنانچہ رات بہت گرم مجھ سے کمرے میں سویا نہ گیا، برقی پنکھوں سے نفرت ہوگئی، دل فطرتی خنکی کیلئے مچلنے لگا، اس لئے سامنے برآمدے میں گلاب کے تختہ کے پاس سو گئی رات بھر سیاہ سیاہ بھونرے میرے سرہانے عشقیہ غزلیں الاپتے رہے، بڑے عاشق مزاج کیڑے ہوتے ہیں، پاس ہی اک شمشاد کے درخت پر نرگس چشم بلبل بھی رات بھر نغمہ گاتی رہی -

میں رات بھر خوب صورت خوب صورت اور مزے دار خواب دیکھتی

کبھی دیکھا کہ میں جہاز میں ہوں اور جہاز جنت کا دروازہ توڑ کر اندر چلا گیا ہے جہاں غلمان نفیس فلالین کے سوٹ میں کھڑے مسکرا رہے ہیں اور میرے منتظر ہیں، میرے ہارلی انھیں رقابت آمیز نفرت سے گھور رہے ہیں اے میرے خدا عجیب پُر لطف خواب تھا، (جسوتی! واللہ ہم سیاحوں کے خواب بھی کیسے عجیب وغریب ہوتے ہیں!!)

یہ خواب دیکھکر میں بے حد مسرور ہوئی کہ بے ساختہ نیند میں ہنس پڑی میری ہنسی کی آواز سُن کر بوڑھی نرس نانش دوڑی دوڑی آئی اور میری آنکھ کھل گئی، سامنے تپائی پر ابھی تک برقی لیمپ ہلکی ہلکی روشنی سے نیلی ساٹن کے فانوس میں جل رہا تھا، اور اس کے پاس ہی تعبیر نامہ پڑا تھا، ٹائم پیس میں دیکھا تو پانچ بج رہے تھے، آج کوئل غیر معمولی صبح ہی صبح باغ میں آم کے درخت پر بیٹھی زور زور سے چیخ رہی تھی، آہ سُریلی سیٹیاں! کس قدر دلسوز موسیقی ہے، اس کی! معبود! آخر یہ ماتمی چڑیا اپنی زندگی کی کون سی داستان آج صبح ہی صبح دہرا رہی ہے؟ مگر لوگ کہتے ہیں کہ صبح صبح کوئل کا گانا شروع ہوا کرتا ہے، کیونکہ کوئل کا صبح کی افتتاح کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ آج غیر معمولی گرم ہوا چلے گی! آگ برسے گی، اور اپریل کی برساتیں ہوں گی، جن کے بعد آتشی جھونکے فضا میں پھیل جائیں گے اور دوسرے دوسرے خطرناک کام ہوں گے۔

آج کوئل کے نغمہ نے میری روح کی آنکھوں کو کھول دیا، میں تھوڑی دیر "تعبیر نامہ" دیکھتی رہی، پھر مسکرا کر ایک نیلی ریشمی چادر جسم سے لپیٹ لی، باغ میں نکل آئی، جہاں کوئل اب تک کوک رہی تھی، آج طبیعت بڑی شگفتہ ہے، مگر دور افتادگوں کی یاد بے طرح ستا رہی ہے جنرل ہارلی کی فیروزی فیروزی آنکھیں اور خوب صورت بھرے بھرے بازو۔ اور جسوتی کی نازک سراپا بھولی بھالی صورت یاد آ رہی ہے، یا نصیب!!! وہ محبوب ترین خوب صورت شخص ہارلی، اور وہ رازدار پیاری دوست جسوتی، جن کے ساتھ مل جل کر رہنا میرے لئے عین سبب حیات ہے آج، آج کی خوشگوار صبح مجھ سے کوسوں دُور ہیں ؎

بچھڑے نہ زمانے میں کوئی دوست سے اپنے
یارب یہ کسی کو نہ دے آزار جُدائی

آج میرا مصمم ارادہ ہے کہ جسوتی کو خط لکھوں، اس کا آخری خط مجھے دو ماہ قبل بندرگاہ عباس پر ملا تھا، دن کے نو بجے تک میں باغ میں آم اور دوسرے نادر درختوں کے سائے میں گھومتی رہی، کیونکہ آج موسم بہت خوشگوار تھا، مگر سورج کے بلند ہوتے ہی موسم بدل گیا، میں ساڑھے نو کو ناشتہ کھانے طعام خانہ میں آئی، اک دریچے میں بیٹھ کر چاء پینے لگی، سامنے آسمان پر انگارے کی طرح چمک رہا تھا، اور زمین دوزخ کی طرح جھلسی جا رہی تھی، فضا میں ایک سرخ رنگ کی گرم روشنی لہریں لے رہی تھی، بالکل دوزخ کا موسم! (الٰہی! تو کل انسانوں کو دوزخ کی آگ سے بچا، عذاب النار سے بڑھکر دوسرا عذاب نہیں ہو سکتا!) خدا کی پناہ ایسے موسم خوب صورت چہروں کیلئے مضر ہوتے ہیں، آج ارادہ ہو رہا ہے کہ اپنے چہرے کی حفاظت کیلئے کسی سرد ساحل پر چلی جاؤں، (جسوتی! آج کل کے سائینٹسٹ بڑے کاہل واقع ہوئے ہیں، کوئی ایسا طریقہ سوچ کر ایجاد نہیں کرتے، کہ لوگ برائے چندے تبدیل آب وہوا کے لئے جنت وبرزخ میں ہو آیا کریں)

غرض دس بجے ناشتہ ختم ہُوا، اس کے بعد میں نے برآمدے کے بیتے پر بیٹھکر جنرل سر ہارلی کو چار صفحوں کا ایک لمبا ملامت نامہ لکھا، جسمیں صبر کی تلقین کی، اور شکر کی تعریف مضمون ان کے مطلب کا تھا ؎

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر
سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر
عشق بازی کا اگر حوصلہ رکھتا ہے امیر
دل جو لوہے کا تو پتھر کا جگر پیدا کر

گیارہ بجے تک ان کو خط لکھتی رہی، چند پُرانے دوستوں کے خطوط اتفاقاً نکل آئے، ان کو بہت دیر تک پڑھتی اور متاثر ہوتی رہی، ان میں بہت سے خطوط پیاری جسوتی کے تھے، جو مجھ سے بہت دور، عرب کے رومانوی (Romantic) ریگستانوں میں زندگی بسر کر رہی تھی، بعض خطوط ہز اکسلینسی جنرل سر فیروز ہارلی کے تھے، جو مجھ سے ہزاروں کوس دور، میدان جنگ کی شعلوں میں زندگی بسر کر رہے تھے، اُن کے خطوط کیا تھے اُنہیں انسائیکلوپیڈیا کہیئے، کسی میں غصے کی تلخی، تو کسی میں پیار کی چاشنی، کسی میں ناراضی کی پکار، تو کسی میں الفت کا اظہار، وہ آدمی کیوں ہونے لگا! گھڑیال ہے، آج دن بھر مجھے ان خطوں کا خیال رہے گا۔

ساڑھے بارہ بجے کھانا کھایا، آج کھانے میں خوب مرچ تھی، معلوم ہوتا تھا۔ بوڑھی حبشن (زوناش) نے خوب افیون کھا کر تب کہیں کھانا تیار کیا ہے، بدحواسی کی حد ہو گئی تھی، گاجروں کے حلوہ میں نمک بھر دیا تھا اور بھنے ہوئے گوشت پر شکر لپٹی ہوئی تھی، اسی پر اکتفا نہیں، ہر چیز میں مرچ بھی تھی، مثلاً چائے میں مرچ، فرنی میں مرچ، روٹی، حلوہ، لیموں کے شربت میں مرچ، یادگار دن ہے! اب مجھے یاد آتا ہے، واقعی کوئل کا صبح صبح گانا کسی قدر خطرناک ضرور ہے!

میں کھانا کھا کر اٹھی تھی، کہ زوناش نے ایک خط پیش کیا، معبود! میرا تو دل پہلو سے نکل گیا، جنرل سر ہارلی، محبوب ترین ہارلی کا محبت نامہ! محبت میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی، اور تصوری آنکھ کسی اک حسین اور وجیہہ مجسمہ کو دیکھ رہی تھی، مگر خط کی آخری سطریں بہت امید شکن اور خطرناک تھیں، واقعی بعض لوگ سچ کہتے ہیں، کوئل کا صبح صبح گانا خطرناک ہوتا ہے خط میں لکھا تھا، کہ ہارلی دو ماہ بعد میرے ہاں تشریف لائیں گے، اس کے معنے یہ۔ کہ وہ ادھر دروازے سے گھر میں قدم رنجہ فرمائیں گے، ادھر کھڑکی سے ہماری سیاحی آزادی تشریف لے جائیگی، وہ عشق و محبت کے غیر دلچسپ اور ناپائدار پنجرے میں مجھے طوطی کی طرح محبوس کر کے پالنا چاہتے تھے اور میں ریگستان عرب کے بگولوں کی طرح جنگلوں کی خاک چھاننا پسند کرتی تھی، آہ! کس قدر فرق ہے ہم دو محب و محبوب میں، ع

"وہ آسمان کی اور ہم زمین کی کہتے ہیں"

اک سے دو تک میں اپنی خوابگاہ میں لیٹی "مزار عمر خیام" پر اک نظم موزوں کرتی رہی، ڈھائی بجے میں نے غسل کیا، اور سمندری رنگ کا اک نفیس لباس پہن کر بندرگاہ گئی، ہم سیاحوں اور بحری لوگوں کو بندرگاہوں اور سمندروں سے اک ازلی رشتہ ہوتا ہے، اس لئے اگرچہ کوئی خاص کام نہ تھا تاہم جہاز پر پہنچی، جہاز کے اک اک کونے، اک اک کمرے کو چھان مارا اتفاق کہئے، یا شدنی امر! کہ انہیں کمروں میں سے اک کمرے میں سے سر ہارلی نکل آئے، یا وحشت! روح لرز گئی، گویا آزادی جاتی رہی، بے ساختہ میری زبان سے اک چیخ نکل گئی۔

"کہ واقعی کوئل کا صبح صبح گانا نہایت خطرناک ہے"

مگر دوسری طرف منہ پھیر کر کہا:-

خوش آمدید پیارے ہارلی! دیکھو! "دل را بدل رہیست" تم کو لینے ہم بندرگاہ پہونچ گئے۔

"حجاب اسمٰعیل"

غزل

از عبد اللطیف اختر ملک نیوز ایجنسی

سُنتے ہی نہیں مری کہانی — اللہ رے غرورِ نوجوانی
ہیں میرے لئے مثالِ عنقا — اسبابِ نشاط و کامرانی
دستِ ساقی میں جام مے ہے — یا ہے مری گم شدہ جوانی
فطرت کی ستم ظریفیاں ہیں — دی حسن کو طرزِ جاںستانی
چلتے ہیں ہوائے غم کے جھونکے — بجھ جائے نہ شمعِ زندگانی
گزرا ہے الم پرستیوں میں — وہ وقت کہ ماحصلِ جوانی

اختر کی یہ شاعری ہے گویا
قلبِ محزوں کی ترجمانی



ساقی

رُوح کا چین

از مسٹر حسن عزیز جاوید

رام نگر کے جادو نندن بابو کی موت کا حال سُن کر ہر شخص کی زبان سے بے اختیار نکل گیا کہ "ملک کی ایک نامور ہستی ناپید ہوگئی!"

بڑا بیٹا ہری نندن، باپ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوکر آدھی رات کے وقت گھر پہنچا اور اپنے بستر پر منہ لپیٹ کر پڑ رہا، اس رات اور دوسرے دن بھر وہ بستر سے نہ اُٹھا، کچھ کھایا پیا بھی نہیں کسی سے ایک بات تک نہ کی، ہری نندن کی ضدی طبیعت سے سب واقف تھے اس واسطے کسی نے اسے کھلانے پلانے اور اُٹھانے کی چنداں جدوجہد نہیں کی۔ صرف اس کی ماں ستیہ وتی نے خوب کہہ سُن کر ایک گلاس شربت پلایا تھا

تیسرے دن ستیہ وتی نے آکر آواز دی ——— ہری! اٹھو بیٹا۔ تم سب سے بڑے ہو۔ چھوٹے بھائی بہنوں کو تم دم دلاسا نہ دوگے، ان کے سر پر دست شفقت نہ پھیروگے تو پھر کون پھیریگا۔ بس بہت غم ہوچکا۔ اس غم سے کچھ تمہارے باداجان تمہیں مل تھوڑا ہی جائیں گے۔ تمہارے چچا کتنی مرتبہ پکار پکار کر چلے گئے۔ چلو باہر جاؤ سب مل کر مشورہ کرو کہ شرادھ کی رسم کیسے انجام کو پہنچے گی۔ تین دن تو گزر گئے اور سات دن باقی ہیں خدا کسی نہ کسی طرح کاٹ دے گا۔ اس کے بعد سوال کرنا ہی پڑے گا۔

ہری نے ماں کی باتیں سُن کر آنکھیں ملیں۔ اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ آج اپنی زندگی میں پہلی بار اپنی سہاگن ماں کو بیوگی کے عالم میں دیکھا تھا بچوں کی طرح بے اختیار چلا چلا کر رونے لگا۔ بچے کو جس طرح چُپ کیا جاتا ہے اسی طرح اپنے چوبیس سالہ بیٹے کی پیٹھ سہلاکر، روتی آواز میں ماں نے کہنا شروع کیا "پاگل ہوگیا ہے، چل چپ رہ خدا کی یہی مرضی تھی"

ہری تھوڑی دیر کے بعد چُپ ہوگیا، پھر آنسو پونچھکر آہستہ آہستہ باہر آیا۔

برآمدے میں ہری کے چچا رگھو نندن آنکھیں بند کئے اداس بیٹھے تھے، بازو سے اس کے دور کے رشتے کے بوڑھے دادا ——— رام ناتھ بیٹھے ہوئے تھے، رام ناتھ نے اسے دیکھتے ہی کہا ———

آؤ بھائی بیٹھو، رنج کرنا فضول ہے بھائی! دنیا کا یہی قاعدہ ہے۔ دیکھو میں جادو سے پندرہ برس بڑا ہوں، بال پک گئے، دانت ایک ایک کرکے سب گر گئے، مگر موت کے سمندر کے کنارے بیٹھا ہی رہ گیا۔ اور وہ مجھ سے بازی لے گئے، پہلے ہی اس سمندر کے پار ہوگئے۔

ہری نے ایک مرتبہ پھر آنسو پونچھے اور رام ناتھ کو مخاطب کیا ——— ماں نے آپ لوگوں کے پاس بھیجا ہے۔ آپ مشورہ دیجئے شرادھ کس طرح کرنا چاہئے۔"

جتنے آدمی بیٹھے تھے سب اپنی اپنی آرا کا اظہار کرنے لگے۔ کسی نے کہا ——— "بھائی جان بڑے آدمی تھے بہت ہر دلعزیز ان کی شرادھ میں تمام برادری کو اکٹھا کرنا لازمی ہے" کوئی فرمانے لگے ——— جگہ جگہ کے پنڈتوں کو مدعو کیا جائے، اور انہیں اتنا دیکر رخصت کیا جائے کہ وہ بھی عمر بھر یاد رکھیں کہ ہاں کوئی مقتدر ہستی اس دُنیا سے اٹھی تھی!"

ایک صاحب نے یوں ہمدردی ظاہر فرمائی ——— بھئی تم نے تو ایک فرد بناکر مخلصی پائی، لیکن اس پر غور نہ کیا کہ شرادھ کرنے والوں کی کتنی حیثیت ہے۔ اور کس قدر گنجائش ہے!"

شیام ناتھ رام ناتھ کے چھوٹے بھائی اب تک چُپ تھے، انہیں سیاق والی پر بہت ناراضی تھی۔ وہ کہنے لگے ——— "آپ لوگ جتنے مُنہ اتنی باتیں کر چکے، ہری ابھی بچہ ہی ہے بڑھانے سے وہ اور بھی بھڑک جائیگا، جتنی چادر اُس کی ہے اس سے بھی آگے پاؤں پھیلانے لگے گا، بہتر یہ ہے کہ بہو کو یہاں بلا لو، وہ اپنی وسعت اور استعداد زیادہ سمجھتی ہیں۔ انہی کے روبرو اس کا تصفیہ کرو۔"

ایک آدمی ستیہ وتی کو بُلانے چلا گیا

تھوڑی دیر میں ستیہ وتی اوڑھے لپیٹے آموجود ہوئیں، انہیں دیکھکر ہر شخص کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، سادہ زری کی تاسند پر جیبال زہین، اور تعلیم یافتہ عورت کا سہاگ خدا نے کس لئے اجاڑا؟

شیام ناتھ نے خیال کیا کہ اب اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں گی اور جو خاص بات ہے رہ جائے گی، اس لئے وہ کہنے لگے ——— "تو بہو آگئیں، اب کہ سن لو" پھر خود ہی کہنا شروع کیا ——— جادو کی شرادھ ان کی عزت و توقیر کے موافق کرنا چاہئے اس میں تو کوئی کلام نہیں ہے، مگر اپنے خیال کے بموجب کہہ سکتا ہوں کہ ان کے اخراجات بہت شاہانہ تھے، لہذا وہ کچھ زیادہ ترکہ چھوڑ کر نہ گئے ہوں گے پھر یہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ تین بھائیوں کے بیچ میں ہری سب سے بڑا ہے، باقی دونوں بچے ابھی سن شعور کو نہیں پہنچے، ابھی پڑھ رہے ہیں، ان کی تعلیم کے لئے بھی روپیہ درکار ہوگا ———"

ششتانک جادو نندن کا دور کے رشتے کا پھوپھی زاد بھائی کہنے لگا ——— "اتنی دور کی ہم آپ ہی کو سوجھ رہی ہے مرحوم بھائی کے وقت میں ایسی باتیں نہیں سنی جاتی تھیں، وہ دل کے بڑے غنی تھے، پھر ہماری آپ کی طرح وہ کچھ مفلس بھی نہ تھے، کچھ زیادہ نہ چھوڑ مرے ہوں گے یہ غلط ہے، رگھو کو جو کلکتہ میں کپڑے کی دکان لگا دی تھی، اس دُکان کی آمدنی بھی تو آج دن کچھ کم نہیں ہے، رگھو کے نام سے دکان ہے، لیکن مرحوم بھائی ہی کی تجارت ہے اس سے آج کون باخبر انکار کرسکتا ہے؟ ہری بھی خدا کے فضل سے روزگار کرکے روپے پیدا کرتا ہے۔ اب اگر ہری اور رگھو اپنے بزرگ کی شرادھ دل کھول کر نہ کریں گے تو دنیا یہی کہے گی کہ ان لوگوں کو جادو نندن کی زندگی پیاری نہیں تھی بلکہ روپیہ پیارا ہے۔"

ہری پریشان کر بے چین ہوکر بولا ——— "آپ لوگ جتنا مناسب سمجھیں، اتنے روپے خرچ کرنے میں مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔"

ششانک نے کہا ——— "شاباش! سعید اولاد اسی کو کہتے ہیں اب رگھو کی رائے اور معلوم ہو جائے تو ہم لوگ اخراجات کا تخمینہ مرتب کریں۔"

رگھو نے چیں بجبیں ہوکر کہا ——— "آپ میری کیا رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں"

ششانک نے ہمدردانہ لہجے میں کہا ——— "رگھو سیدھے رستے پر آؤ، دکان سے شرادھ کے واسطے کتنے ہزار روپے دو گے بولو؟"

رگھو نے خشمگیں آواز میں جواب دیا ——— "میں دکان سے ایک پیسہ نہیں دے سکتا"

ششانک نے سوال کیا ——— "خیر اگر ابھی نہیں تو بعد میں دو گے؟"

رگھو کو اور زیادہ غصہ آگیا۔ اس نے تندی سے کہا ——— "نہ ابھی دے سکتا، نہ اور کبھی، اس کام کے لئے دکان سے روپیہ نکال کر خرچ کرنا میرے لئے ازبسکہ محال امر ہے"

رگھو کو ناراض دیکھکر ششانک بہت مسرور ہوا۔ اس نے زہرخند کے ساتھ کہا ——— "خیر کوئی مضائقہ نہیں لیکن کم از کم اتنا تو بتاؤ کہ تمہارے لئے یہ امر محال کیوں ہے؟"

رگھو پر اس ہنسی کا ذرا اثر نہیں ہوا۔ وہ کہنے لگا ——— "میں بہت تنگ دست ہوں۔ دکان میں سے روپیہ نکالنا بھی میرے اختیار سے باہر ہے۔"

ششانک نے کہا ——— "تم نے گزشتہ ہفتے پانچسو روپے مرحوم بھائی کو بھیجے تھے، وہ کہاں سے آئے تھے؟ اب بھائی مرگئے تو تم بیک دم تنگدست ہوگئے؟"

رگھو ناک بھوں چڑھا کر چپ ہوگیا۔

ہری سے تحمل نہ ہوسکا، وہ کہنے لگا ——— "اگر یہی رنگ رہا

تو چچا میاں والد صاحب کے شرادھ کی رسم ملتوی ہی رہیگی؟"

رگھو نے غصہ میں ہری پر نگاہ ڈالی، پھر کہا ——— "نہیں ملتوی رکھنے کی ضرورت کیا ہے، بھائی جان بچپن سے ہمارے اور سب بچوں کے نام ہر مہینے کچھ نہ کچھ رقم ڈاک خانے میں جمع کرا دیتے تھے، میرے نام پانچسو روپے جمع ہو چکے ہیں، وہ روپے اس کام میں لگانے کیلئے میں آمادہ ہوں، تم لوگ بھی اپنے اپنے حساب میں سے کچھ روپے دو، اس طرح ایک ہزار روپے کے لگ بھگ ہو جائیں گے، شرادھ کے لئے یہ رقم کافی ہے"

ششانک سنبھل کر بیٹھ گیا اور طیش کے ساتھ کہا ——— "ملک کے نامور وکیل جادو نندن بابو کی شرادھ اور صرف ایک ہزار روپیہ! رگھو خوب بات کہی لائق بھائی ایسے ہی ہوتے ہیں، اس سے تو یہ بہتر ہے کہ اپنے یتیم اور مظلوم بھتیجے کو مشورہ دو کہ وہ گنگا کی ریت لائے، اس کے لڈو بنائے اور متوفی باپ کے نام سے انہیں ندی میں بہادے،

رگھو نے کہا ——— "اگر خاندانی حالت ایسی نازک ہوتی تو یہ مشورہ دینے میں بھی مجھے تامل نہ ہوتا"

اب ششانک ہری کی طرف مخاطب ہوا ——— "کیوں جناب! سن لی اپنے چچا جان کی بات، اب بالو کے لڈو بناؤ اور دریا میں بہادو، دیکھو خبردار، کہیں تجوری میں رکھی ہوئی رقم کو ہاتھ لگنے پائے!

لفظ "ریت کے لڈو" کی بار بار تکرار سن کر ہری کو بڑا طیش آتا تھا، چنانچہ ایک بار اس نے بے ساختہ کہا ——— "چچا! آپ کی زبان سے متوفی والد کی شان میں "ریت کے لڈو" الفاظ سننا گوارا نہیں، اس قسم کی گفتگو آپ کے لئے مناسب نہیں تھی"

بیچارے رگھو نے خود ریت کے لڈو کا قصہ نہیں چھیڑا تھا، اس نے تو محض اتنا کہا تھا کہ اگر حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہوتے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا، لیکن اب اس پر اتہام لگایا جا رہا تھا، چنانچہ وہ برداشت نہ کر سکا اور کہنے لگا ——— "مناسب یا نامناسب، میں تم سے کم نہیں جانتا ہری، تمہیں مجھے سکھانے کی ضرورت نہیں ہے"

ہری اس کا کوئی سخت جواب دینا چاہتا تھا کہ اتنے میں جتیہ وتی نے دخل دیا ——— "اس غمی کے موقع پر بحث مباحثہ اچھا نہیں لگتی، بس ہری چپ رہو، دیور جی! آپ بھی بس کیجئے، ان کی شرادھ کیلئے کسی کے رحم پر مجھے بھروسہ نہ کرنا پڑیگا

وہ مجھے کم از کم ایسی حالت میں چھوڑ کر نہیں سدھارے ہیں، آپ سب مل جل کر اس آخری فرض میں میرا ہاتھ بٹاتے تو بہتر تھا، لیکن اب جبکہ یہ محال معلوم ہوتا ہے تو خیر، میں اپنی عقل اور مقدور کے موافق خود جیسا بنے گا، اسے انجام دوں گی، مزید ہمدردی اور مباحثے کی ضرورت نہیں ہے، مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے اپنے بے شمار عزیز و اقربا کو وقتاً فوقتاً روپیہ قرض دیا ہے، مقروضوں کے دستاویزات بھی موجود نہیں ہیں، لیکن وہ سب اصحاب اس آڑے وقت پر اپنے اپنے قرضوں کا تھوڑا حصہ بھی ادا فرمائیں تو بہت کچھ کام چل سکتا ہے"

شیام ناتھ بول اٹھے ——— "بہو! تم نے معقول تجویز سوچی ہے جادو نے ایک وقت مجھے بھی پانچسو روپے ادھار دیئے تھے، سب تو نہیں ہو سکتے البتہ دوسو روپے کے نوٹ اپنے ہمراہ لایا ہوں، ہری یہ دوسو کے نوٹ بہو کو دیدو"

ہری نے نوٹ بیکریاں کے ہاتھ میں دیدیئے،

اس کے بعد باقی ماندہ اصحاب یکے بعد دیگرے کسی نہ کسی بہانے سے وہاں سے اٹھکر چلے گئے، کسی نے کہا کوئی کام ہے، کوئی بولا، ابھی آتا ہوں،

قرض کے روپوں کی ادائیگی کا سوال آتے ہی سب کو کھسکتے دیکھکر ہری کو بہت چڑھ گیا اور کہنے لگے ——— "ایسے نادہندوں کو بغیر سود کے والد صاحب نے کیوں روپے دیدیئے، سمجھ میں نہیں آتا؟ زیادہ تعجب تو چچا آپ پر ہے کہ سب کے سامنے آپ نے ایسی باتیں کیں"

رگھو نے کہا ——— "تمہیں اپنے ہی طرز عمل پر تعجب کرنا چاہئے تھا، نہ کہ مجھ پر معترض ہوتے، تم روپے نہ دو تو کوئی قصور نہیں اور اگر میں اپنی دکان سے روپیہ دینے سے قاصر رہوں تو قصور ہوگیا"

ہری نے کہا ——— "اپنی دکان نہ کہہ کر اگر ہم لوگوں کی دکان آپ کہتے تو بات موزوں ہوتی، یقیناً والد صاحب کا بھی دکان میں حصہ تھا، اور اب بھی ہے آپ نے اس طرح جواب دیا کہ گویا ہم لوگ آپ سے خیرات مانگ رہے ہوں، خیر کوئی مضائقہ نہیں اب آپ حساب کتاب کر ڈالیئے اگر ہمارا کچھ نکلے گا ہم لیں گے نہ نکلے گا تو ایک پیسے کی بھی تمنا نہیں ہے"

حساب کی دھمکی سنکر رگھو آگ بگولہ ہوگیا "ہری تم مجھ سے حساب لوگے، اتنی تمہاری جرأت ہوگئی، حساب دینے میں مجھے تامل نہیں ہے، یہ دکان بھائی جان نے مجھے کرائی تھی، دکان میری ہے، تمہارے واسطے وہ جو کچھ

چھوڑ گئے ہیں وہ سب تمہارا ہے۔ اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں، بس اسی طرح کہ وہ جو کچھ میرے لئے چھوڑ گئے ہیں اسے اپنا کہنا کون سا گناہ ہے۔

جس طرح انھوں نے تمہاری سرپرستی کی اور لکھا پڑھا کر انسان بنایا اسی طرح میرا بھی خیال رکھا ہے، ان پر جس طرح تمہارا حق ہے اسی طرح میرا بھی ہے اور میں اس حق سے دست بردار نہیں ہو سکتا ——"

ہری بول اٹھا —— "چچا آپ نے اس حق کی لاج خوب رکھی"

رگھو نے کہا —— "اس کا فیصلہ کرنے والے تم نہیں ہو ہری، خیر میں تم سے اس معاملے میں زیادہ گفتگو نہیں کر سکتا، تمہیں اپنے بڑوں کا پاس ادب نہیں ہے —— تم بات کرنے کے لائق نہیں ہو"

ہری بھی کوئی سخت بات کہنے والا تھا، کہ ستیہ وتی نے اٹھکر ہری کا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہا "ہری، تمہاری زندگی کا سب سے مصیبت ناک وقت یہی ہے، اس وقت تمہیں سب برداشت کرنا ہوگا، چلو اندر چلیں، دیور جی! اب آپ بھی جایئے، منہ ہاتھ ٹھنڈے پانی سے دھویئے" یہ کہکر ستیہ وتی اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر گھر میں چلی گئی،

رگھو تھوڑی دیر گردن جھکائے بت بنا بیٹھا رہا، پھر جو اوپر نظر اٹھائی تو دیوار پر جادو بابو کی بڑی تصویر آویزاں نظر آئی، بے اختیار رگھو نے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا، اور رونے لگا، اس کی انگلیوں کے درمیان سے آنسو بہہ بہہ کر نکلتے اور فرش پر گرتے تھے۔

وہ تھوڑی دیر تک تنہا بیٹھے بیٹھے روتا رہا پھر وہاں سے چلا گیا۔

جادو نندن بابو رام نگر کے نامور وکیل تھے پہلے بہت غریب تھے، ماں باپ دونوں بچپن ہی میں داغ مفارقت دے گئے تھے، صرف ایک دودھ پیتا بھائی رگھو نندن تھا، جسے پالنے کا بار بھی جادو نندن کے سر تھا، وہ صبح سے دس بجے تک اسے کھلاتے پھر ایک رحمدل بیوہ خاتون کے سپرد کر جاتے اور خود چار بجے تک اسکول میں تعلیم حاصل کرتے، اس طرح انھوں نے سالہا سال تک غربت اور مصیبت کے عالم میں تعلیم پائی، اور رگھو نندن کی کفالت اور پرورش کی جب وہ انٹرنس پاس ہو گئے تو ماسٹر ہو گئے، اس وقت رگھو نندن بڑا ہو چکا تھا، جادو بابو نے اپنی شادی کی اور رگھو کا رجحان پڑھنے لکھنے کی طرف زیادہ نہ پاکر اسے ایک مختصر دکان لگا دی، وہ اتالیقی کے فرائض انجام دینے کے علاوہ آہستہ آہستہ اپنی تعلیمی ترقی کی سعی و جہد بھی کرتے رہتے تھے، چنانچہ چند برسوں میں بیچ بیچ پر انھوں نے ایف اے پھر بی اے کا امتحان بھی دے دیا، اس کے بعد وکالت پاس کر لی، اور ماسٹری چھوڑ کر وکیل ہو گئے، ان کے دو تین بچے بھی ہو چکے تھے، وکالت خوب چمک اٹھی تھی، دولت اب ان کے قدموں پر نثار ہو رہی تھی، انھوں نے رگھو نندن کو بڑے پیمانے پر کپڑے کی دکان کلکتہ میں لگا دی اور شادی کر دی اس خیال سے کہ مبادا آئندہ بیٹے اور بھائی میں ان بن ہو جائے انھوں نے ہر ایک کے واسطے الگ الگ شاندار مکانات بنوائے تھے،

مرنے کے چند ماہ قبل جادو بابو اپنے قلبی دوست جوگندر بابو وکیل رانچی کے ہاں ایک مہینے تک مقیم رہے اور انہی کے ہاں ایک وصیت نامہ تیار کیا جو مع تمام اہم دستاویزات کے جوگندر بابو کے پاس رکھے اور جن جن لوگوں کو جو جو رقوم انھوں نے قرض دی تھیں وہ سب جوگندر بابو کو نوٹ کرا دیں۔

جوگندر بابو کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا، کہ جادو نندن نے کتنا روپیہ کسے دیا بیوی کیلئے کیا وصیت کی، بچوں کیلئے کیا، اور بھائی کیلئے کیا،

جس دن دو دو باتیں ہوئی تھیں، اسی دن رگھو بغیر کہے سنے اسی وقت کلکتہ چلا گیا تھا، بہت رات گئے جب رگھو کلکتہ سے واپس آیا، تو ستیہ وتی جاگ رہی تھی رگھو کے پیروں کی چاپ سنکر ستیہ وتی نے پوچھا —— کون؟ دیور جی!"

رگھو نے کہا —— کیا ہے بھابھی؟

"کسی کو اطلاع دیئے بغیر کہاں چلے گئے تھے؟"

"کلکتہ"

"آدمی کسی سے کہکر جاتا ہے میں دوپہر سے اسی فکر میں ہوں کہ پرماتما دیور جی، کہاں چلے گئے؟ اچھا جاؤ، تمہارے کمرے میں کھانا چھینکے پر ڈھنکا رکھا ہے بہو بھی ابھی گئی ہے، جاگ رہی ہوگی، کھانا کھاؤ،

ہاتھ منہ دھو کر رگھو کمرے میں گیا اور بستر پر لیٹ گیا،

پاس کے بستر پر اس کی بیوی —— سوئی ہوئی تھی، رگھو کو دیکھا اٹھ بیٹھی کہنے لگی —— "بڑی آپا کھانے کے لئے ڈھانک کر رکھ گئی ہیں، اٹھو کھا لو"

رگھو نے کہا، میری طبیعت اچھی نہیں ہے، اس وقت کچھ نہ کھاؤں گا،

وہ تھوڑی دیر تک جاگتا رہا، پھر نیند آگئی، دفعتاً رات کو اس کی آنکھ کھل گئی دیکھا کہ کمرے میں اندھیرا ہے اور کوئی دھیرے دھیرے رو رہا ہے، رگھو نے

جلدی جلدی روشنی کی، اور دیکھا کہ منداکنی نے فرش پر کمبل بچھا لیا ہے اس پر اوندھے منہ پڑی ہوئی سسک سسک کر رو رہی ہے۔

رگھو فوراً قریب گیا، ملاطفت سے پوچھا —— کیوں کیا ہوا، کیوں رو رہی ہو، کسی نے کچھ کہا، بھابی نے کوئی سخت بات کہہ دی ہوگی؟ اگر نہیں تو پھر کیا بات ہے؟"

سسکتے سسکتے اس کی بیوی نے کہا —— تم نے کیوں کہا کہ پتاجی کے شرادھ کیلئے تم ایک پیسہ نہ دوگے؟ میری اس میں کتنی رسوائی ہو رہی ہے سب عورتیں نام رکھ رہی ہیں، اور خود بڑی آپا کے دل کو صدمہ پہنچا ہے، ہری روپے سے اس سے تم لڑ رہے تھے! آج ایک عورت سے اس کے خاوند نے چپ چاپ بتایا کہ تم کلکتہ گئے ہو تاکہ حساب گڑبڑ کر دو اور ہری کی حق تلفی کر دوگے"

رگھو نے ہنس کر کہا —— پاگل ہو! اچھا تم بتاؤ اور دل سے بتاؤ کہ تمہیں یقین ہے کہ میں ہری کی حق تلفی کروں گا"

"نہیں مجھے تو یقین نہیں ہوتا"

"اچھا یقین نہیں ہوتا تو تم کیوں رو رہی تھیں"؟ ——

"تمہاری غیبت اور بدنامی سنکر بڑا رنج ہوتا تھا" ——

—— اچھا اگر نیت نیک تھی تو پھر اتنی جلدی کیوں کلکتہ چلے گئے تھے؟"

"اس کا جواب میں پھر دوں گا، ابھی سو جاؤ"

پھر دونوں سو گئے۔

دوسرے دن رگھو نندن کا باہر نکلنا مشکل ہو گیا جس سے سامنا ہوتا وہی دو تین سنائے بغیر چھوڑتا نہ تھا، کوئی کہتا رگھو تم نے اپنے بھائی کی روح کو بہت خوش کیا ماشاءاللہ، کوئی کہتا ایسا دغا باز بھائی خدا دشمن کو نہ دے، کوئی کہتا، بھئی حساب سمجھانے میں تمہیں عذر کیوں ہے؟ اسمیں کیا راز ہے؟

تین دن کے بعد جوگندر بابو کا دارجلنگ سے تار آیا، لکھا تھا:-

"شرادھ کے دوسرے دن پہنچوں گا، پانچسو روپے بھیجے ہیں، شرادھ کی رسم اسی رقم کے اندر اندر انجام دو، جادو کی یہی وصیت ہے، خط لکھ رہا ہوں"

دو دن کے بعد خط بھی آیا، اس میں لکھا تھا، کہ جادو کی وصیت ہے کہ میری شرادھ میں پانچ سو روپے سے زیادہ خرچ نہ ہونے پائیں اور بھی متعدد اہم باتیں ہیں جنہیں اگر شرادھ کے دوسرے دن ظاہر کروں گا،

یہ خبر سنکر سب دنگ رہ گئے، ہزار روپے تو پھر بھی غنیمت تھے، یہ کیا ہو گیا کہ رقم آدھی ہو گئی! جادو کس قسم کا آدمی تھا، دیکھو نا! صرف پانچسو روپیہ شرادھ میں باقی تمام رقم آہنی صندوق میں مقفل!

بعض لوگ کہنے لگے —— "اونہہ! جادو دہریہ تھا، پکا دہریہ"۔

کسی معقولیت پسند نے یہ بھی کہا —— "یہ سب رگھو کی حکمتیں ہیں اس نے جو پاس سے پانچسو روپے دینے کہے تھے یہ وہی روپے ہیں"

اس کے بعد سب نے قرار دیا کہ جادو بابو تھے پکے دہریے، اور کج فہم، اور رگھو نندن پکا خود غرض، اور بد دیانت،

لیکن ان ملامتوں سے زیادہ سب کو اس بات کا فکر تھا کہ دیکھیں جادو بابو نے اپنے وصیت نامہ میں کون سی باتیں لکھی ہیں۔

شرادھ کے فرائض رگھو نندن نے ستیہ وتی کے احکام کے مطابق انجام دئے اور ہری کو کچھ نہ کرنے دیا۔

شرادھ کے دوسرے دن جوگندر بابو آئے، شرادھ کے دن حسب رواج برہمنوں کو کھانا کھلایا گیا، شام کو مساکین کو کھانا تقسیم ہوا، ہری اور رگھو نے خود اہتمام کیا اور برہمنوں اور مسکینوں کو عزت کے ساتھ کھلایا پلایا۔

آج وصیت نامہ سنایا جائے گا۔

سب لوگ، ستیہ وتی، ہری، منداکنی، اور چھوٹے بچے تک باہر کے کمرے میں جمع ہیں، برادری والے بھی موجود ہیں، لیکن رگھو نندن نہیں ہے اس واسطے ابھی وصیت نامہ نہیں پڑھا جا رہا۔

جوگندر بابو نے بہت دیر کے بعد کہا —— بھئی رگھو کو بلاؤ، لوگ ادھر ادھر جانے لگے کہ اسے ڈھونڈھ لائیں کہ اتنے میں خود رگھو بہت سے کاغذات بغل میں دبائے ہوئے آموجود ہوا،

جوگندر بابو کو مخاطب کر کے رگھو نے کہا —— چچا! مجھے ذرا دیر ہو گئی کلکتہ سے ابھی میرا کارندہ یہ تمام کاغذات لایا ہے اور انہی کاغذات کا مجھے انتظار تھا، آپ اگر اجازت مرحمت فرمائیں، تو وصیت نامہ پڑھنے کے پہلے میں کچھ عرض کر دوں۔

جوگندر بابو نے اجازت دی، تو رگھو نندن نے کہنا شروع کیا:-

چچا صاحب!

بھائی جان کی وفات کے تیسرے دن سب لوگ اس مکان میں جمع ہوئے تھے، شرادھ کی بابت مشورہ ہو رہا تھا، میں نے کہا تھا کہ ایک ہزار روپے سے زیادہ لگانے کی گنجائش نہیں ہے، اور بچپن سے بھائی صاحب ہم سب بچوں کے نام ڈاک خانہ میں کچھ نہ کچھ رقم رکھتے گئے ہیں، وہی رقم لگائی جائے، چنانچہ پانچسو روپیہ میرا جمع ہو چکا ہے وہ سب میں دیتا ہوں، اسوقت ششانک دادا نے کہا کہ باقی روپیہ تم اپنی تجارت میں سے دو، جسے میں منظور نہ کرسکا، اور سب کے ہاتھ میں روپے ستے جو دیدیتا، ششانک دادا کے جوش دلانے پر ہری مجھ سے بگڑ بیٹھا اور یہاں تک کہدیا کہ مجھے حساب سمجھاؤ اگر میرا نکلے مجھے دو ورنہ مجھے کسی کا ایک پیسہ نہیں لینا، یہ نہ خیال کرو کہ تم مجھے بھیک دے رہے ہو ہوشیار الزامات عائد کئے گئے، کہ میں بھائی کے پیسے اور کمائی سے فائدہ اُٹھا رہا ہوں اور ان کی شرادھ میں روپیہ نہیں لگاتا، چنانچہ میں نے کہدیا کہ دکان سے میں ایک پیسہ نہ دے سکوں گا، آپ کو تو خود ہی معلوم ہے کہ ہری باپ کے مرنے سے صرف یتیم ہوا ہے لیکن میں ان کے مرنے سے یتیم بھی ہوا اور یسیر بھی جب میں نے ہوش سنبھالا تو نہ ماں کو دیکھا نہ باپ کو، صرف بھائی جان اور بھابی صاحبہ ہی کو پایا، ان کے مرنے سے جو صدمہ ہوا، اس میں اضافہ اس وقت ہوا جب بھابی نے میری طرف سے نہ لوگوں کو ڈانٹا نہ ہری کو کچھ کہا ــــــ"

اتنا کہنے کے بعد رگھو کی آواز بھرا گئی، اور دونوں آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

جوگندر بابو کہنے لگے ــــــ "رگھو تم اطمینان سے سب کہہ لو کیونکہ انہی تمام امور کی نسبت وصیت نامے میں بھی باتیں موجود ہیں"۔

ستیہ وتی بھی متاثر تھیں، اور رگھو کو محبت اور دلسوزی سے دیکھ رہی تھیں، رگھو نے آگے کہا:-

"منہ سے تو کہا تھا، کہ حساب نہ دوں گا، لیکن اس دن کلکتہ بھاگ گیا، دکان کارکنوں سے کہہ آیا، کہ آمد و خرچ اور لاگت نفع نقصان کا پورا حساب بنا کر دیں وہی حساب آج ملا ہے، بھائی جان کے حکم کے مطابق اپنا کلکتہ کا خرچ نکال کر جو کچھ سرمائے میں اضافہ کر کے جو بچتا وہ میں ان ہی کو سال میں دو مرتبہ دے دیتا تھا، گزشتہ چھ ماہ سے وہ بیمار تھے۔ اس دوران میں ان کی مرضی کے خلاف ان کی دوا دارو میں خرچ کیا تو آپ کو اس کا علم ہے اور آپ اس کی بالیقین تصدیق کر سکتے ہیں"

یہ کہکر رگھونندن نے حساب کے کاغذات اور نوٹوں کا بنڈل جوگندر بابو کے ہاتھ میں دے دیا۔

جوگندر بابو نے کہا ــــــ "رگھو کا بیان حرف بحرف صحیح ہے جادو جب دارجلنگ میں میرے ہاں مقیم تھے، رگھو دو تین مرتبہ کلکتہ کے ڈاکٹر اپنے پاس سے فیس دے دیکر لے گیا تھا، رگھو کو آپ لوگ اتنا نہیں پہچانتے جتنا جادو نے پہچانا تھا کہ وہ کیا چیز ہے اور اس کی طبیعت کس قسم کی ہے"۔

اس کے بعد جوگندر بابو نے جادونندن کا وصیت نامہ پڑھا:-

"جادونندن کی نجی پیدا کردہ جائیداد ایک لاکھ سے زیادہ کی ہے، دس دس ہزار کے مکانات چار ہیں، ہر لڑکے کو ایک اور بھائی کو ایک دیا جائے، جدی مکان بیوی کو ملے گا، اسے بیع کرنے، رہن رکھنے اور حسب خواہش استعمال میں لانے کا پورا حق بیوی کو حاصل ہوگا، بیوی اور تین بچوں کو دس دس ہزار روپیہ نقد ملیگا، دس ہزار روپے مقامی ہائی اسکول کو دیئے جائیں، دس ہزار روپے قصبہ کی صفائی کیلئے میونسپلٹی کو ملیں گے، اس کے علاوہ اپنے چھوٹے بھائی رگھونندن کیلئے جو دکان کلکتہ میں کھولی ہے، آئیندہ رگھونندن اس کا مالک ہوگا کوئی دوسرا حقدار نہ ہوگا، اس دکان سے وقتاً فوقتاً جو منافع ہوا ہے وہ رگھونندن نے وصیت کنندے کے پاس رکھا ہے اور اب تقریباً بیس ہزار ہے وہ سب رگھونندن کو ملیں گے، جن دوست، احباب اور عزیزوں پر قرضہ ہے وہ سب معاف کر دیا گیا، اور خدا کیلئے چھوڑا جاتا ہے، اب ان سے کچھ وصول نہ کیا جائے،

بیوی کی کفالت اور دو نابالغ بچوں کی تعلیم کا بار چھوٹے بھائی پر ہوگا۔

وصیت نامہ کی تعمیل کرانے والے وصیت کنندے کے قلبی محترم دوست جوگندر بابو ہوں گے، اور اس کے بموجب عمل کرنے والے رگھونندن بابو،

وصیت نامہ ختم ہونے کے بعد دیکھا گیا کہ رگھونندن نے اپنا منہ دونو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا ہے، اور بچوں کی طرح چلا چلا کر رو رہا ہے، ستیہ وتی نے آبدیدہ ہو کر شفقت بھری آواز میں کہا ــــــ "دیور جی! بھائی چپ رہو میری وقتی کمزوری کو بھول جاؤ بھائی"۔

رگھو نے اپنی بھابی کے قدموں پر سر رکھدیا اور رو کر کہا ــــــ "میں اپنے بھائی کے کچھ کام نہ آیا، لیکن بھائی جان نے مجھ بے وقوف کیلئے اتنا کچھ کیا....."

جوگندر نے رگھو کو تسکین دیکر کہا ــــــ "ان کے کام آنے کیلئے تو تمہارے

بھائی بہنیں نہیں یہ کفالت سپرد کی ہے؟

ہری کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلکنے لگے۔ وہ اٹھکر اپنے چچا کے قریب آیا قدموں پہ سر رکھدیا اور بولا ـــــــ "چچا! میرا قصور معاف کیجئے۔ ماں اور چھوٹے بھائیوں کو والد صاحب آپ کے سپرد کر گئے ہیں، میں دوزانو ہو کر التجا کرتا ہوں کہ مجھے بھی آپ اپنی سپردگی میں لیجئے، میں بڑا ہو گیا ہوں، اس جرم کی پاداش میں کیا آپ مجھے اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ نہ دیجئے گا؟"

منداکنی (رگھونندن کی بیوی) کے بھی آنسو بہہ رہے تھے، اس نے دوڑکر ہری کو گلے لگالیا، اور کہا ہری تم آج سے میری اولاد ہو،

اس کے بعد رگھونندن نے بھی آنسو پونچھتے پونچھتے ہری کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

جوگندر بابو نے گلوگیر آواز سے کہا ـــــــ "آج جادو کی روح کو چین نصیب ہوا ہوگا"

دو بوند آنسو ان کی آنکھوں میں چھلکے، جنھیں کسی نے نہیں دیکھا، انھوں نے منہ پھیر کر آنسو پونچھے، پھر مسرت بھری نظر سے رگھونندن ہری کے ملاپ کو تاکنے لگے۔

حسن عزیز جاوید
